

قیمت فی کاپی ۴؍

جنوری کے پرچہ میں شامل تھا۔ علحدہ شایع نہیں ہوا

مدیر اعلیٰ
نیاز فتحپوری

نگار

ادارۂ معاون: اخوند فیض محمد فاروقی
مجدد نیازی — شوکت جہاں

جلد ۴۷	فہرست مضامین مارچ سنہ ۴۵ء	شمارہ ۳

"انتقادیات" کے مضامین کی فہرست صفحہ ۶۴ پر ملاحظہ ہو۔

ملاحظات

ماخذ القرآن میں نے جنوری فروری کی مشترکہ اشاعت میں ظاہر کیا تھا کہ ڈاکٹر ٹسڈل کے ایرادات کا جواب علماء کرام کی طرف سے مارچ میں شایع ہوگا، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اکثر نہیں، تو کم از کم ایک دو حضرات کا جواب ضرور مل جائے گا اور اس طرح مارچ سے یہ سلسلہ شروع ہوسکے گا، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک ان حضرات میں سے کسی ایک کا جواب موصول نہیں ہوا، جن کو میں نے خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا تھا

میں نے دسمبر [illegible] میں متعدد علماء کرام[1] کے نام ایک مطبوعہ تحریر روانہ کی کہ میں عیسائی مشنری کے بعض وہ اعتراضات آیندہ جنوری میں شایع کرنا چاہتا ہوں جو قرآن اور اسلام پر کئے گئے ہیں بشرطیکہ آپ لوگ جواب دینے کی زحمت گوارا کریں، اس تحریر کے جواب [illegible] موصول ہوئے[2]، ان میں سے اکثر میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اعتراضات کے ساتھ جوابات بھی شایع کئے جائیں [illegible] نے یہ تسلیم نہیں کیا۔

میں نے [illegible] ظاہر کیا کہ اعتراضات و جوابات دونوں کو ایک ساتھ شایع کرنا ممکن نہیں [illegible] ہو جائے گا اور اتنا کاغذ فراہم ہونا فی الحال ممکن نہیں [illegible] ڈاکٹر ٹسڈل کے ان اعتراضات کو شایع کرنا چاہتا ہوں۔

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی — مولانا عبد الماجد دریابادی — مولانا ابوالاعلیٰ مودودی — مولانا [illegible] — مولانا سید مناظر احسن گیلانی — مولانا شبیر احمد عثمانی — مولانا ثناء اللہ صاحب — مولانا سعید علی صاحب ایم۔اے۔ — مولانا منظور احمد صاحب نعمانی — مولانا کفایت اللہ صاحب — مولانا عبد السلام خاں صاحب — مولانا [illegible] الدین خاں صاحب — مولانا حافظ کفایت حسین صاحب — ڈاکٹر حمید اللہ صاحب — مولانا علی نقی النقوی — مولانا مسعود عالم صاحب — ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی — مولانا سعید احمد صاحب — مولانا حفیظ الرحمان صاحب — مولانا قاری محمد طیب صاحب — مولانا آزاد سبحانی — مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب — مولانا عبد القدیر بدایونی — مولانا اسلم جیراجپوری —

[2] ان میں بعض نہایت دلچسپ ہیں اور ان کی نقل کسی آیندہ اشاعت میں پیش کی جائے گی۔

ناصد فقران نے عنوان سے اس نے اپنی ایک مستقل تصنیف میں پیش لئے ہیں، [illegible] بعض حضرات نے لکھا کہ ان اعتراضات کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے لیکن جب میں نے انھیں حاصل کر کے پڑھا، تو معلوم ہوا کہ یہ جوابات اول زیادہ تر "ینابیع الاسلام" سے تعلق رکھتے ہیں جو ڈاکٹر ٹسڈل نے بہت پہلے فارسی میں لکھی تھی نہ کہ "ماخذ القرآن" سے دوسرے یہ کہ جوابات بھی بالکل تشنہ و نامکمل ہیں اور [illegible] ربع صدی پہلے کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں چنانچہ میں نے دسمبر کے نگار میں اس کا اعلان کر دیا کہ [illegible] ماخذ القرآن کی [illegible] اور [illegible] کو میں نے ان تمام علماء کرام کے پاس ایک ایک کاپی [illegible] بھیج دیا ہے۔

اس کی رسید سب سے پہلے مولانا عبد [illegible] دریابادی سے [illegible] نام [illegible] چنانچہ میں نے ان حضرات کو بھی یہ پرچہ بھیج دیا [illegible] کے نام [illegible] سے پیش کئے گئے تھے

اس وقت تک جواب نہ آنے سے [illegible] موصول ہوں گے، جن میں ڈاکٹر ٹسڈل کے ان [illegible]

رسالہ البیان اور نگار

[illegible] نے کس طرح [illegible] یا [illegible] میں اس کو دیکھا، اس کا علم البتہ مجھے اس کی [illegible] ہوا

اس کے مدیر [illegible] عرشی صاحب ہیں، جو اس [illegible] میں مدیر [illegible] شائع کر چکے ہیں

انھوں نے البیان کی اس اشاعت میں ڈاکٹر ٹسڈل کے اعتراضات کا جواب نہیں دیا بلکہ علماء کرام کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اس مسئلہ کو ہرگز قابل التفات نہ سمجھیں، کیونکہ اول تو ان اعتراضات کا جواب "ہمارے علماء محققین اپنے اپنے انداز میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں" اور دوسرے یہ کہ "اس شخص (یعنی اڈیٹر نگار) کا مقصود اپنی گرم بازاری اور نوجوانوں کی گمراہی کے سوا کچھ نہیں ——"

عرشی صاحب کے علاوہ اور بھی دیگر حضرات نے [illegible] لکھا ہے کہ ان اعتراضات کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے لیکن جب میں یہ پوچھتا ہوں کہ جواب کب، کس نے اور کیا دیا ہے تو سکوت اختیار کر لیا جاتا ہے، اور اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ جوابات واقعی دئے جا چکے ہیں اور وہ اپنی جگہ مکمل ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو پھر نہ شایع کیا جائے، کیا

لہ اس تالیف میں ملک کے بڑے بڑے علماء و اہل قلم نے حصہ لیا ہے [illegible] کی آیندہ اشاعت میں مفصل تبصرہ شایع ہوگا۔

میں سرسری طور پر اپنا خیال نسٹڈل کی اس کتاب کے متعلق جنوری کی اشاعت میں ظاہر کر چکا ہوں اور آئندہ اشاعت میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتاؤں گا کہ زمانہ کی موجودہ ذہنیت کو سامنے رکھ کر، مذہب کی صحیح حمایت کن اصول پر کی جا سکتی ہے اور کن مسائل کو کن کن نقطہ ہائے نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔

کیا جنگ واقعی ختم ہو رہی ہے

اس وقت جنگ کا جو نقشہ پیش نظر ہے، اس کو دیکھ کر بہ آسانی ہر شخص یہی حکم لگا دے گا کہ لڑائی اب اس منزل پر پہونچ گئی ہے، جہاں سے اس کے رخ پلٹنے کا کوئی امکان باقی نہیں اور جرمنی کی فوجی قوت اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو ایک طویل زمانہ تک اب سر نہیں اٹھا سکتی۔ جنوب اور مغرب کی طرف سے امریکی و انگریزی فوجوں کا یلغار، مشرق اور شمال کی جانب سے روسی افواج کا زبردست اقدام، جرمنی کے لئے اس شکنجہ کو روز بروز تنگ کرتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب سوال یہ نہیں ہے کہ برلن میں داخلہ ممکن ہے یا نہیں بلکہ صرف یہ کہ وہاں کے ایوان حکومت پر سب سے پہلے روس کا جھنڈا لہرائے گا یا امریکہ و برطانیہ کا اور یہ امر اس حد تک یقینی سمجھ لیا گیا ہے کہ نہ صرف جرمنی کے تقسیم و تجزیہ کا پروگرام مرتب ہو چکا ہے، بلکہ تمام بلقان و وسطی یورپ کے جغرافیہ و سیاست میں جو تبدیلیاں ہونے والی ہیں، ان پر بھی یالٹا کانفرنس میں کافی بحث ہو چکی ہے۔

پھر ان حالات میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے کہ جنگ ختم ہونے والی نہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس جنگ کا اختتام اتحادیوں کی کامیابی پر نہ ہوگا لیکن باوجود اس علم و یقین کے یہ امر ہنوز مشتبہ ہے کہ اس جنگ کے بعد واقعی دنیا کو امن و سکون میسر آجائے گا اور جنگ کے بعد کا معاشی، اقتصادی اور سیاسی اضطراب ایک اور تیسری جنگ کا پیش خیمہ ثابت نہ ہوگا۔

دنیا کی ہر لڑائی میں مختلف قوموں کے تصادم سے ہمیشہ زمانہ کی رفتار اور لوگوں کے خیالات و رجحانات میں بڑا اثر پڑا ہے اور دنیا کی ہر جنگ اپنی ضرب سے کوئی نہ کوئی نیا زاویہ حیات انسانی میں پیدا کر جاتی ہے۔ لیکن یہ لڑائی اس حیثیت سے ہمیشہ ممتاز سمجھی جائے گی کہ اس نے ایک ایسے زاویۂ نگاہ کو حقیقت ثابت کر کے دکھا دیا جسے دنیا اس وقت تک محض فرضی، وہمی اور خیالی نقطہ سمجھتی آرہی تھی۔

قدیم زمانہ میں جتنی لڑائیاں ہوتی تھیں، ان میں صرف قوت اور عسکری نظام کا امتحان ہوتا تھا اور یہ تجربہ صرف شکست یا فتح کی صورت میں ختم ہو جاتا تھا۔ لیکن اس زمانہ کی لڑائیاں وہ ہیں جن پر انسانی تصورات و نظریات کبھی پرکھے جاتے ہیں، سیاست و مذہب کے اصول بھی جانچے جاتے ہیں اور پھر انہیں پر مستقبل کا نظام قائم ہوتا ہے۔ اس لئے موجودہ جنگ کی اہمیت کا اندازہ جرمنی کی شکست سے نہ کرنا چاہئے بلکہ روس کی کامیابی سے یعنی کسی اور قوم کے لئے یہ جنگ چاہے جیسی ثابت ہو لیکن روس اور اس کی حکومت کے لئے یقیناً رحمت بنکر آئی اور اشتراکیت کو اتنا اہم بنا گئی کہ دنیا کا کوئی نیا نظام اس کو جگہ دئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، اور یہ سرمایہ دارانہ اصول پر قائم ہونے والی حکومتوں کے لئے اتنا تلخ نوش ہے کہ منہ بگاڑے بغیر وہ حلق سے نیچے اتر نہیں سکتا اور اگر یہ نوش ہضم نہ ہوسکا تو دنیا میں پھر

آف بار پھر زلزلہ آتا ہے اور شاید اس سے زیادہ سخت، اس سے زیادہ تباہ کن !

یہی ہے وہ اندیشہ جو بعض اصحاب فکر کو اس جنگ کے نتیجہ کی طرف سے غیر مطمئن بنائے ہوئے ہے اور بار بار یہی سوال ان کے سامنے آتا ہے کہ کیا جنگ واقعی ختم ہونے والی ہے !

اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نازی حکومت کے ختم کرنے کا تعلق ہے، روس برطانیہ اور امریکہ تینوں بغیر ادنیٰ اختلاف کے متحد الخیال ہیں، لیکن نازیت کے ختم ہونے کے بعد وسطی یورپ اور بلقان کی حکومتوں کا کیا حشر ہوگا، پولینڈ، ترکی، ایران اور بالٹک کی ریاستوں کی تنظیم کس طرح ہوگی اور اس سے زیادہ یہ کہ خود جرمنی میں کس نوع کی حکومت قایم ہوگی، یہ وہ مسایل ہیں جن کے متعلق اب تک کوئی مفاہمت نہیں ہوسکی اور اس چھتہ کو چھیڑتے ہوئے اتحادیوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ کانپ اٹھتا ہے۔

یہ بڑی حقیقت ہے کہ اس وقت مصالح جنگ نے امریکہ و برطانیہ کو روس کے ساتھ متحد کر دیا ہے، ورنہ یوں اصولاً ان میں باہمی اتحاد کی کوئی صورت نہیں۔ امریکہ اور برطانیہ دونوں جمہوری حکومت ہونے کی مدعی ہیں اور جمہوریت ہی ان کا نصب العین ہے، برخلاف اس کے روس اشتراکیت کا حامی ہے جسے امریکی یا برطانوی جمہوریت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

بظاہر ان دونوں میں تصادم کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، جبکہ ایک طرف سٹالین کہہ چکا ہے کہ دوسرے ملکوں کو اشتراکی بنانا اس کا مقصود نہیں، اور دوسری طرف امریکہ و برطانیہ بھی یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ ہر ملک کو اپنی حکومت کی تعیین کا اختیار حاصل ہوگا لیکن اندرونی طور پر صورت حال مختلف ہے اور خصوصیت کے ساتھ روس کی پالیسی نے اندیشہ ہائے دور و دراز پیدا ہو چلے ہیں۔

خود جرمنی سے متعلق روس کی پالیسی اتنی کھلی ہے کہ اگر آج نازی حکومت ختم ہو جائے اور اہل جرمنی کو انتخاب حکومت کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ سوویٹ حکومت پر غور کئے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں گے۔ آپ کو شاید یہ سنکر حیرت ہوگی کہ خود جرمن افسروں کی ایک یونین اس وقت ماسکو میں قایم ہے جو ریڈیو پر جرمن پبلک کو مخاطب کرتی رہتی ہے۔

بلقان میں جس خوبصورتی کے ساتھ روس اپنے اثرات قایم کر رہا ہے، وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ جس وقت روس کو معلوم ہوا کہ بلغاریا مغربی حکومتوں کے ساتھ شامل ہونے پر مایل ہے تو اس نے بلغاریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ التوائے جنگ کی بات چیت جو قاہرہ میں ہو رہی تھی، ماسکو میں ہونے لگی۔

رومانیا میں روس نے اپنے اثرات جیسے اور جس طرح قایم کرلئے ہیں وہ بھی سب پر واضح ہیں کیونکہ روس کے شرائط رومانیا کے لئے اتنے دلکش ہیں کہ وہ ان کو نظرانداز کر ہی نہیں سکتا اور اسی لئے بخارسٹ میں سوویٹ رسوخ بہت بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح آسٹریا، ہنگری، یوگوسلاویا، سربیا اور یونان ہر جگہ روس کی اندرونی ریشہ دوانیاں

اس کے لئے بڑی کامیاب ثابت ہو رہی ہیں اور پولینڈ کے باب میں روس کا مطالبہ کرزن لائن تو خود برطانیہ کو بھی ماننا پڑا۔ پھران حقیقتوں سے برطانیہ و امریکہ ہی نہیں بلکہ جاپان بھی اچھی طرح واقف ہے اور اسی لئے اس دوران میں اس نے ہٹلر سے برابر یہی کہا کہ "لڑائی تو تم ہار چکے ہو اس لئے اس کا انجام ہی جیتنے کی کوشش کرو اور وہ یہ کہ روس کو ہر ممکن رعایت دیکر، "برلن، ماسکو اور ٹوکیو" کا ایک نیا محور قائم کر لو"۔ لیکن جاپان کو یا تو ہٹلر کی ذہنیت کا حال معلوم نہیں یا وہ خود اسٹالین کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکا، ورنہ وہ یہ خواہش ظاہر نہ کرتا۔

بہرحال جنگ کے اختتام کا زمانہ جتنا قریب آتا جا رہا ہے، مستقبل کے متعلق اتنی ہی زیادہ فکریں پیدا ہوتی جاتی ہیں اور اگر خدانخواستہ جمہوریت و اشتراکیت کی اس اندرونی کشمکش نے زیادہ نازک صورت اختیار کر لی اور یہ چنگاری سینوں سے نکلکر دامن تک پہونچ گئی تو پھر اس آگ کا بجھنا آسان نہیں۔

اس دوران میں یہ خبر بھی آئی ہے کہ ترکی نے نازی محور کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے، ظاہر ہے کہ ترکی کے اس اعلان کا اثر جنگ پر کچھ نہیں پڑ سکتا اور شاید اسی چیز کو "مشت بعد از جنگ" کہتے ہیں، لیکن اگر اس اعلان کے بعد کم از کم اتنا بھی ہو سکا کہ "صلح کانفرنس" جس میں اسے اس اعلان کے بعد شرکت کا حق حاصل ہو گیا ہے) اُس سے کچھ چھین نہ سکی (لطف و عطا کا ذکر نہیں) تو بھی ہم اسے غنیمت سمجھیں گے —— جاپان گو ابھی تک جنگ کر رہا ہے، لیکن اس یقین کے ساتھ کہ اسکا بھی وہی حشر ہونا ہے جو جرمنی کا ہونے والا ہے، لیکن جس طرح جرمنی ابھی تک اس امید پر جی رہا ہے کہ شاید اتحادیوں کی باہمی پھوٹ سے وہ فایدہ اُٹھا سکے، اسی طرح جاپان بھی توقع قایم کئے ہوئے ہے، لیکن یہ دونوں اس حقیقت سے بیخبر ہیں کہ اتحادیوں کا اختلاف بھی اب ان کی قسمت کے فیصلہ کو رد نہیں کر سکتا اور انھیں یہ فیصلہ بہر نوع ماننا پڑے گا۔

بہ سلسلہ صفحہ ۶۳ (مطبوعات موصولہ)

اقبال جناب مجنوں گورکھپوری کا اجمالی تبصرہ ہے اقبال کی شاعری پر جسے ایوان اشاعت گورکھپور نے شایع کیا ہے۔ اقبال پر اسوقت تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس میں کمیت کے لحاظ سے تو کسی اضافہ کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی، لیکن کیفیت کے لحاظ سے اس میں ابھی بڑی گنجایش باقی ہے —— اقبال کے مطالعہ کے سلسلہ میں عام طور پر لوگ یہ غلطی کیا کرتے ہیں کہ انکی شاعری اور مقصود شاعری کو ایک دوسرے سے متمایز نہیں کرتے۔ پہلے یقین کر لیا جاتا ہے کہ وہ فلسفی تھے اور فلسفی بھی ایسے جن سے کسی غلطی کا ہونا ممکن نہیں اور پھر وہ انکے کلام سے انھیں ایسا ہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ بڑی اُصولی غلطی ہے۔

جناب مجنوں نے اس رسالہ میں اقبال کی ان دونوں خصوصیات کو ایک دوسرے سے علحدہ کر کے رائے زنی کی ہے اور انکی شاعرانہ و فلسفیانہ دونوں حیثیتوں کے حدود متعین کر کے بتایا ہے کہ مفکر ہونے کی حیثیت سے وہ کیا تھے اور شاعر ہونے کے لحاظ سے انکا کیا مرتبہ تھا۔ اقبال کے خیالات میں جو تضاد پایا جاتا ہے، وہ بڑے اُلجھن کی چیز ہے اور اسکے حقیقی اسباب کا پتہ چلانا آسان نہیں لیکن جناب مجنوں نے اس فرض کو بھی بڑی خوبی سے ادا کیا ہے اور اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مطالعۂ اقبال کے سلسلہ میں یہ رسالہ اپنی خصوصیت سب سے علحدہ رکھتا ہے۔ قیمت بارہ آنے اور طباعت و کتابت نہایت پسندیدہ

ترقی پسند شاعری

اگر آپ اپنی پرانی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ پچھلے ۵۰ سال کا زمانہ ذہنی، معاشرتی، مذہبی اور اقتصادی اعتبار سے بڑا پُر آشوب گزرا ہے۔ پُرانی قدروں کے ایوان میں زلزلے کے سے جھٹکے محسوس ہوئے ہیں، نئے تصورات کی بنیادوں پر زندگی کی نئی تعمیر شروع کی گئی ہے اور اگرچہ آنے والی صبح کے آثار ابھی دھندلکے میں ہیں لیکن یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ تاریک رات کا بڑا حصّہ گزر چکا ہے اور انقلاب کی جس درخشاں صبح سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں ادب بھی اس کا ایک پہلو ہے۔

یہ سُنکر آپ کو غالبًا بالکل تعجب نہ ہوگا کہ ہمارے ملک کے علاوہ اور ملکوں کا ادب بھی تجربہ اور انقلاب کی آزمائش سے گزرا ہے اور گزر رہا ہے۔ یہاں میں مختصر طور پر اُن تجربوں کا ذکر کروں گا جو انگریزی شعر و ادب میں کئے گئے اور جن سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمارے نوجوان شعرا متاثر ہوئے ہیں اس طور پر آپ کے سامنے وہ پس منظر آ جائے گا جس میں ہمیں اُردو کی موجودہ ترقی پسند شاعری کو دیکھنا ہے

پچھلے چالیس سال کی مختصر مدت میں انگریزی شاعری میں کئی رجحانات ملتے ہیں۔ ابتدائی وکٹوریائی عہد کے شعرا کے کلام کا ایک نمایاں عنصر اُن کی رجائیت تھی اور اس عہد کے آخری شعرا بالخصوص جمیس تامسن، تامس ہارڈی اور ہاؤس مین تھے تامسن زندگی کے آلام اور مصائب کو محسوس کرکے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے، ہارڈی انسان کی مصیبتوں پر غور کرتے کرتے اُس کے خالق پر بھی سوچنے لگتا ہے اور اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ انسان کا احساس اُس کے حق میں مصیبت ہے کیونکہ یہی اُس کے مصائب کا سرچشمہ ہے۔ ہاؤس مین کا انداز اُس سے مختلف ہے وہ قانونِ الٰہی یا انسان کے ساختہ قوانین پر بحث نہیں کرتا بلکہ زندگی سے گھبرا کر اور مایوس ہو کر دیہاتی سکون میں پناہ ڈھونڈھتا ہے۔

اس زوال آمادہ دبستان کے اثرات دوسری صورتوں میں بھی نمودار ہوئے یعنی اخلاق، مذہب اور آرٹ کی مستقل قدریں اپنا اقتدار کھو بیٹھیں، چنانچہ وائلڈ اور اُس کے ساتھیوں نے سوئن برن کی مثالوں کو سامنے رکھکر عجیب عجیب ارواح اور اعمالِ خبیثہ کا مطالعہ کیا۔

یہی زمانہ ہتلے نے پایا۔ اُس نے شاعری میں انقلاب کی ضرورت کو محسوس کیا، اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ ہمارے ماحول

میں معمولی معمولی چیزیں ایسے نقوش پیدا کرسکتی ہیں جو شاعری کا موضوع بن سکیں، اُس نے غیر مقفیٰ نظمیں لکھیں اور چھندنے پیمانے رائج کئے، گبسن نے مزدوروں کے طبقہ کو موضوعِ شاعری بنایا، اور کانوں، کارخانوں اور جہازوں میں کام کرنے والے ادنیٰ مزدوروں کی عورتوں کو اپنی شاعری میں نمایاں کیا اُسنے انکی بڑی دلخراش حالتیں بیان کیں۔ بے سروسامانی میں بچّوں کا پیدا ہونا، بیماریاں، موت، ان نظموں میں اُس کا خاص موضوع ہیں۔ رابرٹ برِوک معمولی مناظر سے شدید احساس پیدا کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ شاعری میں جماعتی شعور ضرور پیدا ہو۔

تکنیک کے اعتبار سے جس دور کی شاعری کا میں اسوقت ذکر کر رہا ہوں بہت اہم ہے۔ نظم کی پُرانی بندشوں کو توڑ کر یہ کوشش کی گئی کہ نظم روانی اور بیان میں عام گفتگو سے زیادہ سے زیادہ قریب آجائے۔

اسکے بعد کے شاعر اپنے خاص رجحانات کی بنا پر (Imagists) کہلاتے ہیں۔ ان کے چار اُصول تھے:

(۱) موضوع کا براہ راست بیان (۲) مختصر الفاظ (۳) خاص تصورات سے مدد لینا (۴) فطری وزن۔ اسی زمانہ میں انگریزی شاعری نے جاپانی اور چینی شاعری سے بھی بعض چیزیں اخذ کیں اور آزاد نظم عام طور پر رائج ہوگئی، اس تحریک سے متاثر ہونے والوں میں ہیوم بھی تھا، اُس کا بھی یہی خیال تھا کہ عصرِ حاضر کی زندگی نے انسان اور فطرت کی ہم آہنگی کو بالکل برباد کر دیا ہے یہ بھی تشبیہ اور استعارہ سے کام لیتا ہے لیکن ہر موقع پر اس کا بیان صاف رہتا ہے۔ قوافی کے اُصولوں کی سختی کو انھوں نے ترک کرنا چاہا لیکن قبل اس کے کہ یہ تحریک عام طور پر اپنی خوبیوں کو ظاہر کر سکے کچھ نومشق شاعروں نے اسے اختیار کر لیا اور اسے نیم پختہ اور بے ربط خیالات کے اظہار کا اک آسان ذریعہ سمجھ کر استعمال کرنے لگے اگر آپ موجودہ اُردو ترقی پسند شاعری پر نظر ڈالیں تو بالکل یہی کیفیت نظر آئیگی بعض شعراء نے آزاد نظم کو اُصولی طور پر اختیار کیا ہے لیکن اکثر لوگوں نے جن میں باقاعدہ شعر کہنے کی صلاحیت موجود نہیں تھی جن کے خیالات خام اور جذبات غیر مربوط تھے اسے محض آسان سمجھ کر اختیار کر لیا ہے۔

آلڈنگٹن بھی اسی عہد کا ایک مشہور شاعر ہے وہ بھی حالات کا جایزہ لیکر انسانیت اور خود اپنے آپ سے متنفر ہوجاتا ہے آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ان۔م۔ راشد اور چند دوسرے ترقی پسند اُردو شعرا کا بھی یہی انجام ہوا ہے۔

یہ شاعر اپنے تجربے کر رہے تھے کہ جنگ کا آغاز ہوگیا اور اس کا اثر شاعری پر بھی پڑا، جنگ کی وجہ سے سوسائٹی کی قدریں بدل گئیں اور سوسائٹی کی ضروریات کا احساس اور شدید ہوگیا، نئے اور پُرانے اُصولوں میں تصادم ہوا اور ایک تذبذب کی کیفیت پیدا ہوگئی، امن اور استقلال قائم کرنے کی کوشش ایک فطری امر تھا، اس کی بھی دو صورتیں ہوسکتی تھیں یا تو عہدِ ماضی میں پناہ لی جائے اور پُرانی تہذیب، قدیم معاشرت اور آبائی تصورات دوبارہ رائج کئے جائیں یا ایک نئی دُنیا بنائی جائے۔ انگریزی شاعری میں دونوں کے نمونے ملتے ہیں۔

ان حالات میں ایک اور جماعت شعرا کی آگے بڑھی۔ یہ سب لوگ شہر سے نفرت کرتے ہیں لیکن بعض متقدمین کی طرح فطرت کے دامن میں بھی انھیں پناہ نہیں ملتی، اس لئے وہ آخرکار خود زندگی کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوجاتے ہیں،

جنگ نے تقریباً ایسا ہی اثر موجودہ اُردو شعرا پر کیا ہے۔ زندگی سے نفرت، فرار اور آخر خودکشی، انھیں رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ یہ شعرا اس حقیقی دنیا سے فرار اختیار کر کے اپنے خیالات کی ایک شاعرانہ دنیا الگ بناتے ہیں اسی لئے اُنکے کلام میں مبہم تلمیحات اور ناتمام کہانیاں بہت ہیں۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ہماری موجودہ اُردو شاعری بھی بڑی حد تک اسی دور سے گزر رہی ہے۔ جس طرح مسٹ شول کی شاعری میں "موت" کی ہیبت جاری و ساری ہے اور ہر ہر قدم پر زندگی کے عبث ہونے کا احساس شدید نظر آتا ہے اسی طرح ہمارے شاعر زندگی کو وبال جان سمجھنے لگے ہیں اور جس طرح یہ انگریزی شعرا میں پہلی مرتبہ نظم کو جدید موسیقی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہیں اسی طرح ہمارے یہاں بھی موجودہ دور میں گیتوں کا عام رواج اسی قسم کی تحریک کہا جا سکتا ہے۔

آخر میں، میں صرف تین انگریز شاعروں کا اور ذکر کروں گا جن میں سے کم از کم ایک نے ہمارے چند ترقی پسند شعرا کو متاثر کیا ہے۔ میرا مطلب ہربرٹ ریڈ، لارنس اور ایلیٹ سے ہے، ہربرٹ ریڈ جنگ سے متاثر ہے۔ دنیا سے بیزار ہے محبت پر بھی اُسے اعتبار نہیں کیونکہ اُس کے نزدیک اکثر محبت کا انجام نفرت پر ہوتا ہے، اسی لئے وہ ایک اپنی دنیا بناتا ہے جو خوابوں کی دنیا کہی جا سکتی ہے۔ ہمارے شاعروں کا بھی یہی محبوب مشغلہ ہے۔ لارنس کی تین خصوصیات قابل لحاظ ہیں :- (۱) اشاریت و ابہام (۲) جنسیات (۳) موجودہ نظام سے بیزاری اور اس کی اصلاح یا یہ ممکن نہ ہو تو ایک نئے نظام کی تعمیر۔ اس نظام میں وہ بالعموم مرد عورت اور اس کے جنسی تعلقات کا ذکر کرتا ہے۔ پہلے لارنس نے پابند نظمیں لکھیں بعد میں آزاد نظمیں کہنے لگا۔ اُس کے تصورات اُسے 'خودکشی' تک پہونچاتے ہیں۔ اُردو شعرا میں جنسیت اور ابہام اسی طرح ہے جس طرح لارنس کے یہاں ملتا ہے۔ لارنس کی بعض چیزیں جو زیادہ قابل اعتراض تھیں سرکاری حکم سے ممنوع قرار دی گئیں اور اُن کی اشاعت قانوناً بند ہے۔ اُردو شاعروں میں راشد کے یہاں کچھ کچھ اس کی جھلک ملتی ہے لیکن لارنس کی عظمت ابھی راشد کو حاصل نہیں۔ اس تمہید کے بعد میں مقالہ کے اصل موضوع یعنی ترقی پسند شاعری پر آتا ہوں۔

ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی، غالباً یہ ماننے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ ہر صورت میں ادب، حیات سے متعلق، بلکہ اس کا ترجمان ہے۔ ادب کا وہ دورِ قدیم جو ادب برائے ادب کا جمالیاتی دور کہا جاتا ہے اُس میں بھی اُس عہد کی تہذیب، اُس کی معاشرت کی دھڑکنیں اور زندگی کی قدریں صاف موجود ہیں، مثال کے لئے صرف میر کے کلام کو دیکھئے اور اب جبکہ ادب برائے زندگی کا تصور ایک تحریک سے گزر کر اصول بن چکا ہے، اب بھی ادب ہماری پُرآشوب حیات، ہمارے پیچیدہ احساسات اور تفکرات کا مجموعہ ہے، زندگی ہمیشہ زندگی رہی ہے صرف اس کی قدریں بدلتی رہی ہیں۔ اسی طرح ادب کے بھی موضوعات اور سانچے ہیں، زندگی کی طرح ادب بھی ربط اور ارتقا پذیری سے پیدا ہوتا ہے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ بڑھتا ہے اور حالات سازگار نہ ہوں تو مر بھی سکتا ہے۔ اپنی زندگی کی ہر منزل میں اس کی وضع قطع تراش خراش علٰحدہ ہوتی ہے۔ یہی ادب کی ترقی ہے

پچھلی جنگِ عظیم ہم میں سے اکثر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، لیکن جنھیں بطور واقعہ یاد نہیں اس کے اثرات جو کم و بیش اس دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز تک باقی تھے انھوں نے بھی ضرور محسوس کئے ہیں، اگرچہ اس عہد کے ادب کے نمونے اب ہمارے یہاں سال خوردہ کہلاتے ہیں تاہم چکبست کا کلام ابھی تک زندہ ہے۔ اُس کی شاعری اس اعتبار سے ادب کی اس زندگی کی پہلی آواز ہے جو ۱۹۱۴ء کے بعد شروع ہوتی ہے۔ چکبست کا ذکر کرنے سے پہلے اُس کے پس منظر کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جدید کی تعمیر قدیم بنیادوں ہی پر ہوسکتی ہے۔ دراصل حالی سے ہی اُردو شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور حالی کی شاعری اس دور میں عبوری ادب کا ایک اچھا نمونہ ہے، ایک طرف ان کے دل کی رام کہانی ہے جو وہ اسوقت تک سناتے رہے جب تک ان کا دل زندہ رہا۔ دوسری طرف ان کی وہ شاعری ہے جس میں زندگی کا احساس ایک کروٹ لیتا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حالی چونکہ خود پہلے دور کی پیداوار تھے اور ذہنی تصورات و محسوسات کے ساتھ شعری پیمانے بھی انھیں وہی پسند تھے جو وہ بچپن سے دیکھتے چلے آئے تھے اس لئے وہ اس نئے ادب کے دور کی صرف ایک ہلکی سی جھلک دکھا سکے، یہ ان کی ناکامی ہے یا کامیابی اس کا فیصلہ کرنا آج بہت مشکل ہے۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت حالی نے جو کیا اس سے زیادہ کرنا کسی اور کے بس کی بات نہ تھی، حالی میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ ان لوگوں میں رہ کر جو "سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود" تھے انھوں نے بڑی جرأت سے کام لیا اور اُن پابندیوں کو توڑنے کا پہلا اعلان کیا، اسوقت تک ہماری شاعری کا فن یا ٹکنیک جیسا دقیق اور اُصولی بن چکا تھا، اس کا اعادہ ضروری نہیں۔ وزن۔ ردیف قافیہ ایسے پیمانے تھے جن کے سوا اور پیمانوں میں شرابِ سخن چھلکائی نہیں جاسکتی تھی۔ مقدمہ شعر و شاعری میں جس دن حالی نے یہ اعلان کیا کہ وزن شعر کے لئے کوئی ضروری شرط نہیں اور قافیہ بھی اگرچہ شعر کے حسن میں اضافہ کردیتا ہے اس کے لوازم میں نہیں بلکہ اچھے شعر میں صرف سادگی اصلیت اور جوش کا ہونا کافی ہے، اس دن گویا قدیم شاعری کے قصر کو جس میں اُردو شعرا کی تین سو سالہ تعمیری کوششیں شامل تھیں، تخریب کے زلزلے کا پہلا جھٹکا محسوس ہوا جس سے اُس میں بعض شگاف پیدا ہوگئے اور انھیں شگافوں میں سے مستقبل کی شاعری کا نور چھن چھن کر آنے لگا، لیکن پوری عمارت کو گرانے کے لئے اور زلزلوں کی ضرورت تھی اور نئی عمارت کی تعمیر ابھی نئے معماروں کے انتظار میں تھی۔ ان نئے معماروں میں معمارِ اعظم اقبال تھا۔

اقبال کے مفکرانہ نظرئے اور ان کی اسلامی شاعری لوگوں کو اُن کے اہم ترین کارنامے نظر آتے ہیں لیکن ادب کی تاریخ میں ان کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں انقلابی اور ترقی پسند تھے۔ بیداریٔ جمہور کی خاطر وہ ہر نقشِ کہن مٹانے کو طیار تھے۔ اُن سے پہلے شاعری نفیِ حیات اور ہزیمت خوردہ ذہنیت کی شاعری تھی، انھوں نے اثباتِ حیات اور رجائیت کی شاعری کا آغاز کیا، اُن سے پہلے شعر و ادب میں فرشتے اور سلاطین ہی تھے انھوں نے شیطان اور مزدور کو بھی ایوانِ شاعری میں داخل ہونے کی اجازت دی اور ان سب باتوں میں وہ کسی کے مقلد نہ تھے نہ اُن کے جذبات ہنگامی تھے اسی لئے اُن کے کلام میں گہرائی اور ابدیت ہے، لیکن اقبال اس انقلاب کے صرف نقیب تھے جو آگے آنے والا تھا ان کی ترقی پسندی اُن کے

موضوعات اور تصورات تک محدود ہے، وہ خود اپنی شاعری میں مروجہ اور سکہ بند اصناف سے آزادی حاصل نہ کر سکے یہ آزادی اُن کے لئے دشوار بھی تھی، شاعری کی ابتدا کی تو داغ کے شاگرد ہوئے جو غزل کے بادشاہ تھے۔ غزل اصناف سخن میں قاعدوں اور اُصولوں کی پابندی کی ایک انتہائی شکل ہے، اقبال نے مدتوں اسی پیمانے میں مشق کی، آخر میں غزلیں کم ہو گئیں، ان کی جگہ مکمل اور مسلسل نظمیں زیادہ آگئیں لیکن قافیہ اور وزن کی احتیاط جو قدامت سے ورثہ میں ملی تھی قایم رہی۔

ٹکنیک کے لحاظ سے پہلے ترقی پسندوں میں عبدالحلیم شرر اور اسمٰعیل میرٹھی کے نام زیادہ مشہور ہیں ان دونوں نے اُردو میں پہلی مرتبہ غیر مقفیٰ نظم لکھنے کی کوشش کی اور چند نمونے پیش کئے۔ لیکن ان دونوں میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ وہ اسے ایک تحریک بنا سکیں، انھوں نے ایک تجربہ کیا اور بس، یہ تجربہ ایک تحریک تو کیا ایک ہیجان بھی نہ بن سکا۔ کیونکہ شرر اور اسمٰعیل سے لیکر عرصہ تک لوگوں کے خیالات آنے والے دور کے لئے طیار ہوتے گئے۔ چنانچہ مولانا شبلی بھی جو پُرانی وضع کے بزرگ تھے اور خود اپنی شاعری میں متقدمین کی تقلید کرتے تھے اس سے نہ بچ سکے، انھوں نے شعرالعجم میں جہاں شاعری کی ماہیت سے بحث کی ہے وہاں انھیں خیالات کا اعادہ کیا ہے جو حالی کے یہاں ملتے ہیں یعنی وزن اور قافیہ کو شعر کی ضروری شرط قرار نہیں دیا ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب ترقی پسندی کے آثار ہیں لیکن عملاً ترقی پسند شاعری اس کے بہت بعد شروع ہوئی۔ عظمت اللہ خاں مرحوم بھی نئی شاعری کے نقیب تھے انھوں نے اُردو عروض کو ہندی پنگل سے قریب تر کرنے کی سعی کی۔ گیت لکھے اور بعض نئے شعری پیمانے ان میں رائج کئے۔ اُن کی تصنیف میں سُریلے بول اسی نئی تحریک کی ایک آواز ہے۔

ترقی پسند شاعری کا ذکر آتے ہی ہمارا ذہن اس تحریک کی طرف منتقل ہوتا ہے جو ۱۹۳۶ء میں چند نوجوانوں نے ترقی پسند ادب کے نام سے شروع کی تھی، اس تحریک کا پہلا ادبی اعلان وہ مشہور بدنام مجموعہ ہے جو "انگارے" کے نام سے موسوم تھا، اس تحریک میں پہلے پہلے سجاد ظہیر، احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ کے نام نمایاں رہے، احمد علی کا مجموعہ "شعلے" بھی اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے "انگارے" کا جو حشر ہوا وہ آپ کو معلوم ہے، پُرانی چال کے ایک صاحب نے اس کا جواب لکھا رجعت پسندوں نے بڑی لے دے کی اور آخر کار کتاب سرکار نے ضبط کر لی۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۳ء تک اس تحریک نے اپنی عمر کے سات سال گزارے لیکن اس میں زیادہ تر نام اُن لوگوں کے ہیں جن کی ادبی زندگی ۱۹۳۶ء سے پہلے شروع ہو چکی تھی ۱۹۳۶ء میں یہ ہوا کہ وہ لوگ جو منتشر طور پر علٰحدہ علٰحدہ تجربے کر رہے تھے انھیں ایک زاویہ اور ایک پلیٹ فارم مل گیا لیکن اس کے باوجود جو مدت ترقی پسند ادب کے تجربے کو گزری ہے بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود ترقی پسند مصنفین اپنے اس دور کو بُحران کا دور کہتے ہیں اور وہ خود نہیں جانتے کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ تاہم پچھلے چند سالوں کے نظم و نثر کے مجموعہ کا مطالعہ کیا جائے تو موضوعات اور ان کے اظہار کے بعض اسالیب خاص رجحانات کی صورت میں نظر آتے ہیں، یہی میرے خیال میں ترقی پسندی کے عام رجحانات ہیں۔

ان عام رجحانات کا جایزہ لینے کے لئے دو چیزیں سامنے رکھنا کافی ہیں۔ ادبی رسالے اور نظموں کے مجموعے۔ رسالوں

میں ادبی دنیا (لاہور) ادب لطیف (لاہور) ساقی (دہلی) ہمایوں (لاہور) بیشتر اور نگار (لکھنؤ) جامعہ (دہلی) کمتر ترقی پسند شاعری کی اشاعت کے ذمہ دار ہیں۔ کلام کے مجموعوں میں جوش کے کئی مجموعے ہیں۔ احسان دانش کے چار مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ ن۔م راشد کا ماورا، فیض احمد فیض کا نقش فریادی، مجاز کا آہنگ، احمد ندیم قاسمی کی دھڑکنیں، جاں نثار اختر کی سلاسل، اختر الایمان کا گرداب، میراجی کے گیت، ان رجحانات کے ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ دو مجموعے ایسے ہیں جن میں بہترین ترقی پسند شاعری کے منتخبات ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق لاہور کا شایع کردہ مجموعہ سنہ ۴۱ء کی بہترین نظمیں، مکتبۂ اردو لاہور کا شایع کردہ مجموعہ سنہ ۴۲ء کی منتخب نظمیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔

سنہ ۴۱ء اور سنہ ۴۲ء کے منتخبات پر نظر ڈالنے سے یہ خاص رجحانات محسوس ہوتے ہیں۔ نظموں کا بڑا حصہ رومانی یا شاعرانہ ہے، جہاں شاعر زندگی سے فرار اختیار کرکے رومان میں پناہ لیتا ہے، دوسرا حصہ سیاسی اور انقلابی ہے جس میں ذہنی۔ سیاسی۔ معاشرتی اور اقتصادی نظام کو درہم برہم کرنے کے جذبات اشتراکی تصورات کے پس منظر میں ملتے ہیں۔ تیسرا رنگ فاحشانہ نظموں کا ہے۔ جن میں سے اکثر میں فحاشی مقصود بالذات ہے اور چند میں عریانی سے کچھ اور مقصد ہے۔ چوتھا رجحان اشاریت یا ابہام کا ہے یعنی ایسے تصورات، اشاروں کنایوں کی شاعری جس میں شاعر کی دنیا اس دنیا سے بہت دور ہے اور اسکی زبان ایک اجنبی زبان معلوم ہوتی ہے، کہیں کہیں ایک آدھ نظم ایسی بھی ملتی ہے جس میں فکر کی گہرائی ہے لیکن یہ اس تحریک کے خاص رجحانات میں نہیں آتی کیونکہ اس کے نمونے نایاب ہیں۔

اِن رجحانات کے مطالعہ کے لئے آپ پہلی قسم یعنی رومانی نظموں میں رات کی بات (مختار صدیقی) نفسیات (عظیم قریشی) تو اگر واپس نہ آتی (جوش) جواب تغافل (عدم)، برات (مقبول حسین) ننھا قاصد (اختر شیرانی) دسہرا اشنان (شاد عارفی) حسینہ کی موت (سعید احمد اعجاز) رقص (یوسف ظفر) سنہ ۴۱ء کی نظموں میں دیکھ سکتے ہیں۔ سنہ ۴۲ء کی نظموں میں اس قسم کی نظمیں 'میں کون ہوں' (ظفر پرویز) نومیدی جاوید (راجہ مہدی علی خاں) سعی خام (سعید احمد اعجاز) مہمان (مجاز) تصور کے دھندلکے ہیں (احتشام)، بیزار نگاہیں (جذبی) گلاب (ضیا جالندھری) آخری سجدہ (احمد ندیم شوق) ولولے (یوسف ظفر) یہ کیا (مقبول حسین احمد پوری) طوائف (جذبی) تفاوت راہ (اعجاز بٹالوی) ساتھی (مجید امجد) ایک عورت (سلام مچھلی شہری) کی دیکھ سکتے ہیں۔

دوسرے رجحان یعنی سیاسی انقلابی یا اشتراکی تحریک کی ترجمانی ان نظموں میں ملتی ہے سنہ ۴۱ء میں (۱) انتباہ (فیض احمد فیض) (۲) تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے (مطلبی)۔ (۳) نقشِ پا (اختر الایمان)۔

سنہ ۴۲ء میں (۱) اندھیر نگری (شاد عارفی) (۲) دوراہا (ڈاکٹر تاثیر) سیاسی لیڈر کے نام (فیض احمد فیض)

الہامی رجحان دونوں سالوں میں ایک دو شاعروں کو چھوڑ کر سب کے یہاں ملتا ہے۔ اس کے نمونے راشد کی خودکشی، زنجیر۔ میراجی کی رخصت اور دھوبی کا گھاٹ، راجہ مہدی علیخاں کی "جنت کی سیر" مخدوم محی الدین کی اندھیرا، سلام مچھلی شہری کی اندیشہ

اور 'سات رنگ' میں ملتے ہیں۔

فاحشانہ رنگ میں مخمور جالندھری کی دو نظمیں 'انوکھا بیوپاری' اور 'تالاب'، راشد کی نظم 'انتقام'، شریف کنجاہی کی نظم 'پسپائی'، سلام مچھلی شہری کی 'ڈرائنگ روم' دیکھنے سے اس تحریک کا یہ پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ ترقی پسند شعراء میں جوش کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اُن کے کلام کا ابتدائی حصہ اگرچہ اپنی صورت کے اعتبار سے نظم کے پُرانے اور مسلمہ اُصولوں کی پابندی میں نظر آتا ہے لیکن شروع سے ان کی توجہ غزل سے زیادہ نظم پر رہی۔ نظم کے موضوعات میں اُن کے ہاں بڑا تنوع ہے۔

مناظرِ فطرت سے وابستگی کا اظہار، رومان اور انقلاب اُن کی نظموں کے تین اہم عناصر ہیں۔ انقلاب کے پہلے نقیبوں میں جوش بھی ہیں، اُن کے یہاں یہ انقلاب سیاسی، ذہنی، اقتصادی اور مذہبی بیک وقت ہے لیکن اُن کے ہاں اس کی شدت رفتہ رفتہ ہی آئی ہے اور اب اُن کے یہاں ایک کہنہ مشق اُستاد کی پختگی اور توازن نمایاں ہے ایک چیز جو جوش کو ترقی پسند شاعروں میں بڑا مرتبہ دلاتی ہے ان کی "شعریت" ہے۔ اگر رومان اور شعریت جوش کی شاعری کے ترکیبی عناصر نہ ہوتے تو شاید ان کا ذکر اس سلسلہ میں سب سے پہلے نہ آتا۔ اُن کے یہاں ابہام یا اشاریت جو اکثر ترقی پسند اپنا طرۂ امتیاز بنائے ہوئے ہیں بالکل نہیں عریانی بھی جوش کے یہاں مقصود بالذات نہیں، البتہ مذہب اور اُس کے متعلقات میں جوش نے ایک رندِ لاابالی کی بیباکی اور جسارت کا اظہار کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے شوخی اقبال کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن اُس سے اقبال کا مقصد انسان کی برتری اور اُس کی خودی کی عظمت کا احساس ہے۔ جوش کے یہاں تضحیک اور استہزاء ہے، لیکن جوش کی ابتدائی شاعری میں یہ عناصر نہیں ملتے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے موجودہ ماحول اور اُن کے متوسلین نے اس بارہ میں انھیں زیادہ متاثر کیا ہے، جوش یوں بھی اپنی عمر کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں قوتِ ارادی ضعیف ہو جاتی ہے، کیا تعجب ہے کہ جوش کا یہ رنگ بھی اسی کمزوری کی علامت ہو۔ جوش کی شاعری انقلابی ہونے کے باوجود شعر و ادب میں متقدمین کی عظمت کی قائل ہے۔ اگر نوجوان ترقی پسند اس پیرِ مغاں سے قدامت کی عظمت بھی سیکھ لیں تو ان کی بہت سی خامیاں دور ہو جائیں۔

پنجاب کے رسالوں اور شاعروں کا ذکر آنے سے آپ نے محسوس کر لیا ہو گا کہ ترقی پسند شاعری میں زندہ دلانِ پنجاب کا بڑا حصہ ہے۔ پنجاب میں جو نام اس سلسلہ میں سب سے پہلے ملتے ہیں وہ تاثیر اور عابد علی کے ہیں۔ تاثیر پہلے غزلیں کہتے تھے، پھر گیت کہنے لگے، گیتوں میں محبت کے راگ کے ساتھ روٹی اور بھوک کے مسائل بھی آنے لگے، دہقان کا مستقبل، مزدور کا گیت اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ محبت کے گیتوں میں 'تم بھی پیت کرو تو جانو' اور 'مان بھی جاؤ جانے بھی دو' اچھے رومانی گیت ہیں، لیکن شاعری کے ٹکنیک میں تاثیر نے اُس وقت کوئی خاص اضافہ نہیں کیا، اور غالباً سنہ ۳۲ء یا سنہ ۳۳ء تک نظمِ غیر مقفیٰ اور آزاد نظم کا رواج عام نہ ہو سکا۔ کارواں کے سالناموں میں پہلی مرتبہ اس قسم کے بعض تجربے نظر آئے۔

بعض اور نوجوان ترقی پسند شاعروں کا ذکر کرنے سے پہلے میں احسان دانش کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں، اشتراکی شاعری

ترقی پسند شاعری کا سب سے نمایاں پہلو ہے ۔ احسان بھی بڑی حد تک اشتراکی شاعر ہے، لیکن اس کی اشتراکیت ڈرائنگ روم کی اشتراکیت نہیں، اور نہ زمانے کے فیشن یا ترقی پسندی کے نشان کے طور پر ہے، وہ ایک مزدور تھا اور اگرچہ اپنی جد و جہد سے اس نے اپنی زندگی کو ہموار بنانے میں کچھ کامیابی حاصل کرلی ہے، تاہم اُس کی کشمکش جماعت کی کشمکش کے ساتھ اب تک جاری ہے وہ صحیح معنوں میں مزدوروں کا کامریڈ ہے اُس نے مزدوروں کے ساتھ کام کیا ہے، اُن کے دُکھ درد میں شریک ہوا ہے اس لئے اس کے خیالات کارل مارکس، لینن اور اسٹالین کی بحثوں سے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ اُن کا خود اس کا تجربہ احساس اور تجزیہ ہے اس لئے خلوص کی جو بو باس اس کے یہاں ہے وہ اُس کے معاصرین میں سے کسی کو نصیب نہیں اس اعتبار سے میرے خیال میں ترقی پسند شاعری کے اشتراکی پہلو کا سب سے اچھا ترجمان احسان ہے ۔ وہ بہت سے عیبوں سے بھی پاک ہے ۔ اس کے یہاں دیوانگی کی حد تک پہونچی ہوئی شدت نہیں، اُس کے خیالات سطحی اور جذبات ہنگامی نہیں، اُس کی شاعری اُس کے شدید احساس کی پیداوار ہے، اُس کے یہاں عریانی نہیں ۔ زندگی سے فرار نہیں وہ ہر نئے اور پرانے کے جھگڑے میں نہیں پڑتا نہ اپنے کلام کو مبہم اشاروں اور دور از کار کنایوں سے چیستان بنانے کی کوشش کرتا ہے ۔ اس کی شاعری اُس کی شدید قوت حاسہ کا آزادانہ اور برجستہ اظہار ہے ۔

اب بعض اور ترقی پسندوں کو لیجئے ۔ پہلا نام فیض کا سامنے آتا ہے ۔ وہ ترقی پسندی کی رو میں غیر ارادی طور پر نہیں بہہ گیا ہے بلکہ اس نے شاعری کے موضوعات اور ٹکنیک پر غور و فکر کرنے کی کوشش کی ہے اسی لئے اس کے کلام میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو سطحی ہیجانات یا وقتی جذبات کی بجائے گہرے احساسات سے وابستہ ہیں اور اسی لئے اُن میں دیرپا ہونے کی صلاحیت ہے ۔ فیض کی ابتدائی شاعری میں رومان اور ٹکنیک میں پابندی نظر آتی ہے لیکن بہت جلد وہ زندگی کی اُلجھنوں میں گرفتار نظر آتا ہے اس کے رومان کی دنیا ویران ہوتی معلوم ہوتی ہے لیکن محبت کا اب بھی اس پر غلبہ ہے ۔ ایک مشہور نظم کا عنوان "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" ہے ۔ لیکن تلخ حقائق رومان کی دنیا میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ چنانچہ فیض کا موضوع محبت کے سوا اور چیزوں کا بھی احاطہ کرتا ہے، موضوع سخن کے عنوان سے فیض نے ایک نظم لکھی ہے :

آج تک سُرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے — آدم و حوّا کی اولاد پہ گزرا کیا ہے !
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی ہے — ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے

دنیا کے ان آلام اور مصائب سے گھبرا کر فیض محبت کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے ۔ انگریزی شاعروں میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اکثر نے یہی راہ فرار اختیار کی ہے، لیکن فیض کے لئے غم روزگار کی تلخی وہاں بھی کم نہیں ہوتی ۔

ٹکنیک کے اعتبار سے اب فیض میں تبدیلی آتی جا رہی ہے ۔ غیر مقفیٰ اور آزاد نظموں کی تعداد بڑھ رہی ہے ۔ اس نظم سے آپ اُس کے موجودہ موضوعات اور ٹکنیک دونوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں ـــــ سیاسی لیڈر کے نام :

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ — رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے

جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز جس طرح تیتری کہسار پر یلغار کرے
اور اب رات کے رنگین و سیہ سینے میں اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جابجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

ظلمت شب میں امید کی کرن کا یہ وہی فلسفہ ہے جس کی پہلی جھلک اقبال نے دکھائی تھی اپنی ایک اور نظم "انتباہ" میں بھی فیض اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں۔

فیض کا یہ رنگ اپنے ساتھی راشد سے مختلف ہے جس کے یہاں انجام کار خودکشی پر ختم ہوتا ہے۔ فیض کے ساتھ راشد کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، وہ ترقی پسندوں میں سب سے بڑا ترقی پسند ہے کیونکہ موجودہ نظام سے بیزاری اُسکی شاعری کی روح ہے۔ اسی نظام کی بدولت وہ بھی فیض کی طرح رومان میں پناہ ڈھونڈھتا ہے لیکن زندگی کا کھٹکا وہاں بھی لگا رہتا ہے اُس کی نظم 'رقاصہ' کو دیکھئے:

اے مری ہم رقص مجھکو تھام لے زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو رقص گہ کے چور دروازے سے آکر زندگی
ڈھونڈ کر مجھ کو نشاں پالے مرا اور جرم عیش کرتے دیکھ لے

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی میرے لئے ایک خونیں بھیڑئے سے کم نہیں

راشد کی ابتدائی نظموں میں انسان پہلا سانیٹ ہے جس میں اشتراکی خیالات کی جھلک ملتی ہے۔ دوسرے سانیٹ کا عنوان خواب کی بستی ہے۔ تیسرے سانیٹ کا عنوان ستارہ ہے۔ اس کا آخری شعر یہ ہے:

کبھی یہ خاکداں گہوارۂ حسن و لطافت ہو کبھی انسان اپنی گم شدہ جنت کو پھر پالے

اس ذہنی کشمکش اور اضطراب میں گھبرا کر راشد مذہب کے تصورات کی زنجیروں کو بھی توڑ دیتا ہے، اس ذہنیت کے ترجمان چند شعر یہ ہیں:

اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت ——— اُداس (دریچے کے قریب)
تین سو سال کی ذلت کا نشاں ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی،

گناہ کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس کے آخری دو مصرعے یہ ہیں:

کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا بے بسی میرے خدا وند کی تھی

جن حضرات نے اقبال کی نظم "مکالمہ جبریل و ابلیس یا ابلیس کی مجلس شوریٰ" پڑھی ہے وہ اس کا مقابلہ راشد کے ان مصرعوں سے کریں، صرف یہی ایک نکتہ راشد کا مقام متعین کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک اور نظم "اتفاقات" ہے۔ اس کے دو مصرعے یہ ہیں ؛

شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں   اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے

یا 'انسان' کے عنوان والی نظم میں :

کسی سے دور یہ اندوہ پنہاں ہو نہیں سکتا   خدا سے بھی علاج دردِ انساں ہو نہیں سکتا

مذہب کے بارہ میں اپنے ان خیالات کی وضاحت راشد نے اپنے الفاظ میں اس طرح کی ہے :

"مذہب کی تخفیف مقصود نہیں لیکن یہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ہمارے مذہب نے ہماری انفرادیت کو غیر ضروری حد تک صدمہ پہونچایا ہے اور خود فکری کے اس نایاب جوہر کو جو ادبیات اور تہذیب کے فروغ اور ترقی کے لئے ضروری ہے آہستہ آہستہ محدود کر دیا ہے۔"

جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہر طرف سے بیزار ہو کر راشد فرار اختیار کرتے ہیں، اور دو چیزوں میں پناہ لیتے ہیں 'شراب' اور 'عورت' "مے سے غرض نشاط" متقدمین کو بھی نہ تھی وہ اسے ایک 'گونہ بیخودی' کے لئے ہی چاہتے تھے، 'عورت' البتہ ان کے اعصاب پر سوار نہ تھی راشد کی جن نظموں میں 'عورت' سوار ہے وہ خاص طور پر یہ ہیں۔ (۱) ہونٹوں کا لمس (۲) ایک رات (۳) دریچے کے قریب (۴) رقص (۵) انتقام (۶) آخر الذکر نظم میں ایک نیا فلسفہ ہے۔ نظم کا آخری حصہ یہ ہے :

اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے ہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام

اس ذہنی خلفشار کا نتیجہ ظاہر ہے۔ جب شراب اور عورت بھی شاعر کے غم کو بھلا نہیں سکتے تو وہ خودکشی پر آمادہ ہوتا ہے "خودکشی"، اُن کے مجموعے کی آخری نظم ہے۔

ٹکنیک کے بارہ میں راشد نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی کم اہم نہیں۔ 'ماورا' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

(۱) "میری رائے میں جہاں تک ٹکنیک کی قیود کی متعصبانہ حمایت ایک فرسودہ قدامت پرستی کی دلیل ہے وہاں اس کے خلاف مجنونانہ احتجاج بہت بڑی حد تک بے راہ روی کے مترادف ہے۔ جو لوگ شدید اور فوری انقلاب چاہتے ہیں وہ ندرت پرستی کے جوش میں نہ صرف توافق اور ہمواری کی تعمیری حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں بلکہ اُن کو مسخ کر کے اُن سے

نقصان کی تلافی کسی بہتر یا نئی چیز سے کرنا بھی نہیں جانتے ...... قدیم اسالیب بیان کا اولین باغی ہونے کے باوجود میرے نزدیک یہ اعتراض قابل پذیرائی نہیں کہ بحروں اور قافیوں کی پابندی شاعری کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے......

اجتہاد کا جواز صرف یہ نہیں کہ اس سے کسی حد تک قدیم اصولوں کی تخریب عمل میں آئی بلکہ یہ کہ آیا تعمیری ادب اس میں سے کسی نئی صبح کی طرح نمودار ہوتا ہے یا نہیں اگر یہ نہ ہو تو اجتہاد بیکار ہے۔"

اس حیثیت سے راشد کے مجموعے کو دیکھا جائے تو اس میں باقاعدہ نظمیں، سانیٹ اور غیر مقفیٰ سب شامل ہیں لیکن بالکل آزاد اور بے اصولی کے اصول کی مثالیں راشد کے یہاں نہیں ملتیں۔ اسی لئے اس کا ایک ٹکنیک اس کا اپنا ہے، جس میں عام نوجوان ترقی پسندوں کی وہ بے راہ روی نہیں ہے جو غیر مقفیٰ اور آزاد نظم کو اظہار کا ایک سستا اور آسان ذریعہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے، انگریزی شاعری میں کچھ جاندار چیزیں ہیں تو وہ فیض اور راشد ہی کے یہاں ہیں۔

فیض اور راشد کے بعد مجاز کو لیجئے، اُن کے یہاں بھی پہلے رومان اور خالص رومان ہے رفتہ رفتہ اشتراکی خیالات آئے ہیں۔ لیکن رومان اب بھی جوش کی طرح مجاز کی شاعری کی جان ہے 'نذر دل'، 'مجبوریاں'، 'کس سے محبت ہے'، 'ایک غمگین یاد'، 'اُن کا جشن سالگرہ'، 'نورا نرس کی چارہ گری'، 'ننھی پجارن'، 'آج کی رات'، 'بتانِ حرم'، 'اصنام عشق'، اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ 'ان کا جشن سالگرہ' ان میں اچھی نظم ہے:

اک مجمعِ رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

ہونٹوں پہ فدا روح بہار گل ونسریں آنکھوں کی چمک رشکِ بزم مہ و پرویں
پیراہن زرتار میں اک پیکر سیمیں

لہریں سی وہ لیتا ہوا اک پھول کا سہرا سہرے میں جھلکتا ہوا اک چاند سا چہرا
اک رنگ سا رُخ پر کبھی ہلکا کبھی گہرا

ہر سانس میں احساس فراواں کی کہانی خاموشی مجوب میں ایک سیل معانی
جذبات کے طوفاں میں ہے دوشیزہ جوانی

"نرس نورا" اُس کی مشہور نظموں میں ہے:

وہ ارضِ کلیسا کی اک ماہ پارا وہ دیر و حرم کے لئے اک شرارہ
وہ فردوس مریم کا اک غنچۂ تر وہ تثلیث کی دختر نیک اختر
جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی
وہ پُر رعب تیور وہ شاداب چہرہ متاعِ جوانی پہ فطرت کا پہرہ

مری حکمرانی ہے اہلِ زمیں پر — یہ تحریر تھا صاف اس کی جبیں پر
مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سوجھی — جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی
ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکا لی
لبِ لعل افشاں سے اک شے چرا لی

مجاز کا یہ رنگ اُس کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ ترقی پسندوں میں مجاز اُن چند شاعروں میں ہے جو ابھی تک غزل کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ ترقی پسندی کے عام رجحانات بھی مجاز کے یہاں ملتے ہیں۔

'اندھیری رات کا مسافر'، 'ایک سفید پوش رنگریز'، 'نوجوان سے'، 'سرمایہ داری'، 'انقلاب'، 'ہمارا جھنڈا'، 'ایک جلاوطن کی واپسی پر'، 'خواب سحر'، 'مزدوروں کا گیت'، 'مہمان' اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ آخری نظم میں نئی شاعری کی اشاریت کی جھلک بھی موجود ہے 'رات' اور 'ریل' بھی اچھی نظم ہے۔

مجاز زیادہ تر پابند نظمیں لکھتے ہیں۔ الفاظ کی کمی جو اور ترقی پسندوں کے یہاں صاف محسوس ہوتی ہے، مجاز کے یہاں نہیں۔ احمد ندیم قاسمی پرانے لکھنے والوں میں ہیں، اُن کا خاص کلام رومانی ہے۔ ریت کے میدان اور کھجوروں کے درخت ندیم قاسمی کی رومانی دنیا کے نشان ہیں۔ اُن کی محبوبہ گاؤں کی ایک الھڑ بھولی بھالی دوشیزہ ہے۔

احمد ندیم مختصر قطعے لکھتے ہیں جو زیادہ تر اسی رومانی رنگ میں ہوتے ہیں لیکن گاؤں کی پُرسکون فضا میں بھی کبھی کبھی ہنگامے پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً:

افق پر دور برفانی پہاڑوں سے اُٹھی بدلی — گزر کر میرے ویراں کھیت پر سے دور جا برسی
کچھ ایسے میں نے دیکھا اس طرف جیسے کوئی مفلس — امیروں کی نگاہِ تند میں ڈھونڈے خدا ترسی

'محلوں کے سائے'، 'روشنی اور سائے'، 'بھوکوں کے ووٹ'، 'تہذیب کی معراج'، 'مشینوں کا زمانہ'، 'بے چارگی'، 'مجبور مفلس'، 'نوجوان بھکارن' اسی قسم کے قطعات ہیں — 'گم کردہ راہ'، 'دنیائے خام'، 'کفرانِ نعمت' نسبتاً طویل نظمیں ہیں جہاں دنیا کے آلام اور مصائب انقلاب کی خواہش ناکامی کا احساس موجود ہے۔ ندیم مذہب کے تصور سے بیزار نہیں، نہ اُس کے یہاں عریانی اور ابہام ہے۔

ایک اور ترقی پسند میراجی ہیں۔ یہ بہت کچھ لکھتے ہیں اور ان کا کلام ادبی دنیا۔ ہمایوں۔ ساقی اور ادب لطیف میں اکثر شائع ہوتا رہا ہے لیکن میرے خیال میں یہ راشد اور فیض سے بہت پیچھے ہیں۔ اول تو یہ کہ ان کے یہاں وہ ابہام اور اشاریت زیادہ ہے جو اس دور کے ترقی پسندوں کی ایک عام خامی ہے۔ لیکن میراجی کی یہ خامی ہی اُن کے نزدیک، اُن کا فن ہے۔ سنا گیا ہے کہ میراجی پہلے اپنی نظم لکھ لیتے ہیں، اور پھر ہفتوں اپنے اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

جنسیات میں بھی میراجی کا یہی رنگ ہے۔ کسی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں میراجی کی ایک نظم کی تشریح کرتے ہوئے

لکھا تھا کہ گوری کو اشنان کرتا دیکھ کر اس کی حس شعری اس کے جسم کے کسی تناسب حصّہ سے بیدار نہیں ہوتی بلکہ وہ سب سے پہلے یہی سوچتا ہے کہ وہ آج بھلا کیوں نہائی ؟ ایک اور نظم کا آخری ٹکڑا یہ ہے :

سنتا ہوں شہر کے ایک محلے میں
نفس کی پوجا کرنے والی ایک آوارہ عورت ہے
اور سستا ہے اُس کا کرایہ، ہاں سستے ہیں اس کے دام

اشتراکی خیالات میراجی کے یہاں بھی ملتے ہیں لیکن راشد یا فیض کی طرح فکر و کاوش، یا ندیم کی سادگی، یا جوش یا مجاز کی شعریت بالکل نہیں۔

اسوقت اس کا موقع نہیں کہ میں موجودہ ترقی پسند شعرا میں سے سب کا ذکر آپ کے سامنے کرسکوں، لیکن مجھے اُس انگریز پروفیسر کے الفاظ بے ساختہ یاد آتے ہیں جس نے انگلستان کے ایسے شاعروں کی نسبت لکھا تھا کہ "اگرچہ ان شعرا میں دلچسپ کئی ہیں لیکن اچھے چند ہی ہیں، اُن کی مطبوعات کا پڑھنا اُن کی تصنیف سے زیادہ ہمّت طلب اور صبر آزما ہے، کیونکہ اُس کا بڑا حصّہ مہمل ہے، اس میں سوائے تکرار کے کچھ نہیں"۔

ان ترقی پسندوں میں سے اکثر نوجوانوں کا یہی حال ہے، بھوک اور عورت ان کی شاعری کے محور ہیں۔ گل و بلبل کی شاعری تو دو سو سال چلی، لیکن ان کی عورت پچھلے دس سال ہی میں سارے منازل طے کر گئی، یہی وجہ ہے کہ بالعموم ان کی شاعرانہ زندگی فلم اسٹار کی طرح ہے، ان کی شاعری میں 'عمر برق و شرار ہے دُنیا' آخر میں ان میں سے چند کا سرسری ذکر اور کرسکتا ہوں۔

مختار صدیقی کی نظموں میں 'رات کی بات' ایک پابند رومانی نظم ہے۔ 'رسوائی'، 'سکھ میں دُکھ' بھی اسی قسم کی نظمیں ہیں جن میں شاعر نے رومان میں پناہ لی ہے، یہ دونوں نظمیں بھی پابند ہیں۔

اختر الایمان اکثر لکھتے ہیں لیکن راشد یا فیض کی طرح فکر کے آثار اُن کے یہاں نہیں ملتے، انھوں نے اپنے مجموعہ کا نام "گرداب" خوب رکھا ہے۔ یہی حال اُن کی شاعری کا ہے۔ اُن کی نظموں میں "رقاصہ" ایک طویل پابند نظم ہے جس میں راشد کی طرح وہ بھی آلام روزگار سے پناہ لینے کے لئے آمادۂ رقص ہیں، اس رقص میں خوب وحشت بھی انھیں توہمات نظر آتے ہیں اور دنیا کے مختلف دھوکوں اور گھاتوں کا مفصل ذکر کرتے ہیں، اس خیال کی مزید وضاحت اُن کی نظم "مجرم" سے ہوتی ہے یہاں بھی راشد کی طرح خودکشی پر انجام ہوتا ہے، 'فیصلہ' میں اختر کا یہ خیال :

آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کردوں

میرے خیال میں "جواری" اختر کی اچھی نظموں میں ہے، اس میں جذبات کی شدت اور اشاریت کے باوجود ابہام نہیں۔ اس کا آخری ٹکڑا یہ ہے :

ہم تو اپنی سی کر ہار ہے، کوئی بھی تعمیر نہ ٹوٹی

سب ہی جواری، سب ہی لٹیرے، کون کسے بازی جیتے بیت گئی جیسی بیتی، باقی جاہے جیسی بیتے
شام و سحر کی رنگ و نظر کی، پاؤں سے زنجیر نہ ٹوٹی

'وداع' اور 'پگڈنڈی' بھی اچھی نظمیں ہیں۔

قیوم نظر کی نظموں میں "حسن آوارہ" "برسات کی رات" "یہ اور وہ" رومانی نظمیں ہیں۔ "التجا" میں اپنے درد سے خطاب ہے:۔

مجھ کو دے کے موت، زندگی کو مار دے

جنگ' میں قیوم نظر جنگ کی تباہ کاریوں کو بیان کرتا ہے۔ "جوانی" بھی انھیں خیالات کی حامل ہے، جہاں قیوم نظر اس پر نوحہ کرنے لگتا ہے کہ موجودہ عالمگیر جنگ میں نسل انسانی کے جوان کس طرح بھینٹ چڑھ رہے ہیں "بنی آدم" میں "اشاریت" نے ابہام پیدا کر دیا ہے۔

سلام مچھلی شہری کے خیالات بالکل سطحی اور انداز بیان خام ہے۔ اُن کے کلام میں "سڑک بن رہی ہے" "مجھ کو آپ سے شکوہ ہے" "اندیشہ"، "ڈرائنگ روم" اُن کے ملے جُلے انداز کو ظاہر کرتی ہیں، اشتراکیت سے ہمدردی، رومان اور ابہام سب موجود ہے۔ ڈرائنگ روم' میں وہی انداز ہے جو راشد کی نظم "انتقام" میں ہے۔ یہاں سلام ایک مفلس عورت کو اپنے "ڈرائنگ روم" کی سیر کراتا ہے اور پھر اس سے سیہ کاری کا ارتکاب کرتا ہے، کیونکہ وہ مفلس ہے۔

اس مختصر جائزہ سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہمارے نوجوان شعرا کیا سوچ رہے ہیں اور کس طرح اس کا اظہار کر رہے ہیں، ان رجحانات پر بحث کرنے سے پہلے ایک بات کا ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے۔ یہ مسلمہ ہے کہ یہ ترقی پسند شاعری ایک تجربہ ہے اور ہمارے نوجوان شاعر گویا ایک بحرانی کیفیت سے گزر رہے ہیں، اس لئے اُن کے متعلق کوئی قطعی رائے دینے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، ان میں ابھی بہت سی خامیاں ہیں جو ہر نئے انقلاب کے ساتھ آتی ہیں، بعض چیزیں اب بھی مہمل اور مبہم ہیں، لیکن شاعری کی تاریخ میں یہ بھی کوئی عجیب واقعہ نہیں، پہلے چیزیں ایسی ہی نظر آتی ہیں، لیکن وقت اور تجربہ انھیں ان الائشوں سے پاک کر دیتا ہے۔ ممکن ہے بعض چیزیں اس نئے تجربہ میں جائز ثابت ہوں اور انقلاب کا طوفان رُک جانے پر ہمارے شعر و ادب کا جز بن جائیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ وقت صرف دیکھنے کا نہیں سوچنے کا بھی ہے۔ اس لئے اس نئی شاعری پر غور کرنا ہمارے اور ترقی پسند شاعروں کے لئے یکساں طور پر ضروری ہے، اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ اس نئی شاعری کے صرف دو مرکز یا محور ہیں انقلاب اور عورت، یہ صحیح ہے کہ زندگی کے اکثر پہلو انہی دونوں سے وابستہ ہیں۔ لیکن جس طرح متقدمین کی شاعری اپنی حدود سے باہر نہیں نکلتی تھی اسی طرح ان شاعروں نے بھی اپنی دُنیا تنگ کر لی ہے۔ اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ بعض اُصول اور مسلمات ایسے ہیں جو ازلی اور ابدی ہیں، بعض قدریں ہماری زندگی میں اضافہ نہیں

مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح شعر و ادب میں بعض ابدی عناصر موجود ہیں جن میں زمان و مکان کے انقلابات سے کوئی تغیر یا تبدیلی نہیں ہو سکتی، ہر شاعری اچھی یا بُری ہو سکتی ہے لیکن بڑی شاعری ہر اچھی شاعری کو نہیں کہا جا سکتا۔

شعر کی اچھائی یا بُرائی کا تصور زمانہ کے ساتھ بدلتا رہا ہے لیکن دنیا کی ہر زبان میں بعض نام ایسے نظر آتے ہیں جنھیں حیاتِ ابدی اور قبولِ دوام حاصل ہو چکا ہے یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے زندگانی کے ابدی حقایق کو بے نقاب کیا ہے اور ان کی شاعری کا یہی وہ حصّہ ہے جو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہا ہے۔ اس پہلو سے جدید شاعری پر نظر ڈالئے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس کا بڑا حصّہ وقتی یا ہنگامی ہے، مثلاً بھوک کا مسئلہ، اس وقت بیشک یہ ہماری زندگی کے اہم ترین مسائل میں ہے لیکن یہ صرف ایک اقتصادی مسئلہ ہے جس سے ہر کسی کو ہمدردی ہے۔ مسئلہ دولت کی غلط تقسیم، حکومت کے غلط طریقے اور بعض طبقوں کے اقتدار سے پیدا ہو گیا ہے، حیاتِ انسانی میں یا نظامِ عالم میں اس کی حیثیت مستقل یا ابدی نہیں۔ اگر آج یہ مسئلہ حل ہو جائے اور اشتراکیوں کو اپنی فردوسِ گم گشتہ دوبارہ مل جائے تو آج ہی بھوک کے مسئلہ کے ساتھ بھوک کی شاعری بھی ختم ہو جائے۔ میں اس شاعری کو بیکار نہیں سمجھتا بلکہ میرے نزدیک بعض شاعروں نے اسی موضوع پر اچھی شاعری کے نمونے بھی پیش کئے ہیں لیکن پھر بھی یہ بڑی شاعری نہیں۔ اس میں کسی ہمہ گیر، ازلی اور ابدی جذبہ کی تسکین کا سامان نہیں اسی لئے اس میں بڑائی نہیں۔

اس بھوک کے مسئلہ نے شاعری میں کئی عناصر کو داخل کر دیا ہے۔ مثلاً بعض لوگ جو شدید اور فوری انقلاب چاہتے ہیں وہ موجودہ اقتصادی نظام کے ساتھ ساتھ زندگی کی بعض مستقل قدروں مثلاً مذہب اور اخلاق کے بنیادی تصورات کو بھی ایک کہنہ نظام کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ بھوک کا مسئلہ بغیر مذہب کی تضحیک اور استہزا کے بھی حل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بعض ترقی پسند ایسے ہیں جو اشتراکی خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن اُن کا آخری سہارا خدا ہی ہے۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی کا یہی رنگ ہے۔ انجام سے مایوسی اور خودکشی اسی کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ انسان جب کوئی سہارا نہیں پاتا تب ہی خودکشی پر آمادہ ہوتا ہے۔

ممکن ہے مجھے یا آپ کو اشتراکیت کے بعض پہلوؤں سے اختلاف ہو، بعض سے اتفاق ہو لیکن جس طرح ادب پر سرمایہ دار، سلاطین اور فرشتوں کا اجارہ نہیں اسی طرح ادب کو مزدوروں، غریبوں اور شیطانوں کی ملکیت سمجھنا بھی غلط ہے، اشتراکی شاعری موجودہ شاعری کا ایک شعبہ تو ہو سکتی ہے اور وہ بھی صرف اُن کے لئے جو واقعی مزدوروں کے کامریڈ اور اُن کے درد دکھ کے شریک ہیں۔ لیکن یہ شاعری تمام شاعری نہیں ہو سکتی، یہ کہنا گویا شاعری سے اس کی ہمہ گیری چھین لینا ہے۔ کیونکہ ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر قوم میں کچھ لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو پیٹ کی بھوک اور جنسی خواہش کے ساتھ ایک روحانی بھوک بھی محسوس کرتے ہیں۔ اگر شاعری اُن کی تسکین کا سامان بہم نہیں پہونچا سکتی تو یہ اس کی بڑی محرومی ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے اس محرومی ہی کو کامیابی سمجھا ہے۔

اگرچہ ادب میں احتساب کا میں قایل نہیں لیکن انسانیت کے ابتدائی اصول کسی اقتصادی مسئلہ کے حل کے لئے قربان نہیں کئے جا سکتے، اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لینے کا جذبہ بے شک قابلِ ستایش رہے لیکن راشد کی نظم میرے نزدیک

شاعری سے زیادہ خرافات کے تحت میں آتی ہے۔ ایک اجنبی برہنہ عورت کے ہونٹوں سے رات بھر ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام لینا، گویا تسکین ہوس کی ایک آڑ ہے جس کا انداز بیان ہمارے واسوختوں سے کچھ زیادہ ہی فحش اور عریاں ہے۔ اسی طرح سلام مچھلی شہری کی نظم 'ڈرائنگ روم' یا مخمور جالندھری کی "تالاب" ادبی خرافات ہیں۔ آخر الذکر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

ابھی کل ہی کا قصہ ہے کہ اک نادار دوشیزہ
سڑے تالاب کی سخت اور گندی کھال کی مچھلی
پھٹے کپڑوں میں لپٹی، میل سے چکٹی، نزاکت سے
لگی ہنس ہنس کے میرے پاس آکر ہاتھ پھیلانے
اُدھر وہ رحم کی طالب، ادھر میں سوچ میں گم تھا
بُری کیا ہے، اگر اک رات اس کے ساتھ کٹ جائے

حقیقت نگاری شاعر کا فرض سہی لیکن کیا یہ حقایق اسی طرح منظر عام پر عمل میں بھی لائے جاسکتے ہیں۔ اگر نہیں تو ان کا بیان کس طرح سند جواز حاصل کر سکتا ہے۔

ترقی پسند شاعری کے ٹکنیک کے سلسلہ میں بہت کم کہنے کی ضرورت ہے۔ راشد کے بقول اجتہاد صرف یہ نہیں کہ ہر پُرانی چیز کو ترک کر دیا جائے۔ اجتہاد جب ہی اجتہاد ہو سکتا ہے جب پُرانی چیزوں کی تلافی بہتر بدل سے کر دی جائے۔ وزن، ردیف اور قافئے کے پُرانے قانون واقعی دقیانوسی ہیں اور ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، لیکن ہر قانون سے آزادی صرف اپنے عجز اور کمزوری کی دلیل ہو سکتی ہے۔ مثلاً وزن کے قانون سے آزاد ہونا شاعر کے بس میں نہیں۔ وزن انسانی توجہ کے لئے بڑا زبردست محرک ہے اسی وجہ سے ہم نثر کے مقابلہ میں نظم زیادہ آسانی سے یاد رکھ سکتے ہیں، اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ اٹلی کے وہ شاعر جنھوں نے غیر مقفیٰ اور آزاد نظموں کا پہلا تجربہ کیا تھا گمنامی کی آغوش میں پہونچ چکے ہیں۔ پھر وہ نظم جو گائی نہ جاسکے یوں بھی ابدیت سے محروم ہے۔ اس اعتبار سے ترقی پسند شاعری کے دو حصے ہو سکتے ہیں۔ ایک کتابی شاعری اور ایک شاعرانہ شاعری، آزاد نظمیں کتابی شاعری کے تحت میں ہیں۔ گیت، سانیٹ، پابند غیر مقفیٰ نظمیں گائی جاسکتی ہیں اور شاعرانہ شاعری میں داخل ہیں۔

اسی شاعری کا ایک اور غور طلب پہلو اشاریت اور اس سے پیدا ہونے والا ابہام ہے۔ ابہام متقدمین کے یہاں بھی ملتا ہے بلکہ لوگوں نے آخر عمر میں چیستان اور معمہ گوئی بھی اختیار کی ہے۔ امانت اور محسن اس کی دو مثالیں ہیں مگر اُن کی انتہا ترقی پسندوں کی ابتدا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی [illegible] اور [illegible] اسکول کی طرح ان کی ایک شاعرانہ دُنیا اپنی خلوق کی ہوئی ہے وہاں کی چیزوں کا بیان استعاروں اور تشبیہوں کے ذریعہ ہی سے ممکن ہے لیکن جس قسم کے چند اشاروں کا ذکر میں نے اوپر کیا وہ شاعر کے عجز کا اظہار کرتے ہیں۔

اب جب کہ ترقی پسند شاعری ایک تجربہ کی ابتدائی منازل سے کچھ آگے نکل چکی ہے اور اس کے بعض میلانات اور رجحانات مسلّم ہو چکے ہیں، ضرورت ہے کہ ترقی پسندی کا کوئی معیار مقرر کیا جائے۔ سب سے اچھا یہ ہے کہ ترقی پسند کوئی ایسا ادارہ یا اکیڈمی قائم کریں جو ترقی پسند تحریک کی نگرانی اور صحیح ترقی پسند ادب کی اشاعت کی ذمہ دار ہو۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ ترقی پسند شاعری نام نہاد ترقی پسندوں کی مہمل گوئی، عریاں نگاری اور فحاشی کی وجہ سے بدنام ہو جائے اور نئی شاعری کی آواز صدا بصحرا ثابت ہو۔ ترقی پسند تحریک میں زندگی کے آثار ہیں کیونکہ ترقی کا راستہ کبھی مسدود نہیں ہوتا۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (اقتباس از "مصنف")

ماخذ القرآن پر ایک نظر

سالنامہ "نگار" اس سال ایک نہایت ہی اہم اور دلچسپ موضوع کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ممکن ہے بعض اصحاب اسے پسند نہ کریں کہ ایک عیسائی مشنری ڈاکٹر ٹسڈل کی ہفوات نگار ایسے کثیر الاشاعت اور موقر ماہنامے میں شائع ہوں اور قارئین نگار مولانا نیاز کی شستہ اور منجھی ہوئی زبان میں مزے لے لے کر انھیں پڑھیں۔ ہو سکتا ہے کہ عام قارئین پر اس کا کچھ اچھا اثر نہ ہو۔ لیکن میں علم اور تحقیق کے سلسلہ میں مصلحت کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ماخذ القرآن پر ڈاکٹر ٹسڈل کے زیر نظر مقالہ نے جو خیالات میرے ذہن میں پیدا کر دئے ہیں ان کا تعلق بیک وقت تاریخ، فلسفہ مذہب، نفسیات اور لسانیات سے ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان تمام مباحث پر تفصیل کے ساتھ لکھا جائے لیکن کاغذ کی گرانی "نگار" کے قیمتی صفحات کی تنگ دامانی اور فرصت کی قلت یہ تمام اسباب مجبور کر رہے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک نقطہ کو لیکر اس پر بحث کی جائے۔

ڈاکٹر ٹسڈل کی کتاب تمہید کو چھوڑ کر پورے پانچ ابواب میں پھیلی ہوئی ہے۔ جن میں سے پہلے اور آخری باب میں ڈاکٹر صاحب نے یہ بتانا چاہا ہے کہ اسلام نے عرب جاہلیت کی رسوم اور گرد و پیش کی خالص عربی تحریکوں سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ میری نگاہ میں ڈاکٹر ٹسڈل کی تصنیف کا یہ حصہ زیادہ اہم ہے اس لئے کہ اس میں اسلام کی مخصوص تعلیمات، قرآنی احکام و اوامر اور شرعی و قرآنی اصطلاحات کو جاہلی عرب سے ماخوذ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخری باب میں خصوصیت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ قرآن کی امتیازی تعلیم یعنی توحید الہی بھی کوئی جدید تحریک نہیں بلکہ حضور رسالت پناہ سے پہلے عرب میں اسی قسم کی ایک تحریک اور بھی تھی جس میں شامل ہونے والے اصحاب "حنیف" کہلاتے تھے۔ اس تحریک کا مقصد تھا ایک خدا کی پرستش اور عرب کی جاہلانہ رسوم اور اخلاقی ناسزاکاریوں کی مذمت اور ان کا استیصال۔

بے شبہ حضرت رسالت سے پہلے ہی عرب کے کچھ باشندے بت پرستی ایسی رسم قبیح سے نفور ہو گئے تھے اور ان میں زید بن عمرو بھی تھے۔ لیکن یہ لوگ عرب کے اس روشن خیال طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو قریب قریب ہر قوم میں پایا جاتا ہے خواہ وہ کتنی ہی پست تر اور ذہنی اعتبار سے گری ہوئی کیوں نہ ہو۔ یہ طبقہ اس قوم کا زیرک ([illegible]) حصہ کہلاتا ہے۔ ان چند لوگوں کے وجود سے اسلام کی وسیع اور ہمہ گیر تحریک پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ واقعہ یہ ہے کہ زید بن عمرو اور ان کے ہم خیال چند اور عرب شاید اس کے سوا کچھ جانتے ہی نہ تھے کہ بت پرستی ایک طرح کی گمراہی ہے اور ابراہیم علیہ السلام، جو خدا

کے فرستادہ تھے اور ہجرت کر کے مکہ تشریف لے آئے تھے، کم سے کم بت پرستی کے مبلغ نہ تھے۔ یہ ایک دھندلا سا خاکہ ان کے ذہنوں میں تھا جس کے نقوش پوری طرح صاف بھی نہ تھے۔ وہ یہ تو محسوس کرتے تھے کہ جس راہ پر وہ چل رہے ہیں، غلط ہے لیکن صحیح راہ کیا ہے اس سے وہ باخبر نہ تھے۔ چنانچہ ابن اسحاق کے ان الفاظ سے، جنھیں ڈاکٹر ٹسڈل نے بھی نقل کیا ہے، واضح طور پر ان کی یہ حیرانی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ الفاظ حضرت زید فرمایا کرتے تھے: ”یا اللہ اگر میں جانتا کہ تیرے نزدیک کون سا طریقہ پسندیدہ ہے تو میں تیری عبادت اسی طریقے سے کیا کرتا۔ مگر مجھے یہ بات معلوم نہیں۔“

ڈاکٹر ٹسڈل شاید نہیں جانتے کہ مذہبی تاریخ میں معبود یا واحد معبود کے تصور کو کیا حیثیت حاصل ہے اور اس باب میں فلسفہ مذہب اور نفسیات کے عالم کیا رائے رکھتے ہیں۔ دراصل یہ خالص نفسیاتی مسئلہ ہے۔ خدا کا تصور یا یوں کہیے کہ ایک بالاتر ہستی کا تصور انسان کی فطرت میں کچھ اس طرح رس بس گیا ہے کہ وہ کبھی اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ نفسیات اور مذہبیات کے علماء کا بیان ہے کہ تصور ذات اور تصور ہستی مطلق ([illegible]) دونوں ساتھ ساتھ پائے گئے ہیں۔ قدیم ترین تحریر جسے مذہبی اہمیت بھی حاصل ہے، رگوید ہے۔ اس کے تاریخی مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم آریہ یعنی رگوید کے عہد کے آریہ بھی کثرت میں وحدت ([illegible]) کا مشاہدہ کرتے تھے۔ رگوید کے دوسرے منڈل کے غالباً منتر ۴۶ میں اگنی، وایو، اندر وغیرہ دیوتاؤں کا ذکر کرنے کے بعد یہ الفاظ ملتے ہیں: ”صرف ایک ہستی ہے جسے قدیم شعرا نے مختلف ناموں سے پکارا ہے۔“

خدائے واحد کا ذکر آجانے سے فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ اسلام یا قرآن نے یہ تصور ان حیران لوگوں سے مستعار لیا جو خود بھی نہ جانتے تھے کہ خدا کون ہے اور کن صفات کا مالک ہے، ڈاکٹر ٹسڈل ایسے ہی فاضل کا کام ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چند اور اخلاقی اور بنیادی اصول بھی اس ”فرقہ حنیف“ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، مثلاً دختر کشی سے مخالفت۔ جنت میں عیش کا وعدہ، دوزخ سے انتباہ وغیرہ۔ یہ سب بالکل ابتدائی اور سادہ اصول اخلاق ہیں جن کی حیثیت قرآن شریف میں بھی جہاں تک اس کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کا تعلق ہے بالکل ابتدائی اور اصلاحی ہے۔ وحدت خالق، بت پرستی کی مذمت، اور چند وہ اخلاقی معائب جن میں باشندگان عرب اسوقت عام طور پر مبتلا تھے ان سب کی اہمیت علمی یا کشفی نہیں بلکہ انقلابی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تصورات فطری طور پر ایک غیر ملہم انسان کے ذہن میں بھی پیدا ہوں۔ لیکن ان خیالات کو لے کر ان سے ذہنیتوں میں انقلاب بپا کر نا یا انکو ایسے اچھوتے انداز میں پیش کرنا کہ پوری قوم انھیں قبول کر لے کوئی آسان کام نہیں اور نہ کسی معمولی غیر ملہم انسان کے بس کی بات ہے شرک اور بت پرستی اہل عرب کے رگ و پے میں کافی سرایت کر چکی تھی۔ دختر کشی، مے نوشی، قمار بازی، نسلی فخر و غرور، آپس کی سر پھٹول، زناکاری اور اسی نوع کی بے شمار برائیاں ان کی زندگی کا ایک اہم جزو ہو چکی تھیں۔ ممکن ہے ایک شخص اپنی طبیعت اور ذاتی تجربے سے یہ سمجھ لے کہ یہ تمام رسوم اس کی قوم کے لیے مضرت رساں ہیں، لیکن اس کی پوری قوم سے برائیاں منوا لینا اور انکی ذہنیتیں بدل کر ان کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دینا کم سے کم ایک غیر نبی کے بس کی چیز نہیں۔ اسلام نے عربوں میں یہ انقلاب پیدا کیا اور

قرآن نے ان کی ذہنیتوں کو بدلا اس لئے ہم کہتے ہیں کہ قرآن الہامی ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے رسول ہیں۔

یہ غلط ہے کہ "حنیفیت" عرب میں کوئی مشہور تحریک تھی جس کا عرب کے اطراف میں عام چرچا تھا جیساکہ ڈاکٹر ٹسڈل کے لفظ "فرقۂ حنیف" سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ بت پرستی اور دختر کشی کے علاوہ یہ اصحاب دوسرے ابتدائی اخلاقی مسائل کی بھی خدمت کرتے تھے۔ ابن ہشام اور دوسرے مورخین نے زید وغیرہ حنفاء کی بابت صرف اس قدر لکھا ہے کہ وہ بت پرستی کو پسند نہ کرتے تھے اور اس سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ جنت کی ترغیب اور دوزخ یا اس کے عذاب سے انتباہ اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ ان حضرات کے ذہن میں توحید کا بھی کوئی واضح اور غیر مبہم تصور نہ تھا۔ دوزخ، جنت، اور ان کے عذاب و ثواب کی تفصیلات کی ان سے توقع رکھنا میرے نزدیک انتہائی بھولا پن ہے۔

ایک معبود کا تصور اور بت پرستی سے نفرت ایک طرح کا نفسیاتی احساس ہے جس کا ثبوت حضرت رسالت کی بالکل ابتدائی زندگی سے بھی ملتا ہے۔ بعثت سے پہلے آپ غار حرا میں مسلسل ایک ماہ تک عبادت فرمایا کرتے تھے اور حیات و کائنات کے مسائل پر غور کیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے وحی آپ پر یہیں نازل ہوئی۔ قرآن شریف میں اس زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

ووجدک ضالاً فہدیٰ — (خدا نے آپ کو حیران پایا پس آپ کو راستہ دکھایا)

وہ ہدایت یا رہنمائی کیا ہے؟ اس کا بیان ہے:

اوحینا الیک روحاً من امرنا ماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان	ہم نے وحی کے ذریعہ تم پر اپنی طرف سے ایک حیات نازل فرمائی تمھیں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا چیز ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں۔

دراصل اولین ہیجان جس کے زیر اثر حضرت رسالت کے قلب میں بت پرستی کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوئے ایک قسم کی نفسیاتی اور فطری تحریک تھی۔ اس میں بہت زیادہ ابہام تھا۔ آپ یہ تو محسوس فرماتے تھے کہ حق کوئی چیز ہے لیکن وہ کیا ہے اور کس رنگ کا ہے یہ آپ کو معلوم نہ تھا۔ الہام نے اس ابہام اور تاریکی کو رفع فرمایا۔ آپ نے الہام کی روشنی میں حق کے تمام دھندلے خطوط صاف اور واضح طور پر دیکھے۔ یہ بات دراصل الہام کی خصوصیت ہے جو زید بن عمرو اور ان کے ہم خیال رفقاء کے تاریک تصورات میں نایاب تھی۔ حقیقت کے دھندلے نقوش دراصل اسلامی تعلیمات کے کوئی بنیادی اصول نہیں جو انھیں حقیقت سے مستعار کہا جائے۔ یہ نقوش تو آنحضرت کے آئینۂ ذہن میں بھی تھے اور اس وقت تھے جب آپ کو منصب نبوت پر سرفراز نہیں فرمایا گیا تھا، لیکن پھر بھی قرآن حکیم میں ان نقوش کو حیرانی اور عدم علم سے تعبیر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ درجہ رسالت و نبوت سے نہایت ہی کمتر اور پست تر چیز ہے۔

پہلے باب میں ڈاکٹر ٹسڈل نے مناسک حج اور طلاق و نکاح وغیرہ بعض مسائل کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ قدیم

عرب جاہلیت میں بھی تھے۔ اس سلسلے میں یہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ قرآن نے اسلام کی بابت واضح الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا ہے کہ وہ کوئی نیا اور انوکھا مذہب نہیں جس میں تمام تر نیا قانون، نئی شریعت، اور نئے اصول اخلاق پیش کئے گئے ہیں۔ بلکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کا قدیم مذہب ہے جو اس سے پہلے عرب میں رائج تھا اور اہل عرب اس پر عامل تھے۔ زمانہ کے امتداد نے اس قدیم الٰہی مذہب کی شکل وصورت کچھ اتنی بدل دی اور اس کے صحیح اصولوں میں جھوٹ اور کذب اس درجہ رلا ملا دیا کہ وہ کچھ کا کچھ ہوگیا، خصوصیت کے ساتھ خدائے واحد اور اس کے صفات میں بہت کچھ ردوبدل ہوا۔ اس لئے قدیم مذہب کی تجدید اور اس کے احیاء کے لئے حضرت رسالت کو مبعوث فرمایا گیا۔ قرآن میں ہے:

"ملتہ ابیکم ابراہیم، ہو سماکم المسلمین" (اسلام کوئی نیا مذہب نہیں بلکہ تمہارے جد امجد حضرت ابراہیم کا مذہب ہے۔ اور انھوں نے ہی تمہارا نام مسلم تجویز کیا تھا)

اہل عرب کی قدیم روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام مکہ تشریف لائے اور وہاں انھوں نے خانہ کعبہ تعمیر کیا۔ وہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کی عظمت کرتے تھے اور اس بات کے مدعی تھے کہ وہ دین ابراہیم کے پیرو ہیں۔ قرین قیاس ہے کہ دین ابراہیم لاکھ ادل بدل جائے لیکن ضرور کچھ احکام وعبادات کی شکلیں ادنیٰ تغیر کے بعد وہی ہونگی جو ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں تھیں۔ اسلام نے ان احکام مناسک، عبادات اور معاملات میں معمولی سا تغیر کیا اور باقی جوں کا توں باقی رکھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ مجدد دین ابراہیم ہونے کی حیثیت سے حضرت رسالت کا فرض بس یہ تھا کہ وہ مسخ شدہ دین کی جو اس وقت عرب میں رائج تھا، اصلاح فرمائیں اور اُسے اس کی اصل شکل وصورت میں لے آئیں۔ تفصیل کا موقع نہیں ورنہ اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں جن میں قدیم عرب جاہلیت کے رسوم اور معاملات نقل کرنے کے بعد اسلام کی اصلاحات دکھائی گئی ہیں۔ مشہور مورخ علامہ خضر حسین بک کی کتاب "تاریخ فقہ اسلامی" اسی نوعیت کی ہے۔ اس میں تفصیل کے ساتھ قرآنی اصلاحات کا ذکر کیا گیا ہے اور مقابلہ کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اسلام نے ان میں کیا کچھ ترمیاں کیں اور ان تبدیلیوں کے بعد ان احکام کی حیثیت اب کیا ہے۔

مثلاً طلاق ونکاح کو لیجئے۔ بے شبہ یہ دونوں حکم قدیم ہیں لیکن قدیم نکاح وہ نہیں جو اسلام میں ہے۔ اسلام نے اس میں بہت کچھ اصلاحیں فرمائیں۔ اولاً عرب میں کئی قسم کے نکاح رائج تھے۔ ان نکاحوں کی بیشتر صورتیں اخلاقی اور معاشری نقطۂ نگاہ سے پسندیدہ نہ تھیں۔ اسلام نے ان سب کو ممنوع قرار دیا۔ نکاح کے لئے گواہ بھی جاہلیت میں ضروری نہ تھے۔ زرمہر کی نوعیت بھی وہ نہ تھی جو اسلام میں ہے۔ متعدد عورتوں سے بیک وقت نکاح کیا جاسکتا تھا جن کی کوئی تعداد مقرر نہ تھی۔ دو بہنیں ایک ساتھ عقد نکاح میں لائی جاسکتی تھیں۔ محارم کی بابت بھی کوئی قطعی اور ٹکا بندھا اصول نہ تھا۔ طلاق جب چاہیں دی جاسکتی تھی اور جتنی مرتبہ چاہیں، طلاق دیکر رجوع کیا جاسکتا تھا۔ خلع کا بھی کوئی وجود نہ تھا[1]۔ کہاں تک تفصیل بیان کی جائے، حقیقت یہ ہے کہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "دول العرب" مصنفہ طلب حرب

اسلامی طلاق ونکاح اور قدیم عربوں کے طلاق ونکاح میں اگر کوئی مشابہت ہے تو وہ صرف لفظی اور اسمی ہے ورنہ یہ دونوں اُصول ایک دوسرے سے بہت سی اہم اور ضروری تفصیلات میں مختلف ہیں۔ میں نے مثال کے طور پر طلاق ونکاح کا ذکر کیا ہے ورنہ میرا خیال ہے کہ جو احکام ومناسک قدیم عرب جاہلیت میں رائج تھے اور اسلام نے انھیں قایم رکھا وہ سب بلا امتیاز اسی نوعیت کے ہیں۔ ان میں بہت سی ضروری اصلاحات کی گئی ہیں تب کہیں انھیں برقرار رکھا گیا ہے اور ان اصلاحات نے بدل کر انھیں کچھ اور ہی چیز بنا دیا ہے۔

ان چند اُصولوں کی حیثیت بھی ایسی ہی ہے جو اسلام میں 'اُصولِ فطرت' کے نام سے موسوم ہیں۔ حدیث میں ہے:

"عشر من الفطرۃ" یعنی دس چیزیں فطری طہارت میں داخل ہیں۔ اور ان کی تشریح میں فرمایا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کے زمانہ سے لیکر حضرت کے زمانہ کے تمام انبیاء ان اُصول کی پابندی پر زور دیتے رہے ہیں۔ ناخون ترشوانا، ختنہ کرانا، بغلوں کے بال صاف کرانا یہ سب انھیں اُصولِ عشرہ میں شامل ہیں اور عرب کے باشندے اگر ان کے پابند تھے تو وہ بھی اسی وجہ سے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے مذہب پر عامل تھے، خواہ اس کی حیثیت صحیح اور اصل دین کی نہ ہو لیکن بہرحال وہ ابراہیمی دین کا ڈھانچا تھا اور ضرور تھا کہ اس کی کچھ بقایا اس میں جوں کی توں باقی رہیں۔

غلامی کی بابت ڈاکٹر ٹسڈل نے بہت عجیب بات کہی ہے کہ یہ آنحضرت نے قدیم عربوں سے مستعار لی۔ اسلام نے کم سے کم غلامی کی رسم کو جائز قرار نہیں دیا بلکہ قدیم غلاموں کو آزادی دلانے کے لئے اس نے نئی نئی تجویزیں پیش فرمائیں۔ کفارات میں غلام کی آزادی کو مقدم رکھا گیا۔ عام اعمال خیر میں غلام کی آزادی کو بھی شمار کرایا گیا ہے۔

"وما ادراک ما العقبۃ، فک رقبۃ" (تم کیا جانو عقبہ کیا ہے؟ وہ غلام آزاد کرنا ہے۔)

اس کے علاوہ قرآن شریف کی ایک آیت بھی پیش نہیں کی جا سکتی جس سے رسم غلامی کا جواز یا کم سے کم اس کا بقا ثابت کیا جا سکے۔ جنگ میں جو لوگ گرفتار کئے جاتے ہیں در اصل وہی غلام بنائے جا سکتے ہیں لیکن ان کی بابت قرآن کا صاف فرمان ہے:

"فاما منّاً بعد او فداءً" (اس کے بعد جنگ کے اسیروں کو عوض لیکر چھوڑ دیا جائے یا یوں ہی رہا کر دیا جائے)

ماخذ القرآن کی دوسری اور تیسری فصلیں گو اہم ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان کے تفصیلی جواب کی ضرورت ہے ان فصلوں میں انبیاء علیہم السلام کے متعلق جو اسرائیلی قصص اور افسانے قرآن شریف میں بیان ہوئے ہیں ڈاکٹر صاحب نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے مختلف ماخذ بتائے ہیں۔ قرآن شریف کوئی تاریخی کتاب نہیں اور نہ اس کے نزدیک ان اسرائیلی قصوں کی کوئی تاریخی اہمیت ہی ہے۔ قرآن شریف نے یہ قصے اخلاقی اسباق سکھانے کے لئے بیان فرمائے ہیں اور ان قصوں کے صرف ان حصوں کا ذکر فرمایا ہے جن سے کوئی اخلاقی سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔

"لقد کان فی قصصہم عبرۃ لاولی الالباب، ما کان حدیثاً یفتریٰ ولٰکن تصدیق الذی بین یدیہ"

(ان انبیاء کے واقعات میں صاحبان خرد کے لئے سامان عبرت ہے۔ یہ گھڑے ہوئے قصے نہیں بلکہ سابقہ کتب میں مذکور ہیں)

یہی وجہ ہے کہ یہ قصے مختلف سورتوں میں دہرائے گئے ہیں اور کہیں کہیں ان کی تاریخی ترتیب بھی ان کے بعض حصوں کی اہمیت کے پیش نظر بدل دی گئی ہے۔ بعض تفصیلات جو غیر ضروری سمجھی گئی ہیں وہ بالکل چھوڑ دی گئی ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

"قرآن شریف کا اسلوب جس کے ماتحت افسانوں اور قصص کو کلاً یا جزواً بدل لیا جاتا ہے تاکہ جدید خیالات کی روح ان میں پیدا کر دی جائے اور اس طرح وقت کی روز افزوں ترقی کرنے والی اسپرٹ سے تطابق بھی پیدا ہو جائے ایک ایسا اہم نکتہ ہے جس کو تقریباً تمام مسلم و غیر مسلم طالبان اسلام نے نظر انداز کر دیا ہے۔ قرآن کی غرض و غایت ان قصص کے بیان کرنے سے بہت کم تاریخی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ انھیں ایک ہمہ گیر اخلاقی یا حکمیاتی رنگ دے۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لئے وہ اکثر اشخاص اور مقامات کے نام حذف کر دیتا ہے جو افسانہ کے مفہوم کو محدود کرتے ہیں اور اس کو ایک مقامی تاریخی رنگ دیتے ہیں۔ اور ان تفصیلات کو ترک کر دیتا ہے جو جذبات کے کسی اور ہی عالم سے متعلق نظر آتے ہیں۔ قصص بیان کرنے کا یہ اسلوب کوئی نادر اور شاذ چیز نہیں ہے۔ یہ غیر مذہبی ادبیات میں بہت عام ہے۔ فاؤسٹ کا افسانہ اس کی ایک مثال ہے جس کو گوئٹے کے موقلم نے تمامتر ایک نیا مفہوم بخشا ہے۔"[1]

علامہ اقبال نے "سقوط آدم" کو لیکر اس فرق کو واضح بھی کیا ہے جو قرآن اور بائبل کے بیان کردہ روایات میں ہے یہ روایت تقریبی طور پر قدیم دنیا کے تمام ادبیات میں پائی جاتی ہے۔ ایک قدیم بابلستانی کتبہ میں سانپ اور درخت دکھایا گیا ہے اور عورت مرد کو سیب پیش کر رہی ہے۔ سانپ سے جنسی رغبت کی طرف اشارہ ہے اور سیب ایک مرموز شے جس سے بکارت مراد لی گئی ہے۔ بائبل میں بھی سانپ کا ذکر آتا ہے لیکن قرآن شریف نے سانپ اور سیب دونوں کو حذف فرما دیا ہے۔

خاص انبیاء بنی اسرائیل کے متعلق یہود اور نصاریٰ کی روایات میں کچھ کانٹ چھانٹ بھی کی گئی ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس مقام پر جہاں جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کی تحقیر یا توہین کا کوئی پہلو پیدا ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام یوسف علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام ایسے انبیاء کے متعلق بائبل میں جو روایات ملتی ہیں وہ کچھ ان انبیاء کی جلالت شان کے منافی۔ مثلاً ہارون کی بابت بائبل میں ہے کہ انھوں نے گوسالہ بنایا۔ قرآن شریف نے ان انبیاء کی براءت فرمائی حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ حضرت مریم علیہم السلام کی بابت یہود کی تحریروں میں نہایت ہی اخلاق سوز روایات موجود ہیں۔ قرآن ہی وہ کتاب ہے جس نے ان بے سرو پا بیانات کو جھٹلایا اور ان بزرگوں کے دامن کو ان ناپاک الزامات سے پاک کیا۔ اس لئے ان قصص سے متعلق دو باتیں ملحوظ رہنا چاہئیں۔ اول یہ کہ اگر یہ قصے ان کے اصل ماخذ کے مطابق ہیں تو قرآن کی صداقت اور اس کی سچائی پر ان سے کوئی حرف نہیں آتا اور اگر بعض تفصیلات میں یہ ان سے مختلف ہیں تو اس اختلاف کی وجہ یقیناً یہ نہیں کہ انہیں غلط سمجھا گیا ہے بلکہ

[1] ملاحظہ فرمائیے "اسلامی الٰہیات کی تعمیر نو" ص

اصل وجہ یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ نے ان میں کتر بیونت کی تھی اور قرآن شریف نے ان کی اصلاح فرمائی۔ مثلاً بائبل میں ہے کہ خدا نے آسمان اور زمین کو چھ روز میں بنایا اور ساتویں روز اس نے آرام فرمایا۔ قرآن شریف نے اس میں یہ اصلاح فرمائی:

ولقد خلقنا السمٰوات والارض فی ستۃ ایام	بے شبہ ہم نے زمین و آسمان کو چھ روز میں بنایا۔ لیکن یہ
وما مسنا من لغوب	غلط ہے کہ ہم نے آرام کیا اس لئے کہ ہم تھکے ہی نہ تھے

علمائے اسلام نے جو قرآن شریف کی تفسیریں تحریر فرمائی ہیں ان میں ان تمام اسرائیلی قصص و حکایات کی تفصیلات رہی ہیں اور بائبل وغیرہ قدیم تحریروں سے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے جہاں کوئی اختلاف پایا ہے وہاں اس اختلاف کے وجوہ اور اسباب بھی تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائے ہیں۔ ان تمام قصص کی تفصیلات زحمت سے خالی نہیں اس لئے ان کو چھوڑ کر میں ایک نہایت ہی ضروری بحث کی طرف قارئین کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر ٹسڈل کے جن اعتراضات کو علمی طور پر کوئی اہمیت حاصل ہے وہ خاص اسلامی احکام، تعلیمات اور بعض اُمورِ آخرت سے متعلق تفصیلات کا زردشتی نوشتوں سے مستفاد ہونا ہے۔ دوزخ، جنت، ملائکہ، حور و غلمان اور معراج نبوی کے متعلق ڈاکٹر موصوف نے بتایا ہے کہ یہ تمام تصورات اور ان کے متعلق بیشتر تفصیلات زردشتی صحیفوں میں پائی جاتی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو آخر اس قدر قریبی مشابہت اور مماثلت کے اسباب کیا ہیں؟

دراصل اس قسم کی مماثلت سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن شریف نے یا حضرت رسالت نے ان تفصیلات کو اُن سرچشموں سے لیا جن کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے۔ جب تک کم سے کم تاریخی طور پر معتبر اور مستند شہادتوں سے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ وہ کتابیں درحقیقت حضرت کے زمانہ میں موجود تھیں اور آپ آسانی کے ساتھ ان سے استفادہ فرما سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نوع کی مماثلت ایک طرح کی نفسیاتی بحث ہے اور نفسیات ہی سے اس کا تعلق ہے۔ جو اہلِ علم یہیں کسی قسم کی مماثلت دیکھ کر تاریخی نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے مستعار یا مستفاد ہیں وہ ایک بہت بڑی علمی لغزش کے مرتکب ہوتے ہیں۔ دراصل یہ مسئلہ تاریخی نہیں بلکہ نفسیاتی ہے اور جب تک نفسیاتی اُصول اور قواعد کو سامنے رکھ کر اس کا حل نہ کیا جائے گا یقین ہے کہ اس وقت تک اس سلسلہ میں ایسی ہی بدحواسانہ لغزشیں ہوتی رہیں گی۔ قوائے ذہنیہ کی ساخت ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ بالکل یکساں طور پر کام کرتے ہیں اور نتیجہ تک پہونچنے کے لئے عام انسان ایک ہی طرح مقدمات ترتیب دیا کرتے ہیں۔ ریاضیات کے نتائج اس کا واضح ثبوت ہیں۔ عام مابعد الطبیعیاتی مسائل میں جو اختلاف نظر آتا ہے [illegible] کی وجہ کچھ اور ہے۔ یقین کیا جاتا ہے کہ اگر انسان کا ماحول مختلف [illegible] تو شاید ان مسائل میں بھی یہ اختلاف اگر کم سے کم اتنا اہم اختلاف ہرگز نہ ہوتا۔ فلسفہ، منطق اور لسانیات کے عمیق مطالعہ سے یہ عجیب [illegible] انکشاف ہوا ہے کہ قدیم انسان مختلف گردو پیش میں رہتے ہوئے بھی ایک ہی جیسی لائنوں پر سوچ بچار کیا [illegible] گرامر کے اصول اور عام ترتیب [illegible] ثابت ہے وہ اس سلسلے میں بہت کچھ اہمیت کی حامل ہے۔ انکا اُصول لسانیات کی [illegible] لسانیات نے [illegible]

اور قاعدے بھی ابھی درجۂ کمال کو نہیں پہونچے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جس روز یہ فن درجۂ کمال کو پہونچ جائے گا اس روز کم سے کم نفسیات میں ایک بہت بڑے انقلاب کے رونما ہونے کا امکان ہے۔

مثلاً یونانی منطق اور ہندی نیائے کو لیجئے۔ دونوں کے تقابلی مطالعے سے ان میں اس درجہ مشابہت پائی جاتی ہے کہ کبھی یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ یہ نظام جدا جدا ترقی کے منازل طے کرتے رہے ہیں اور ان میں سے کسی ایک نے بھی دوسرے سے استفادہ نہیں کیا۔ پروفیسر میکس مولر کا بیان ہے کہ گورس اور دوسرے فضلاء کے نزدیک یونانی منطق نے ہندؤں کی منطق سے بہت کچھ اخذ کیا۔ اور ان مشابہات و مماثلات کی بنا پر جو ان دونوں نظامہائے منطق میں واضحاً پائی جاتی ہیں ان علماً نے یہ بے بنیاد تاریخی استنباط بھی کیا ہے کہ سکندر اعظم نے ہندوستان سے کچھ منطق کی کتابیں ارسطو کے پاس بھجوائیں اور ارسطو نے ان کی مدد سے یونانی منطق کے ضروری اُصول اور مبادی ترتیب دئے۔ گورس نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ارسطو ہندوستانی فلاسفہ کی طرح پانچ عناصر کا قائل تھا اور پانچویں عنصر کا نام اس نے آکاش تجویز کیا تھا[1]۔ مشہور جرمن مستشرق نیوبہر نے قدیم تاریخ پر جو لکچر دئے ہیں ان میں یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ ہندوستانی فلسفہ یونان سے ماخوذ ہے۔ پروفیسر میکس مولر کی منصفانہ رائے ہے:

"جب ہم کسی طرح کی اتفاقی مماثلت پائیں تو ہمیں اس سے یہ اخذ نہ کرنا چاہئے کہ یہ مماثلت اس وجہ سے ہے کہ تاریخی طور پر ان میں کسی قسم کا ارتباط رہا ہے اور ان میں سے کسی ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا ہے۔"

اس کے بعد پروفیسر موصوف نے ہندی اور یونانی فلسفہ کی اصطلاحات اور اُصول میں مماثلت دکھاتے ہوئے فرمایا ہے: "اگر فطری طور پر منطقی اصطلاحیں اور اُصول یونان میں پیدا ہوسکتے ہیں تو ہندوستان میں کیوں نہیں ہوسکتے۔ بہرحال ہمیں انتظار کرنا چاہئے اور ریسرچ کی ترقی کو قبل از وقت بیانات سے روکنا نہ چاہئے۔"

تقابلی مطالعہ ابھی ابتدائی منازل میں ہے۔ ورنہ ترقی کی رفتار بتا رہی ہے کہ اگر اس میدان کو وسیع تر کر دیا گیا تو شاید انسانی نظر و فکر کا کوئی شعبہ بھی مماثلت کی حیرت انگیز مثالیں پیش کرنے میں پیچھے نہ رہے۔ مہابھارت میں ہے: "خدا نے اولاً اشیاء کے نام اور ان کی شکلیں خلق فرمائیں۔" قرآن شریف میں ہے: "وعلم آدم الاسماء کلہا" خدا نے اول آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھائے۔ یونانیوں کا خیال ہے کہ خدا نے (Logos) یعنی کلمہ سے عالم کو خلق فرمایا۔ علماء کہتے ہیں کہ براہمن جس مادہ سے (یعنی برہی) مشتق ہے اس کے معنی ہیں لفظ یا کلمہ۔ چنانچہ مہابھارت میں تصریح ہے کہ کا ارتقاء ازلی کلمہ سے ہوا[2]۔ ادھر قرآن شریف میں ہے: "واذا اراد شیئاً فانما یقول لہٗ کُن فیکون"۔ یعنی خدا جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو کلمۂ کُن (ہوجا) سے پیدا کر دیتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ فرمائیے "ہندی فلسفہ کے نظامہائے ششگانہ" پروفیسر میکس مولر ص ۳۸۶ ۔ [2] ملاحظہ فرمائیے مہابھارت پرو ۱۲ شلوک ۸۵۳۵

خلقِ عالم سے متعلق ایک اور مشابہت پر غور فرمایئے۔ "تیتری براہمن" میں ہے (ادھیائے ۲ تتر ۲) "اُس نے کہا یہ یہ زمین ہے اور زمین کو پیدا کر دیا" بائبل میں ہے "خدا نے فرمایا روشنی ہونا چاہیئے اور روشنی ہوگئی"۔ میں نے یہ چند مثالیں اس غرض سے پیش کی ہیں کہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ ان میں نہایت ہی قریبی مشابہت موجود ہے لیکن پھر بھی یقین کیا جاتا ہے کہ یہ مشابہت کسی تاریخی اخذ و استفادہ کی رہین منت نہیں۔ بلکہ ایک طرح کی نفسیاتی شہادت ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان ایک ہی طرح اور ایک ہی جیسے خطوط پر فکر کرتا رہا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ امر کوئی باعث حیرت نہیں اس لئے کہ اسلام نے بتایا ہے کہ انبیاء ہر ملک اور بستی میں پیدا ہوئے ہیں اور انھوں نے خدا سے صحیح اور سچا علم پا کر حق و عرفان کی تبلیغ فرمائی ہے:

(۱) یمحو اللہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب	خدا جو چاہتا ہے قایم رکھتا ہے اور جو چاہتا ہے محو فرماتا ہے اس کے پاس اصل کتاب ہے۔
(۲) انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح والنبیین من بعدہ	ہم نے آپ کو اسی طرح تلقین فرمائی جس طرح نوح اور انکے بعد آنے والے انبیاء کو۔
(۳) ان من امۃ الا خلافیہا نذیر۔	کوئی قوم ایسی نہیں جہاں خدا کا نذیر نہ بھیجا گیا ہو۔
(۴) لکل امۃ رسول	ہر قوم کے لئے ایک رسول بھیجا گیا۔

اگر ہدایت کے سرچشمے واحد ہیں تو یقیناً تعلیمات و ہدایات میں بھی ایک طرح کی مماثلت و مشابہت پائی جانی چاہئے یہی باعث ہے کہ قرآن شریف کی بابت ارشاد ہے:

مصدقا لما معکم	اے اہل کتاب قرآن شریف تمھاری کتابوں کی تصدیق فرماتا ہے۔
ان ہذا لفی الصحف الاولیٰ	یہ سب کچھ قدیم صحیفوں میں بھی ہے۔
صحف ابراہیم و موسیٰ	ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کے صحیفوں میں۔

اسلام کی حیثیت ایک جامع اور عالمگیر (Cosmopolitan) دین کی سی ہے۔ ضروری ہے کہ اس میں قدیم ترین انبیاء اور رسولوں کی صحیح تعلیمات کا نچوڑ اور ان کی روح بھی شامل ہو، شاید اسی لئے قرآن شریف میں انبیاء سابقین کی تصدیق کی گئی ہے۔ اور ان کے نوشتوں کی صحیح اور غیر محرف تعلیم کو اسلامی تحریک کا ایک جزو غیر اہم بتایا گیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرتِ رسالت نے خود ان قدیم کتابوں کو پڑھا اور ان کی تعلیمات سے استفادہ فرمایا۔ یہ کئی وجہ سے قرین قیاس نہیں۔

اول خود قرآن نے بلند آہنگی کے ساتھ اس کا رد فرمایا ہے:

ما کنت تتلو من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون۔	اس سے پہلے نہ آپ لکھنا جانتے تھے اور نہ پڑھنا۔ اگر ایسا نہ تو باطل پرست ضرور شبہ کرتے۔

یہ اندرونی شہادت ہے اس امر کی کہ آپ کی بابت دوست اور دشمن سب کا خیال تھا کہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ اور کم سے کم آپ کے مخالف اس باب میں اس وقت کوئی شبہ بھی نہ کرتے تھے۔ اگر ذرا بھی اخذ و استفادہ کا امکان ہوتا تو بہت کچھ شبہ کیا جا سکتا تھا۔ اور بتایا جا سکتا تھا کہ فلاں کتاب یا فلاں اصل سے استفادہ کیا گیا ہے۔

قرآن شریف میں ایک سے زیادہ مقامات پر خاص انبیا علیہم السلام کی گزشتہ روایات و قصص بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

ماکنت بجانب الغربی اذ قضینا الیٰ موسیٰ الامر	جب ہم نے موسیٰ کو مامور فرمایا تو آپ اسوقت مغربی گوشے میں موجود نہ تھے۔

ایک مقام پر ہے:

ماکنت لدیہم اذ یلقون اقلامہم ایہم یکفل مریم وماکنت لدیہم اذ یختصمون۔	جب وہ لوگ مریم کی کفالت کے سلسلے میں قرعہ اندازی کر رہے تھے اور آپس میں جھگڑ رہے تھے تو آپ وہاں موجود نہ تھے۔

یہ بھی ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ اگر کسی چیز کے امکانات ہوں اور شبہ کے کافی وجوہ بھی ہوں تو کبھی غیر متعلق سی بات کہکر کوئی ہوشمند اس کی تردید نہیں کرتا۔ اگر یہ ممکن تھا کہ حضرت رسالت مختلف کتابوں کے پڑھنے والوں سے کچھ سیکھ سکتے تو دلائل آیات قرآن میں اس وضاحت کے ساتھ اس کا رد نہ فرمایا جاتا اور اگر ڈنکے کی چوٹ رد کیا گیا تھا تو شبہ کرنے والوں کی طرف سے کہا جا سکتا تھا کہ "بے شک آپ اس وقت موجود نہ تھے لیکن اب وہ تمام روایات کتابوں میں موجود ہیں جنھیں آپ پڑھ سکتے ہیں یا فلاں فلاں اصحاب جانتے ہیں آپ ان سے دریافت کر سکتے ہیں یا جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے یہ روایات تو تمام عرب میں مشہور ہیں ان کے جاننے اور بیان کرنے کے لئے اس وقت یا اس مقام پر موجود ہونا ضروری نہیں"۔

شوکت سبزواری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

(نگار) جیسا کہ فاضل مقالہ نگار نے خود ظاہر کیا ہے، یہ مقالہ "ماخذ القرآن" کا تفصیلی جواب تو نہیں، لیکن ایک ایسا تبصرہ ضرور ہے جس کی بنیاد پر موافقت میں بھی کچھ لکھا جا سکتا ہے، لیکن شاید مخالفت سے کم۔

ہمارے فاضل دوست نے یہ بالکل صحیح فرمایا کہ اس سلسلہ میں بحث کے نفسیاتی پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، لیکن کسی کتاب کو صحیفۂ آسمانی اور الہام ربانی تسلیم کرنے کے بعد معتقدات و روایات پر انسان کے نفسیاتی پہلو کو سامنے رکھکر غور کرنا اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے جب تمام ان مسائل میں جو حقائق اور مسلمات عقلی کے خلاف نظر آتے ہیں تاویل کرنے کی بھی اجازت ہو۔ لیکن چونکہ عام طور پر ہمارے علماء کرام اس کو جائز نہیں سمجھتے، اس لئے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بحث میں "نفسیاتی پہلو" کی اہمیت کس حد تک قابل استناد ہو سکتی ہے۔ چونکہ میں اس باب میں اپنی رائے اسوقت تک بالکل محفوظ رکھنا چاہتا ہوں، جب تک تمام اجزاء شایع نہ ہو جائیں، اس لئے فی الحال اس مقالہ پر زیادہ تفصیل کے ساتھ رائے زنی کا موقع نہیں۔

زمانۂ حال کی ہندی شاعری

(اڈیٹر نگار کی لاسلکی تقریر)

... ہمارے سماج میں بھی بہت کچھ تبدیلیاں ہوئیں اور خواب
میں کی دنیا کو چھوڑ کر ہم نے دنیا کو دنیا کی طرح دیکھنا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ادب پر بھی اس کا بڑا اثر پڑا۔ یعنی اگر اس سے قبل ہم اپنے آپ کو قسمت اور خدا کے بھروسے پر چھوڑ کر ... حالات کے متعلق کچھ شکوے شکایتیں کر لیا کرتے تھے تو اب ہم ان کی زندگی کے حقیقی مسایل کی حیثیت سے دیکھنے لگے ہیں۔

سن ۲۰ء اور سن ۲۱ء کا زمانہ اس انقلاب کا بڑا اہم زمانہ ہے، کیونکہ ملک نے سب سے پہلے اسی وقت اپنی مجبوریوں کو ... انقلابی خیالات وجذبات جگہ پانے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ اس احساس میں (Reaction) ...

... کے ان ... کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس قسم کی شاعری کے نمایندوں میں گپت، ماکھن لال چتربیدی، سوبھدرا کماری چوہان اور بالکرشن شرما خاص حیثیت کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔

گپت کی تصنیف بھارت بھارتی ہندی شاعری میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو اردو ادب میں مسدس حالی کو حاصل ہے یہی حال چتربیدی، سوبھدرا کماری اور بالکرشن شرما نوین کی بعض نظموں کا ہے۔ چتربیدی کی ایک نظم نے جس میں ایک قیدی کویل سے خطاب کرتی ہے، کافی شہرت حاصل کی، کیونکہ وہ بہت ہی صاف وسلیس زبان میں ہے، لیکن مفہوم وجذبات دونوں حیثیتوں سے اس کی نظم "پھول کی تمنا" زیادہ بلند چیز ہے۔ اس نظم میں پھول ہی کی زبان سے ظاہر کیا گیا ہے:

> "میں نہ کسی خوبصورت عورت کے زیور میں گوندھا جانا پسند کرتا ہوں، نہ کسی بادشاہ کی تابوت پر چڑھایا جانا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ مالی مجھے اٹھا کر زمین پر پھینک دے اور اس طرح میں یہ محسوس کروں کہ مجھے مادر وطن پر چڑھا دیا گیا۔"

کتنی دلکش تعبیر ہے اور جذبات کے لحاظ سے کتنی گہری!

اسی طرح سوبھدرا کماری چوہان کی نظم جھانسی کی رانی بھی اس زمانہ کی مقبول نظموں میں ہے، لیکن بالکرشن شرما نوین کی

وہ نظم جس میں اس نے شاعر سے خطاب کیا ہے، غالباً زیادہ بلند چیز ہے - وہ کہتا ہے :

" اے شاعر، کوئی ایسا گیت سُنا، جو چاروں طرف ہلچل ڈالدے، ایک طوفان اس طرف سے آئے اور ایک اُس طرف سے - جان کے لالے پڑجائیں، فضا پر ہر جگہ دھواں چھا جائے، آسمان سے آگ برسنے لگے، تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں اور گناہ وثواب کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے "

اسی زمانہ میں بعض شعراء ہمیں ایسے بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے حالات زمانہ کا بہت کم اثر قبول کیا اور ان میں اول اول پنت، جے شنکر پرشاد اور سوریا کانت ترالا کے نام بہت نمایاں نظر آتے تھے لیکن کچھ دن بعد ایک خاتون مہا دیوی ورما نمودار ہوئیں اور انھوں نے اس طبقہ کے شعراء میں بڑی شہرت حاصل کی - اس جماعت کی شاعری بالکل ٹگور کا تتبع ہے اور چونکہ ٹگور کے رنگ کی کامیابی کا بالکل جذبات کی نرمی و لطافت پر منحصر ہے، اس لئے مہادیوی ورمانے جو ایک عورت ہونے کی حیثیت سے زیادہ نرم و لطیف جذبات رکھتی ہیں، اس رنگ میں بڑی کامیابی حاصل کی، مثلاً ان کی ایک نظم کا مفہوم ملاحظہ ہو :

" راستہ تکتے تکتے میں نے ساری رات گزار دی، مگر اپنے محبوب کو نہ دیکھا - تاریکی نے آسمان کے راستہ کو معطر رقیق پانی سے دھو دیا اور سونے آسمان میں چراغ جھلملانے لگے، مگر صبح ہوتے ہی نہ معلوم کون ان چراغوں کو بجھا گیا -
اے سکھی خواہ آسمان کہرے کی طرح مٹ جائے، خواہ سارا عالم بلبلے کی طرح فنا ہوجائے، لیکن میرے اس رنج و غم کی حکومت ہمیشہ ہمیشہ رہے گی، کیونکہ میں اپنے محبوب کی غیر فانی سہاگن ہوں "

[redacted] [illegible] کتے ہیں، ترالا بھی اسی اسکول کا شاعر ہے، لیکن اسکے یہاں [redacted] [illegible] ہے والا شاعر سمجھا جاتا تھا مگر اب چند سال سے وہ عوام کی زبان میں شاعری کرنے لگا ہے اور " الہ آباد کے پتھر پر " اس کی اس دور کی غالباً سب سے پہلی نظم ہے جسمیں اس نے انقلابی زبان میں شاعری کی ہے - اس کی اور نظمیں بھی اس رنگ کی ہیں، جن میں ہر چند تصنع زیادہ اور جذبات کم ہیں، تاہم انھیں دیکھ کر یہ ضرور محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شاعر حالات زمانہ سے بہت دیر میں اثر قبول کرنے کے بعد جلدی جلدی اس کمی کو پورا کرنا چاہتا ہے -

پرشاد جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، ہندو فلسفہ و تمدن کے شاعر ہیں اس لئے اب صرف پنت ہی ایک ایسے شاعر رہ جاتے ہیں جنھیں ہم ٹگوریت پسند اور ترقی پسند شعراء دونوں میں شامل کرسکتے ہیں - یوں تو پنت سے پہلے بھی مختلف شعراء ترقی پسندانہ نظمیں لکھا کرتے تھے، لیکن پنت آندھی کی طرح آیا اور ہندی کی ترقی پسند شاعری کو بہت کچھ دیگیا، چونکہ پنت ہندی شاعری میں ترقی پسند ادب کا بہت بڑا علمبردار ہے اس لئے اس کی شاعری کی چند مثالیں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا - اس کی ایک نظم " ماں " کے عنوان سے ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے :

جگ جیون کے تم میں　　　　دینیہ ابھاو تینوں میں

زمانۂ حال کی ہندی شاعری

(اڈیٹر نگار کی لاسلکی تقریر)

دُنیا کے انقلابات کے ساتھ ساتھ، ادھر ۲۰، ۲۵ سال کے اندر ہمارے سماج میں بھی بہت کچھ تبدیلیاں ہوئیں اور خوابِ خیال کی دُنیا کو چھوڑ کر ہم نے دُنیا کو دُنیا کی طرح دیکھنا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ادب پر بھی اس کا بڑا اثر پڑا۔ یعنی اگر اس سے قبل ہم اپنے آپ کو قسمت اور خدا کے بھروسے پر چھوڑے ہوئے اپنے سیاسی و اقتصادی حالات کے متعلق کچھ شکوے شکایتیں کر لیا کرتے تھے تو اب ہم ان کی زندگی کے حقیقی مسایل کی حیثیت سے دیکھنے لگے ہیں۔

سنہ ۲۰ء اور سنہ ۲۱ء کا زمانہ اس انقلاب کا بڑا اہم زمانہ ہے، کیونکہ ملک نے سب سے پہلے اسی وقت اپنی مجبوریوں کو محسوس کیا اور اسی وقت سے ہمارے ادب میں انقلابی خیالات و جذبات جگہ پانے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ اس احساس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے، لیکن چونکہ ہندوؤں کی غلامی کی عمر بہت زیادہ تھی اس لئے اس ردِّ عمل (Reaction) نے ان کے احساس میں زیادہ تلخی پیدا کر دی اور یہی وجہ ہے کہ ہندی ادب میں بہ نسبت اُردو ادب کے اس تلخی کے اثرات بہت کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس قسم کی شاعری کے نمایندوں میں گپتا، ماکھن لال چترویدی، سوبھدرا کماری چوہان اور بالکرشن شرما خاص حیثیت کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔

گپتا کی تصنیف بھارت بھارتی ہندی شاعری میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو اُردو ادب میں مسدس حالی کو حاصل ہے یہی حال چترویدی، سوبھدرا کماری اور بالکرشن شرما نوین کی بعض نظموں کا ہے۔ چترویدی کی ایک نظم نے جس میں ایک قیدی کویل سے خطاب کرتی ہے، کافی شہرت حاصل کی، کیونکہ وہ بہت ہی صاف و سلیس زبان میں ہے، لیکن مفہوم و جذبات دونوں حیثیتوں سے اس کی نظم "پھول کی تمنا" زیادہ بلند چیز ہے۔ اس نظم میں پھول ہی کی زبان سے ظاہر کیا گیا ہے:

"میں نہ کسی خوبصورت عورت کے زیور میں گوندھا جانا پسند کرتا ہوں، نہ کسی بادشاہ کی تابوت پر چڑھایا جانا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ مالی مجھے اُٹھا کر زمین پر پھینک دے اور اس طرح میں یہ محسوس کروں کہ مجھے ادروطن پر چڑھا دیا گیا۔"

کتنی دلکش تعبیر ہے اور جذبات کے لحاظ سے کتنی گہری!

اسی طرح سوبھدرا کماری چوہان کی نظم جھانسی کی رانی بھی اس زمانہ کی مقبول نظموں میں ہے لیکن بالکرشن شرما نوین کی

وہ نظم جس میں اس نے شاعر سے خطاب کیا ہے، غالباً زیادہ بلند چیز ہے۔ وہ کہتا ہے :

"اے شاعر، کوئی ایسا گیت سُنا، جو چاروں طرف ہلچل ڈال دے، ایک طوفان اس طرف سے آئے اور ایک اُس طرف سے۔ جان کے لالے پڑجائیں، فضا پر ہر جگہ دھواں چھاجائے، آسمان سے آگ برسنے لگے، تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں اور گناہ و ثواب کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے۔"

اسی زمانہ میں بعض شعراء ہمیں ایسے بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے حالات زمانہ کا بہت کم اثر قبول کیا اور ان میں اول اول پنت، جے شنکر پرشاد اور سوریا کانت نرالا کے نام بہت نمایاں نظر آتے تھے لیکن کچھ دن بعد ایک خاتون مہا دیوی برما نمودار ہوئیں اور انھوں نے اس طبقہ کے شعراء میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اس جماعت کی شاعری بالکل ٹگور کا تتبع ہے اور چونکہ ٹگور کے رنگ کی کامیابی کا بالکل جذبات کی نرمی و لطافت پر منحصر ہے، اس لئے مہا دیوی برما نے جو ایک عورت ہونے کی حیثیت سے زیادہ نرم و لطیف جذبات رکھتی ہیں، اس رنگ میں بڑی کامیابی حاصل کی، مثلاً ان کی ایک نظم کا مفہوم ملاحظہ ہو :

"راستہ تکتے تکتے میں نے ساری رات گزار دی، مگر اپنے محبوب کو نہ دیکھا۔ تاریکی نے آسمان کے راستہ کو معطر نیلے پانی سے دھو دیا اور سونے آسمان میں چراغ جھلملانے لگے، مگر صبح ہوتے ہی نہ معلوم کون ان چراغوں کو بجھا گیا۔ اے سکھی خواہ آسمان کہرے کی طرح مٹ جائے، خواہ سارا عالم بلبلے کی طرح فنا ہوجائے، لیکن میرے اس رنج و غم کی حکومت ہمیشہ ہمیشہ رہے گی، کیونکہ میں اپنے محبوب کی غیر فانی سہاگن ہوں۔"

آپ نے دیکھا کہ اس کا انداز بیان ٹگور کی گیتانجلی سے کتنا ملتا جلتا ہے۔ نرالا بھی اسی اسکول کا شاعر ہے لیکن اسکے یہاں ہم کو بعض نظمیں جدید رنگ کی بھی ملتی ہیں۔ پہلے وہ زبان و خیالات کے لحاظ سے بہت مشکل کہنے والا شاعر سمجھا جاتا تھا مگر اب چند سال سے وہ عوام کی زبان میں شاعری کرنے لگا ہے اور "الہ آباد کے پتھر پر" اس کی اس دور کی غالباً سب سے پہلی نظم ہے جسمیں اس نے انقلابی زبان میں شاعری کی ہے۔ اس کی اور نظمیں بھی اس رنگ کی ہیں، جن میں ہرچند تصنع زیادہ اور جذبات کم ہیں، تاہم انھیں دیکھ کر یہ ضرور محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شاعر حالات زمانہ سے بہت دیر میں اثر قبول کرنے کے بعد جلدی جلدی اس کمی کو پورا کرنا چاہتا ہے۔

پرشاد جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، ہندو فلسفہ و تمدن کے شاعر ہیں اس لئے اب صرف پنت ہی ایک ایسے شاعر رہجاتے ہیں جنھیں ہم ٹگوریت پسند اور ترقی پسند شعراء دونوں میں شامل کرسکتے ہیں۔ یوں تو پنت سے پہلے بھی مختلف شعراء ترقی پسندانہ نظمیں لکھا کرتے تھے، لیکن پنت آندھی کی طرح آیا اور ہندی کی ترقی پسند شاعری کو بہت کچھ دے گیا، چونکہ پنت ہندی شاعری میں ترقی پسند دور کا بہت بڑا علمبردار ہے اس لئے اس کی شاعری کی چند مثالیں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ اس کی ایک نظم "ماں" کے عنوان سے ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے :

جگ جیون کے تم میں دینیہ ابھاد تینیں میں

زمانۂ حال کی ہندی شاعری

(اڈیٹر نگار کی لاسلکی تقریر)

دُنیا کے انقلابات کے ساتھ ساتھ، اِدھر ۲۰، ۲۵ سال کے اندر ہمارے سماج میں بھی بہت کچھ تبدیلیاں ہوئیں اور خوابِ خیال کی دُنیا کو چھوڑ کر ہم نے دُنیا کو دُنیا کی طرح دیکھنا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ادب پر بھی اس کا بڑا اثر پڑا۔ یعنی اگر اس سے قبل ہم اپنے آپ کو قسمت اور خدا کے بھروسے پر چھوڑے ہوئے اپنے سیاسی و اقتصادی حالات کے متعلق کچھ شکوے شکایتیں کر لیا کرتے تھے تو اب ہم ان کی زندگی کے حقیقی مسایل کی حیثیت سے دیکھنے لگے ہیں۔

سنہ ۲۰ء اور سنہ ۲۱ء کا زمانہ اس انقلاب کا بڑا اہم زمانہ ہے، کیونکہ ملک نے سب سے پہلے اسی وقت اپنی مجبوریوں کو محسوس کیا اور اسی وقت سے ہمارے ادب میں انقلابی خیالات و جذبات جگہ پانے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ اس احساس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے، لیکن چونکہ ہندوؤں کی غلامی کی عمر بہت زیادہ تھی اس لئے اس ردِّعمل (Reaction) نے ان کے احساس میں زیادہ تلخی پیدا کر دی اور یہی وجہ ہے کہ ہندی ادب میں بہ نسبت اُردو ادب کے اس تلخی کے اثرات بہت کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس قسم کی شاعری کے نمایندوں میں گپت، ماکھن لال چترویدی، سوبھدرا کماری چوہان اور بالکرشن شرما خاص حیثیت کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔

گپت کی تصنیف بھارت بھارتی ہندی شاعری میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو اُردو ادب میں مسدسِ حالی کو حاصل ہے یہی حال چترویدی، سوبھدرا کماری اور بالکرشن شرما نوین کی بعض نظموں کا ہے۔ چترویدی کی ایک نظم نے جس میں ایک قیدی کوئل سے خطاب کرتی ہے، کافی شہرت حاصل کی، کیونکہ وہ بہت ہی صاف و سلیس زبان میں ہے، لیکن مفہوم و جذبات دونوں حیثیتوں سے اس کی نظم "پھول کی تمنا" زیادہ بلند چیز ہے۔ اس نظم میں پھول ہی کی زبان سے ظاہر کیا گیا ہے:

"میں نہ کسی خوبصورت عورت کے زیور میں گوندھا جانا پسند کرتا ہوں، نہ کسی بادشاہ کی تابوت پر چڑھایا جانا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ مالی مجھے اُٹھا کر زمین پر پھینک دے اور اس طرح میں یہ محسوس کروں کہ مجھے مادرِ وطن پر چڑھا دیا گیا۔"

کتنی دلکش تعبیر ہے اور جذبات کے لحاظ سے کتنی گہری!

اسی طرح سوبھدرا کماری چوہان کی نظم جھانسی کی رانی بھی اس زمانہ کی مقبول نظموں میں ہے، لیکن بالکرشن شرما نوین کی

وہ نظم جس میں اس نے شاعر سے خطاب کیا ہے، غالباً زیادہ بلند چیز ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اے شاعر، کوئی ایسا گیت سنا، جو چاروں طرف ہلچل ڈالدے، ایک طوفان اس طرف سے آئے اور ایک اُس طرف سے۔ جان کے لالے پڑجائیں، فضا پر ہر جگہ دھواں چھاجائے، آسمان سے آگ برسنے لگے، تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں اور گناہ و ثواب کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے۔"

اسی زمانہ میں بعض شعراء ہمیں ایسے بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے حالات زمانہ کا بہت کم اثر قبول کیا اور ان میں اول اول پنت، جے شنکر پرشاد اور سوریا کانت نرالا کے نام بہت نمایاں نظر آتے تھے لیکن کچھ دن بعد ایک خاتون مہادیوی برما نمودار ہوئیں اور انھوں نے اس طبقہ کے شعراء میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اس جماعت کی شاعری بالکل ٹگور کا تتبع ہے اور چونکہ ٹگور کے رنگ کی کامیابی کا بالکل جذبات کی نرمی و لطافت پر منحصر ہے، اس لئے مہادیوی برما نے جو ایک عورت ہونے کی حیثیت سے زیادہ نرم و لطیف جذبات رکھتی ہیں، اس رنگ میں بڑی کامیابی حاصل کی، مثالاً ان کی ایک نظم کا مفہوم ملاحظہ ہو:

"راستہ تکتے تکتے میں نے ساری رات گزار دی، مگر اپنے محبوب کو نہ دیکھا۔ تاریکی نے آسمان کے راستہ کو معطر قطیلے پانی سے دھودیا اور سونے آسمان میں چراغ جھلملانے لگے، مگر صبح ہوتے ہی نہ معلوم کون ان چراغوں کو بجھا گیا۔ اے سکھی خواہ آسمان کہرے کی طرح مٹ جائے، خواہ سارا عالم بلبلے کی طرح فنا ہوجائے، لیکن میرے اس رنج و غم کی حکومت ہمیشہ ہمیشہ رہے گی، کیونکہ میں اپنے محبوب کی غیر فانی سہاگن ہوں۔"

آپ نے دیکھا کہ اس کا انداز بیان ٹگور کی گیتانجلی سے کتنا ملتا جلتا ہے۔ نرالا بھی اسی اسکول کا شاعر ہے لیکن اسکے یہاں ہم کو بعض نظمیں جدید رنگ کی بھی ملتی ہیں۔ پہلے وہ زبان و خیالات کے لحاظ سے بہت مشکل کہنے والا شاعر سمجھا جاتا تھا مگر اب چند سال سے وہ عوام کی زبان میں شاعری کرنے لگا ہے اور "الہ آباد کے پتھر پر" اس کی اس دور کی غالباً سب سے پہلی نظم ہے جسمیں اس نے انقلابی زبان میں شاعری کی ہے۔ اس کی اور نظمیں بھی اس رنگ کی ہیں، جن میں ہر چند تصنع زیادہ اور جذبات کم ہیں، تاہم انھیں دیکھ کر یہ ضرور محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شاعر حالات زمانہ سے بہت دیر میں اثر قبول کرنے کے بعد جلدی جلدی اس کمی کو پورا کرنا چاہتا ہے۔

پرشاد جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، ہندو فلسفہ و تمدن کے شاعر ہیں اس لئے اب صرف پنت ہی ایک ایسے شاعر رہجاتے ہیں جنھیں ہم ٹگوریت پسند اور ترقی پسند شعراء دونوں میں شامل کرسکتے ہیں۔ یوں تو پنت سے پہلے بھی مختلف شعراء ترقی پسندانہ نظمیں لکھا کرتے تھے، لیکن پنت آندھی کی طرح آیا اور ہندی کی ترقی پسند شاعری کو بہت کچھ دیگیا، چونکہ پنت ہندی شاعری میں ترقی پسند ادب کا بہت بڑا علمبردار ہے اس لئے اس کی شاعری کی چند مثالیں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ اس کی ایک نظم "مانو" کے عنوان سے ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

جگ جیون کے تم میں دینیہ ابھاو تینیں میں

اس نظم کا مفہوم یہ ہے کہ :

"زندگی کی تاریکی میں خوابوں کے دام سے دُنیا کو ڈھک دو اور زندگی کو راحت و مسرت سے بھر دو۔ یہ حیوانی زندگی موت کی زندگی ہے، اس لئے اے بیدار انسان، خوابوں کو حقیقت بنا کر نئی انسانیت کی تعمیر کر"

ایک دوسری نظم میں "تہذیب نو" میں وہ اپنی [illegible] کو یوں پیش کرتا ہے :

"جہاں جذبات و اعمال ایک سے ہوں، جہاں علم و خیال مردہ اعتقادات کی بندشوں سے آزاد ہو، جہاں پرانے رسم و رواج کی پوجا نہ کی جاتی ہو، جہاں انسان کی محنت خریدی نہ جاتی ہو، جہاں زندگی گزارنا انسان کے لئے عذاب نہ ہو، جہاں خیالات آزاد اور زندگی محبت سے لبریز ہو، جہاں لوگوں کے مکانات صحت بخش، لباس عمدہ اور جسم خوبصورت ہو۔ ایسی ہی جنت دنیا میں قایم ہونا چاہئے"

ایک اور نظم "پت جھڑ" میں وہ ملک کے درخشاں مستقبل کو اس طرح پیش کرتا ہے :

"آج ڈالیاں سونی ہیں، مگر اس سے گھبرانا نہ چاہئے، کیونکہ وہ پھر لہلہا اُٹھیں گی، موت کے بعد پھر زندگی آتی ہے اور جب قدامت ختم ہوتی ہے تو ہمیشہ نیا پن ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ انسانی زندگی میں پت جھڑ آیا ہے، اور دنیا میں پھر از سرِ نو بہار آنے کو ہے اور چونکہ صدیوں کے بعد انسانی زندگی میں یہ پت جھڑ آیا ہے اس لئے اب بہار بھی صدیوں تک رہے گی"

اس نے ایک نظم کارل مارکس پر بھی لکھی ہے اور خوب ہے، بہر حال پنت کی ان نظموں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ "ٹگور پسند" جماعت سے بڑی حد تک گزر چکا تھا۔

پنت کے علاوہ دورِ جدید کے مشہور ہندی شعرا میں بالکرشن شرما نوین کا نام بھی لیا جاتا ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس کے تاثرات صرف شاعری ہی شاعری ہیں اور وہ کوئی ٹھوس تعمیری پیام نہیں رکھتے۔

نوین کے بعد ہمارے سامنے ایک ساتھ کئی شاعروں کے نام آتے ہیں۔ دنکر، انچل، سومن، نریندر اور شانتی پریا وغیرہ اور ان سب کے یہاں ہم کو ترقی پسند یا انقلابی شاعری کے اچھے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

دنکر کی ایک نظم ہے "ہمالیہ" اس کا پہلا شعر ہے :

لے انگڑائی اُٹھ، ہلے دھرا
کر نج براٹ سُر میں ناد

اس نظم کا مفہوم یہ ہے کہ :

"اے ہمالیہ کوئی ایسی انگڑائی لے جس سے ساری زمین ہل اُٹھے، تو اپنی عظیم الشان آواز سے کوئی ایسا لفظ بول جس سے کاہلی و تاریکی بھاگ جائے، تو خاموشی چھوڑ اور شیر کی طرح ڈکار۔ اے ریاضت میں مشغول رہنے والے

ہمالیہ آج ریاضت کا زمانہ نہیں ہے۔ عہدِ نو کا صور پھونکا جا چکا ہے، اے میرے عظیم الشان ہمالیہ بیدار ہو۔ اے مادرِ وطن کے سر کے تاج اور اے ہندوستان کی درخشاں پیشانی!"

اس کی ایک نظم "کویتا کی پکار" بڑی معرکہ کی نظم ہے۔ اس نظم میں شاعری شاعر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:-

"اے شاعر، اس اساڑھ کی رم جھم میں، مجھے دھان کے کھیتوں کی طرف جانے دو اور کسان عورتوں کے سُر میں کچھ اٹپٹے گیت گانے دو تاکہ اُن دکھیوں کی خوشی میں، میں بھی تھوڑی دیر خوش ہو لوں۔ کھلیانوں میں تو رونا ہی رونا ہے، کھیتوں میں تو خوش ہو لینے دو۔ میں کچھ دیر بچوں کے ساتھ دھوپ پر کھیلوں گی، دھنک کے رنگین کھلونے پر مچلوں گی تیتری کے پیچھے دوڑوں گی، جگنو بنکر مسکراؤں گی اور ہر سنگار کے پھول بن کر سہاگنوں تک پہونچوں گی اور جب کسان سوکھی روٹی ہل پر رکھ کر کھائے گا تو میں لوٹے میں گنگا جل بنکر اس کی پیاس بجھاؤں گی، اس کے جسم سے پسینہ بنکر گرتی جاؤں گی اور اسی پسینے کے بوندوں سے کھیت میں موتی پیدا کروں گی۔

ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھ کر جب کسان خوش ہوگا تو میں اس کے دل میں امید بنکر آؤں گی۔ نیم عریاں کسانوں کے گھروں میں ہوا کا جھونکا بنکر پہونچوں گی اور چراغ بجھا دوں گی تاکہ مہمانوں کے سامنے وہ شرمندہ نہ ہوں۔

جب کسان قرض ادا کرنے کے لئے دودھ، گھی بیچکر روپیہ جمع کریں گے یہاں تک کہ خود ان کے لئے ایک قطرہ بھی نہ بچے گا اور جب بچے دودھ دیکھ کر مچلیں گے اور ان کی ماں انھیں بہلائے گی تو میں اپنا کلیجہ پھاڑ لوں گی اور ہو سکتا ہے کہ اس وقت سرمایہ داروں کے ان مظالم پر زمین کا کلیجہ بھی پھٹ جائے۔"

اس نظم کی معنویت اور اس کا جوش یقیناً داد سے بے نیاز ہے اور دِنکر کی شاعری کی اس خصوصیت نے اسے صفِ اول کے شعراء میں بھی ایک خاص جگہ پر ممتاز کر دیا ہے۔

کوی دِنکر کے ساتھ ہی ساتھ ادھر دس پندرہ سال میں اور بھی متعدد ہندی شاعروں نے اپنی جگہ پیدا کر لی ہے جن میں انچل، نریندر اور سومن کا نام زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، لیکن ان کے یہاں شاعرانہ خوبیاں اور اندازِ بیان کی لطافتیں کم ہیں، یہ لوگ ہر بات بہت صاف صاف کہنا پسند کرتے ہیں۔ انچل کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ آج کل کے سماج کی پوری نمایندگی کرتا ہے، تاہم وہ بڑی حد تک نئی شاعری کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے، چنانچہ اپنی ایک نظم میں وہ اپنے خیالات اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ

"میں اُن سے کہتا ہوں جو اپنے عیش و آرام میں محو ہیں کہ وہ بھوکے اور ننگوں کی لاشوں پر اپنی محفلِ نشاط کیوں گرم کرتے ہیں اور کیوں عوام کا خون چوس چوس کر اپنے محلوں کو سجاتے ہیں۔ اُف، اُن کے ایوانوں میں کتنے خون کے چراغ جل رہے ہیں۔"

نریندر کو ان کی جیل کی زندگی نے جدید شاعری کی طرف زیادہ متوجہ کر دیا ہے، کیونکہ جن باتوں کو وہ پہلے صرف دور سے محسوس کرتے تھے اب عملی طور پر اُن کے سامنے آگئیں اور اسی لئے ان کی نظموں میں انقلابی خیالات بہت چمک اُٹھے۔ سومن بھی

بھی عرصہ سے لکھتے ہیں، لیکن اس زمانہ میں ان کی ایک دو نظموں نے کافی شہرت حاصل کی، ان میں ایک نظم وہ ہے جس کا عنوان ہے "ماسکو اب بھی دور ہے"

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے شعراء ہیں مثلاً ہری کرشن، منگلا موہن، کیدار ناتھ اگروال، سوہن لال دویدی، گوپال سنگھ اور سہرلیشور سنگھ، لیکن ان کو کوئی انفرادیت حاصل نہیں ہے۔ بہر حال اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہندی شاعری زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنے کی پوری کوشش کر رہی ہے اور اس کا انداز بیان بدل چکا ہے۔ اب اس کی زبان عوام کی زبان ہوتی جارہی ہے اور اس کا موضوع اب جنتا، مزدور، سرمایہ دار، سامراج، انقلاب، نئی دنیا، روس، لینن اور کارل مارکس ہیں۔

زمانہ نے آج انسانیت کے ہر طبقہ کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ چلے اور شاعر کو بھی زمانہ کے ساتھ چلنا پڑ رہا ہے، ہمارے ملک میں ہندی کے شاعروں نے بہ نسبت اُردو شعراء کے زمانہ کی اس پکار کو زیادہ سُنا جس کا سبب ہندوؤں کا سیاسی شعور ہے، اور ان کا وہ کلچر جو جنتا اور کسانوں کے کلچر سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔

اُردو شعراء ممکن ہے کہ شاعرانہ خیالات، الفاظ کے رکھ رکھاؤ، انداز بیان کی خوبیوں اور بلند آہنگی کے لحاظ سے آگے بڑھ گئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہندی شاعری محض شاعری کے لحاظ سے اُردو شاعری سے عرصہ تک پیچھے رہے، لیکن زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا بیان ہم کو ہندی شاعری میں بہت زیادہ ملتا ہے اور اس حیثیت سے ہم کو اُردو اور ہندی میں وہی فرق نظر آتا ہے جو قول و فعل میں پایا جاتا ہے۔

مسٹر ٹیلیلوکس

(ایک کہربائی انسان)

کچھ زمانہ گزرا کہ مغرب کے اہلِ علم نے ایک مصنوعی انسان طیار کیا تھا اور اس کا نام انھوں نے روبوٹ رکھا تھا۔ اس سے مقصود غالباً صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ زمانہ قدیم کے مقابلہ میں عہد حاضر کی علمی ترقیاں کس حد تک پہونچ گئی ہیں لیکن اس خیال نے بعد کو اور ترقی کی اور مخترعین نے اس سلسلہ میں بعض ایسی عجیب وغریب چیزیں بنا ڈالیں جو انسانی خدمات کو انسان سے بہتر انجام دیتی ہیں۔ مصنوعی آنکھ، ناک، کان، عضلات و اعصاب جو کہربا اور کہربائی فوٹوگرافی کی مدد سے کام کرتے ہیں وہ اس قدر عجیب وغریب ہیں کہ ان کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے۔

فلوریڈا میں ایک سائنس داں نے ایک ایسی کہربائی آنکھ ایجاد کی جو نارنگیوں کو اُن کے رنگ کے لحاظ سے الگ الگ کر دیتی ہے۔ انسانی آنکھ تو غلطی کر سکتی ہے لیکن یہ مصنوعی آنکھ پختہ و خام نارنگی کی جانچ میں کبھی غلطی نہیں کر سکتی۔

امریکہ کے ایک مخترع نے بھی کہربائی آنکھ بنائی جس کا کام شعلوں کے رنگ کو دیکھ کر درجۂ حرارت متعین کرنا ہے اور یہ میٹر سے زیادہ صحیح کام دیتی ہے۔

امریکہ کے کسی ٹیلی فون کمپنی نے ایک مصنوعی انسان ایسا طیار کیا جو وہاں کام کرنے والی ۱۱۰ عورتوں کی نگرانی کرتا ہے اور ایسی سخت نگرانی کہ ممکن نہیں یہ اپنے فرائض سے کسی وقت غافل ہوسکیں۔

ایک اور مخترع نے میکانکی چوکیدار بنایا جو گھر میں چور کے داخل ہوتے ہی گھنٹی بجا دیتا ہے اور میلوں کے فاصلہ سے وہ اپنے مالک کے ٹیلی فون کو سنتا اور اس کی ہدایات پر عمل کرکے جواب دیتا ہے۔

پنسلوینیا کے کسی پروفیسر نے ایک ایسا مصنوعی انسان بنایا جو سگار و سگریٹ پیتا ہے اور دھواں اسکے سینے کی نالیوں سے گزرتا ہوا صاف نظر آتا ہے اور اس طریق سے پتہ چلتا ہے کہ کون تماکو کس قسم کا ہے۔ کیونکہ تماکو کی خوبی کا پتہ دھویں کے رنگ ہی کو دیکھ کر چل سکتا ہے۔

لیکن سب سے زیادہ حیرتناک ایجاد اس سلسلہ میں امریکہ کے ایک سائنسداں مسٹر ہنری کا بنایا ہوا مصنوعی انسان ہے جس کا نام اس نے مسٹر ٹیلیلوکس رکھا ہے۔ جس وقت مسٹر ہنری نے اسٹیج پر اپنی اس اختراع کا مظاہرہ کیا تو لوگوں کو حیرت ہوگئی۔

جس وقت اسٹیج کا پردہ ہٹا تو لوگوں نے دیکھا کہ کرسی پر ایک مصنوعی انسان کپڑے پہنے ہوئے خاموش بیٹھا ہے لیکن جب اس کے بعد ہی پہلو سے ایک عورت مس کار نکل کر سامنے آئی تو مسٹر ٹیلی لوکس سروقد تعظیماً کھڑے ہو گئے اور ان دونوں میں یہ گفتگو ہوئی:

مس کار = "کہئے مسٹر ٹیلی لوکس کیسا مزاج ہے"

ٹیلی لوکس = "بحمداللہ اچھا ہوں"

مس کار = "کیا آپ یہاں خوش ہیں"

ٹیلی لوکس = "بہت خوش ہوں"

مس کار = "بیٹھ جائیے"

ٹیلی لوکس نے شکریہ ادا کیا اور بیٹھ گیا۔

بظاہر یہ تمام باتیں حیرتناک معلوم ہوتی ہیں، لیکن حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ یہ سب کچھ برق و کہربا کا کرشمہ ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ جس وقت مس کار چلکر سامنے آئی تو اس کا سایہ کہربائی فوٹو گرافی کے بعض خلایا پر پڑا اور انھوں نے کل پرزوں میں حرکت پیدا کر دی جس سے ٹیلی لوکس اُٹھ کھڑا ہوا اور چونکہ فونوگراف کی چوڑیاں بھی اسی کے ساتھ کام کرنے لگی تھیں اسلئے گفتگو کی صورت بھی پیدا ہو گئی ۔۔ ٹیلی لوکس پنکھا بھی ہلاتا ہے، جھاڑو بھی دیتا ہے اور اسی طرح کے دوسرے کام بھی کرتا ہے اور ان سب کا تعلق برق و کہربا سے ہے۔

جرمنی کے ایک تاجر جواہرات نے چوروں سے محفوظ رہنے کے لئے ایک مصنوعی آنکھ طیار کرائی ہے جب کوئی شخص کھڑکی یا دروازہ سے داخل ہوتا ہے تو اس کا سایہ اس آنکھ پر پڑتا ہے اور وہ فوراً گھنٹہ بجا دیتی ہے۔ اگر چور رات کو آئے اور اس کے ہاتھ میں ٹارچ یا کوئی اور روشنی ہو تو اس روشنی کا عکس آنکھ پر پڑتا ہے اور گھنٹہ بجنے لگتا ہے، لیکن اگر چور روشنی نہ رکھتا ہو تو فرش میں ایسے آلات ہیں کہ اس پر چلنے سے روشنی از خود ہو جاتی ہے اور یہ آنکھ اپنا کام کر جاتی ہے۔

امریکہ کے بعض قید خانوں میں بھی ایسے ہی مصنوعی چوکیدار قایم کئے گئے ہیں، جو قیدی کے کوٹھری سے باہر آتے ہی فوراً خبر کر دیتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ عجیب و غریب وہ روبوٹ ہے جو یہ بتاتا ہے کہ نیویارک کی سڑکوں پر آفتاب کی روشنی کس مقدار میں پہونچتی ہے اور دھویں میں کتنی فوق البنفسجی شعاعیں (Ultra Voilet ray) جذب ہو جاتی ہیں۔

فرانس کے ایک ڈاکٹر نے اس سلسلہ میں بہت زیادہ مفید اختراع کی ہے۔ اس نے فانٹم (Phantom) نامی ایک ایسا مصنوعی انسان بنایا ہے جس کا سر، حلقوم اور سینہ بالکل انسان کا سا ہے۔ ان کے اندر نہایت ذکی الحس تار لگے ہوئے ہیں اور جب ان اعضاء کے کسی ایسے حصہ کو چھوا جاتا ہے جس سے انسان کو تکلیف ہونا چاہئے تو فوراً

گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ اس سے مقصود طلبہ کو یہ بتانا ہے کہ جراحی کے وقت کس حصّہ کو چھونے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے اور کس سے کم۔

امریکہ کے کسی وسیلین بنانے کے کارخانے میں بھی ایک مصنوعی انسان اسی قسم کا موجود ہے جو نلکیوں کو دیکھتا رہتا ہے اور جب کسی نلکی سے تیل یا گندگی ملی ہوئی وسیلین نکلنے لگتی ہے تو وہ فوراً گھنٹی بجا دیتا ہے۔ اسی طرح مغرب کے بہت سے اسپتالوں میں خون کا رنگ دیکھنے کے لئے خوردبینوں میں مصنوعی آنکھیں لگا دی گئی ہیں۔

نیویارک میں ایک آلہ ایسا ہے جسے مصنوعی کان کہنا چاہئے، جو بتاتا ہے کہ شہر میں کس وقت کتنا شور و ہنگامہ موٹروں وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے۔

آخوند فیض محمد فاروقی

معلومات عامہ

زلزلہ کیوں آتا ہے زلزلہ کے مختلف نظریئے بیان کئے جاتے ہیں، ایک نظریہ یہ ہے کہ زمین کے اندر بہت گہرائی میں جو پتھریلی چٹانیں یا پہاڑیاں موجود ہیں، ان میں سے بعض غیر مستحکم ہیں اور جب وہ سرکتی ہیں تو زمین کی بالائی سطح تک جنبش و حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں انشقاق پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ آتش فشاں پہاڑ جوش میں آتے ہیں تو زمین ہل جاتی ہے اور اس میں شگاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ تیسرا نظریہ یہ ہے کہ جب زمین کی دڑاڑوں اور پہاڑوں کے شگافوں سے پانی جذب ہو کر زمین کی گہرائی میں اس حصّہ تک پہونچتا ہے جو مشتعل حالت میں ہے تو اس سے بھاپ پیدا ہوتی ہے اور وہ جب باہر آنا چاہتی ہے تو زمین پھٹ جاتی ہے۔

دُنیا کی قدیم ترین پارلیمنٹ آئس لینڈ کی ہے۔ یہ ۹۳۰ء میں قایم ہوئی تھی اور اس کو آلتھنگ کہتے تھے۔ اس پارلیمنٹ میں مختلف جماعتوں کے نمایندے شریک ہوتے تھے اور ایک کھلی ہوئی وادی میں اس کا اجلاس ہوتا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۰۰ء میں یہ ختم ہوگئی اور پھر ۱۸۴۳ء میں دوبارہ قایم ہوئی۔ آج کل یہ دو ایوانوں اور ۴۲ ممبروں پر مشتمل ہے۔

جنّت عدن کہاں تھی اس بہشت کا ذکر انجیل اور قرآن دونوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ کوئی آسمانی چیز نہیں، بلکہ اس سے مراد بابل کی وہ وادی ہے جسے قدیم سمیری زبان میں ادنو کہتے تھے۔ یہ وہ حصّہ زمین ہے جو خلیج فارس کے کنارے دجلہ و فرات کے درمیان واقع ہے۔

مالہ و ماعلیہ

جنوری ۴۵ء کے ہمایوں میں جناب جگر مرادآبادی کی ایک غزل شایع ہوئی ہے :

روبروے دوست ہنگام سلام آہی گیا　　رخصت اے دیر و حرم دل کا مقام آہی گیا
منتظر کچھ رند تھے جس کے وہ جام آہی گیا　　باش اے گردوں کہ وقت انتقام آہی گیا
اللہ، اللہ، یہ مری، ترک وطلب کی وسعتیں　　رفتہ رفتہ سامنے حسن تمام آہی گیا
ہر نگہ پر بندشیں، اک اک نفس کی پرسشیں　　ہوشیار اے عشق، وہ نازک مقام آہی گیا
عشق کو تھا کب سے اپنی خشک دامانی کا رنج　　ناگہاں آنکھوں کو اشکوں کا سلام آہی گیا

بے جگر سونا پڑا تھا مدتوں سے میکدہ
پھر وہ دریا نوش، رند تشنہ کام آہی گیا

مطلع بہت اچھا ہے اور اس مفہوم کو کہ "دل کا مقام وہی ہے جہاں اور جب حضورِ حسن میں باریابی ہوجائے" نہایت خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔

دوسرا شعر بھی صاف ہے لیکن مفہوم و انداز بیان دونوں فرسودہ و پامال ہیں۔ اس مضمون کو حافظ و غالب جس رندانہ جوش کے ساتھ ادا کر گئے ہیں اس میں اضافہ ممکن نہ تھا۔ حافظ کہتا ہے :

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم　　فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد　　من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

غالب لکھتا ہے :

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم ،　　قضا بہ گردشِ رطل گراں بگردانیم

جگر نے بھی لفظ باش کے استعمال سے کچھ جوش پیدا کرنا چاہا ہے، لیکن یہ للکار امیر حمزہ کی نہیں بلکہ عمرو عیار کی سی ہے، علاوہ اس کے پہلے مصرعہ میں کچھ کا لفظ صرف مصرعہ کا وزن پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے، جس نے مفہوم کی وسعت کو تنگ کر دیا ہے۔

یہ خصوصیت کہ "جام ہاتھ میں آیا اور گردوں یا زمانہ سے انتقام کے لئے آمادہ ہوگئے" تمام رندوں کی ہونا چاہئے لیکن جگر نے کچھ کا اضافہ کرکے اس عمومیت میں تخصیص پیدا کر دی جس نے لطف کو کم کر دیا۔

تیسرے شعر کا مفہوم بالکل غیر واضح ہے۔ "ترک وطلب" سے مراد غالباً ان کی "محبت یا حسن کی ترک وطلب" ہوگی لیکن اول تو اس کی "وسعتیں" کوئی معنی نہیں رکھتیں اور اگر اس کا کوئی مفہوم ہو تو اس سے رفتہ رفتہ "حسنِ تمام" کیونکر سامنے آسکتا ہے۔ "طلب محض" کی وسعت یا (اگر تصوف کو سامنے رکھا جائے) تو "ترک ماسوا" کی وسعت کا نتیجہ تو

ہوسکتا ہے کہ "حسنِ تمام" کا مفہوم سمجھ میں آجائے۔ لیکن "ترک وطلب" دونوں کے اجتماع سے ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اگر "ترک وطلب" کے درمیان حرفِ عطف کو دور کردیا جائے تو بیشک مفہوم پیدا یہ ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے حرفِ عطف کاتب کی غلطی ہو۔

چوتھے شعر کے پہلے مصرعہ میں ہر چند پُرسش کا استعمال صحیح نہیں۔ کیونکہ پُرسش اور پُرسہ فارسی میں عیادت و تعزیت کے لئے استعمال ہوتا ہے، نہ کہ بازپُرس کے معنے میں۔ لیکن چونکہ اُردو میں پُرسش، بازپُرس کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس لئے کوئی حرج نہیں، تاہم مصرعہ کے دونوں ٹکڑے متوازن نہیں ہیں۔ "اک اک نفس" کے ساتھ "ہر ہر نگہ" ہونا چاہئے تھا یا پھر "اک اک" کو دور کرکے یہ مصرعہ یوں کہنا چاہئے تھا:

ہر نگہ پر بند شیں ہیں، ہر نفس کی پُرسشیں

پانچواں شعر مفہوم کے لحاظ سے بہت اچھا ہے، لیکن اس میں "سبک تابی" کا استعمال محلِ نظر ہے۔

تاب کے معنے ہیں: "روشنی، گرمی، صبر، پیچ" اور سبک[1] کے معنے ہیں: "ہلکا، جلد، شتاب" اور ان معنی کو پیش نظر رکھ کر جگر صاحب نے سبک تابی ہلکی روشنی یا ہلکی گرمی کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

لفظ تاب جب کسی چیز سے ملحق ہوتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوا کرتا ہے کہ اُس چیز کو تاب دی یا اس سے تاب حاصل کی جیسے "آفتاب جہانتاب" یا "آبِ آہن تاب" اس لحاظ سے سبک تاب کے کوئی معنے نہیں ہوئے، لیکن اگر تاب بمعنی تپش، روشنی قرار دیکر سبک اس کی صفت قرار دیجائے تو شعر کا مفہوم اس کا مقتضی نہیں۔

سبک جب اس طرح کی ترکیب میں استعمال ہوتا ہے تو وہ جلد زائل ہو جانے کا مفہوم پیدا کرتا ہے جیسے "سبک سایہ" اس لئے "سبک تاب" اگر التفات کی صفت قرار دیجائے تو اس کا مفہوم ہوگا "جلد ختم ہونے والا التفات" اور یہ شعر کے مفہوم کے لحاظ سے مناسب نہیں۔

چونکہ دوسرے مصرعہ میں جیسے کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس لئے التفاتِ چشمِ ساقی" کی تعبیر کچھ اس طرح ہونا چاہئے کہ ہلکا سا فریب اس سے ظاہر ہو، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس مصرعہ کو یوں ہونا چاہئے۔

التفاتِ چشمِ ساقی کے کرشمے، کچھ نہ پوچھ

اس طرح یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ شاعر کا یہ سمجھنا کہ "مجھ تک دورِ جام آہی گیا"، صرف ایک کیفیت تھی نہ کہ واقعی شراب کی پیشکش۔

چھٹے شعر کے دوسرے مصرعہ میں لفظ سلام بالکل بے محل ہے، اس کی جگہ پیام کہنا زیادہ مناسب تھا۔

مقطع اچھا ہے، لیکن اس پر جگر نے یہ فٹ نوٹ لکھ کر کہ میکدہ سے مراد انکے پیر و مرشد کا آستانہ ہے، نشہ کرکرا کر دیا۔

---

[1] عام طور پر اس کا تلفظ سَبُک (بہ ضمتین) کیا جاتا ہے لیکن اہل ایران اس کو ہمیشہ سُبَک (بہ فتح سین و ضمہ با) بولتے ہیں۔ (نیاز)

باب المراسلۃ والمناظرہ

(ہندو مسلم قومیت)

محترم -

نومبر کے نگار میں جناب شمیم رضوی گیاوی کے استفسار کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "میں کیا ہر شخص تسلیم کرے گا کہ ہندو مسلمان دونوں یقیناً دو قوم ہیں - کیونکہ قومیت کی بنیاد مذہب و کلچر پر قایم ہوتی ہے اور مسلمان ان دونوں باتوں میں ہندوؤں سے بالکل مختلف ہیں" میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر کیونکر قایم ہوسکتی ہے؟ روس اور چین میں مسلمانوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے - لیکن کبھی یہ بات سننے میں نہ آئی کہ وہاں کے مسلمانوں نے اپنی جداگانہ قومیت کا کبھی دعویٰ یا مطالبہ کیا ہو - پھر دوسرے ممالک میں بھی مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں لیکن مذہب کے اختلاف کے باوجود اُن کی قومیت ایک ہی سمجھی جاتی ہے - خود رسول اللہ کے زمانہ میں عرب میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے تھے لیکن بہر حال وہ عربی ہی کہلاتے تھے - مذہب کے اختلاف کی وجہ سے اُن کی قومیت کبھی جداگانہ نہیں سمجھی گئی - پھر ہندوستان میں ہندو اور مسلمان کو محض مذہب کے اختلاف کی بنا پر دو الگ الگ قوم سمجھنا، میری سمجھ میں نہیں آتا، کس طرح صحیح ہوسکتا ہے - ممکن ہے اس باب میں آپ مزید روشنی ڈالیں تو یہ مسئلہ صاف ہوسکے -

البتہ کلچر کا تعلق قومیت سے ضرور ہے - کلچر کا اطلاق جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، معاشرت اور رہنے سہنے کے طریقوں پر ہوتا ہے - اس صورت میں بھی ہم آسانی کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دو جداگانہ قوم نہیں کہہ سکتے - اس میں شک نہیں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی معاشرت ایک حد تک الگ الگ ہے - لیکن معاشرت کا یہ اختلاف مذہب کی بنا پر نہیں بلکہ ماحول کی وجہ سے ہے - پنجابیوں کے رہنے سہنے کے طریقے بنگالیوں سے ضرور الگ ہیں - لیکن ہندو اور مسلمانوں کی معاشرت بنگال میں تقریباً ایک ہی ہے اور یہی حال کم و بیش پنجاب کا ہے اس لئے اگر واقعی ہندوستان میں مختلف قومیں آباد ہیں تو اُن کا تعین زمین اور ماحول کے لحاظ سے تو ممکن ہے - لیکن تمام ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو بالکلیت دو جداگانہ قوم قرار دینا کس طرح درست سمجھا جاسکتا ہے - اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے رہنے سہنے کے طریقوں میں کچھ فرق ہے اور اس لئے اُن کی دو جداگانہ قومیت ہے تو پھر ایک بنگالی مسلمان اور ایک پنجابی مسلمان کی معاشرت میں تو بعد المشرقین ہے

پھر وہ کس طرح ایک قومیت کے اندر آ سکتے ہیں مدراس کے ایک مسلمان اور لکھنؤ کے ایک مجتہد کو سامنے بٹھا کر فیصلہ کیجئے! کیا دونوں کا کلچر ایک ہی ہے؟ پھر جب ہندوستان کے تمام مسلمان تہذیب و معاشرت کے اختلاف کے باوجود ایک ہی قوم سمجھے جا سکتے ہیں تو اس صورتِ حال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو جداگانہ قوم سمجھنا کہاں کا انصاف ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دو قومیت کی تھیوری ابھی حال کی پیداوار ہے جو پاکستان کے بیک گراؤنڈ کو درست کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ خود قائد اعظم جناح آج سے چند سال پہلے تک ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی قوم سمجھتے رہے سنہ ۱۹۱۶ء کا لکھنؤ پیکٹ دو قومیت کے اُصول پر نہیں ہوا تھا۔ پہلی گول میز کانفرنس میں جس میں قائد اعظم نے بھی شرکت کی تھی دو قومیت کا ذکر تک نہیں آیا تھا۔ اُس کے بعد بھی گول میز کانفرنسوں میں مسلمانوں کے لئے تحفظات اور مراعات تو مسلمان مندوبین نے طلب کئے لیکن کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ ہندو مسلمان کی ہندوستان میں جداگانہ قومیت ہے اور اُن کے لئے ملک کے ایک حصہ کو وقف کر دینا چاہئے۔ ابھی چند سال سے ہندو مسلمان کی جداگانہ قومیت کا ڈھنڈھورا پیٹا جا رہا ہے اگر ہندو مسلمان کی واقعی دو جداگانہ قومیت ہے تو یقیناً وہ شروع سے ہے۔ پھر اس چیز کا غوغا صرف چار پانچ سال ہی سے کیوں بلند ہے؟ اس سے پہلے کیا تمام لوگوں کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا کہ اتنی کھلی ہوئی چیز جس کی نسبت آج ریب و شک کی گنجائش بھی باقی نہیں، کسی کو دکھائی نہیں دیتی تھی۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت کے اختلاف پر آج بہت زور دیا جاتا ہے، اور اگر زور نہ دیا جائے تو واقعی دو قومیت کی تھیوری ثابت نہیں ہو سکتی اور اس طرح پاکستان کا مطالبہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ لیکن جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ دونوں "قومیں" بالکل ایک رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مسلمانوں کے ہاں شادی بیاہ کی وہ کونسی رسم ہے جو ہندوؤں سے نہیں لی گئی ہے۔ صوبہ بہار کے مسلمانوں کی نسبت تو میں قطعی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ شادی بیاہ کے موقع پر "الف" سے لیکر "یے" تک وہ جو کچھ کرتے ہیں خالص ہندو معاشرت کا نمونہ ہے۔ کوئی گھر بھی ایسا نہیں ہے جو ان رسومات سے بچا ہوا ہو۔ بڑے بڑے علماء کے گھروں میں یہ تمام "مشرکانہ" رسومات ہوتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ "سہاگ پورے" اور "باون مٹکے" کی موجودگی میں یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ شادی کسی ہندو کے گھر میں رچائی جا رہی ہے یا کسی مسلمان کے گھر میں۔ ٹونے اور جھومر کے گانوں کے بغیر کسی مولوی یا مُلا کی شادی بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ دوسرے مسلمانوں کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ شادی کا کوئی گھر بھی ہو ہر گھر میں "موری ننداَ بدھا نالے کے آیئں، بلا و راجہ بیرن کو" ضرور گایا جائے گا۔ اس صورتِ حال میں یہ کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے، کہ ہندو مسلمانوں کی معاشرت الگ الگ ہے اور اُن کے رہنے سہنے کے طریقوں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔

پیدائش کے موقع پر بھی جو کچھ مسلمانوں کے گھروں میں ہوتا ہے وہ سب ہندو معاشرت کا نمونہ ہے چھٹی چھلوں

میں جو مراسم مسلمانوں کے یہاں ہوتے ہیں وہ خالص ہندوانہ ہیں۔ اس سے انکار کرنا مشکل ہے۔

پھر غمی کی تمام باتیں بھی مسلمانوں نے ہندوؤں سے لی ہیں۔ شیعوں کے ہاں "سوم" سنیوں کے یہاں "چہارم" پھر دسواں، بیسواں، چالیسواں، سہ ماہی، چھ ماہی، برسی جنھیں تمام مسلمان پورے مذہبی اعتقاد کے ساتھ مناتے ہیں کیا اسلامی تعلیم کے مطابق ہیں؟ پھر ہم کس طرح باور کریں کہ ہماری معاشرت ہندوؤں سے بالکل الگ ہے اور اس لئے ہماری قومیت بالکل جداگانہ ہے۔

ہندوؤں کو ہم عناصر پرست کہتے ہیں۔ لیکن کیا خود مسلمان بھی عناصر پرستی میں مبتلا نہیں ہیں؟ ہندوؤں کے ہاں گنگا جی کی پوجا ہوتی ہے۔ لیکن مسلمان بھی اُن سے پیچھے نہیں ہیں۔ صوبہ بہار کے بیشتر گھروں میں خواجہ خضر کی نیاز ہوتی ہے جس کا قاعدہ یہ ہے کہ برسات کے موسم میں جب دریا جوش پر رہتا ہے موٹی موٹی روغنی روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ کھیرے، امرود کیلے اور دوسرے پھل مہیا کئے جاتے ہیں اور پوری عقیدت کے ساتھ دریا کے کنارے لیجا کر خواجہ خضر کے نام پر فاتحہ دیا جاتا ہے۔ فاتحہ کے بعد کاغذ کی کشتی بنا کر دریا میں چھوڑ دی جاتی ہے جس پر آٹے کا چراغ گھی کی بتی کے ساتھ روشن ہوتا ہے عقیدہ یہ ہے کہ اس طرح وہ دریائی حوادث سے محفوظ رہیں گے اور جب کبھی اُن کی کشتی گرداب میں پھنسے گی تو خواجہ خضر بیڑا پار لگادیں گے۔ بتائیے یہ چیزیں ہم نے ہندوؤں سے نہیں لی ہیں تو اور کہاں سے لی ہیں۔ پھر ہماری معاشرت اور ہندوؤں کی معاشرت میں کیا فرق ہے؟

ہندو بلاشک وشبہ بت پرست ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں خانقاہوں اور امام باڑوں میں جو کچھ ہوتا ہے کیا وہ بت پرستی سے الگ چیز ہے؟ ٹین کے ٹکڑے کیا پورے اخلاص اور عقیدت کے ساتھ امام باڑوں میں نہیں پوجے جاتے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ علم اور پنجوں کو پھولوں کے ہار بنائے جاتے ہیں اور جب اُن پر سے پردے ہٹائے جاتے ہیں تو مومنین کی پوری جماعت اُن کے سامنے احترام کا سر جھکا دیتی ہے۔ ہندوؤں کی پوری تہذیب ہمارے اندر سرایت کر چکی ہے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا اب ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

گانے بجانے ہندو مذہب کے جزو لاینفک ہیں۔ مسلمانوں نے اس کمی کو اپنے ہاں محسوس کیا۔ بغل میں طبلے اور ستار بجائے جارہے ہوں اور ہم خاموش رہیں یہ کیونکر ممکن ہے؟ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہم نے اپنے ہاں محفل سماع قایم کی اور ڈھول کی گت پر بڑے بڑے عابد و زاہد رقص کرنے لگے شیعوں نے دیکھا اس معاملہ میں سنی ہم سے آگے بڑھ گئے اور اب اُن کی محفلیں زیادہ پرکیف ہونے لگیں۔ اس لئے محرم کی مجلسوں میں انھوں نے اپنے یہاں سوز اور نوحوں کا سلسلہ شروع کیا جس میں پڑھنے والے فن موسیقی کے تمام جوہر دکھانے لگے اور اس طرح سامعین کے لئے دلبستگی کا پورا سامان فراہم ہوگیا۔ ان باتوں کو دیکھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تمام چیزوں پر زمانہ نے ایک ہی طرح کی چھاپ لگادی ہے جس کا الگ کرنا اب ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

ہندوؤں کے یہاں کتھا کے موقع پر "پرشادی" تقسیم ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے یہاں اس چیز کا نام "تبرک" رکھا گیا ہے چیز ایک ہی ہے۔ نام الگ الگ ہوگئے ہیں۔ تقدس کے اعتبار سے "پرشادی" اور "تبرک" کا درجہ بالکل ایک ہے۔ کوئی فرق نہیں۔

ہندوؤں نے گائے کی تعظیم شروع کی تو ہم نے اپنے یہاں دلدل کو سنوارا۔ ہندوؤں نے سرسوتی جی کا دھیشان (یا بھسان) دریا میں لیجا کر کیا تو ہم نے تعزیوں کے پہلام کربلا کے اندھے کنوؤں میں کئے۔

کہنے کی غرض یہ ہے کہ ایک زمانہ کے میل جول کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت ایک قالب میں ڈھل گئی ہے اور اگر کچھ فرق باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی دن بدن مٹتا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں ہندو مسلمانوں کو دو قوم کہنا واقعات اور مشاہدات کو جھٹلانا ہے۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ شہری زندگی کا نقشہ ہے۔ دیہاتوں کے ہندو مسلمان میں تو کوئی تفریق کی ہی نہیں جاسکتی صورت دیکھ کر مذہب کا پتہ لگانا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایک بار میں اپنے موضع پر تحصیل کے لئے گیا ہوا تھا۔ جمع بندی میں ایک اسامی کا نام "ابراہیم میاں" تھا۔ میری آنکھوں نے اسامیوں کے مجمع میں ابراہیم میاں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہیں۔ ابراہیم میاں موجود نہ تھے۔ لیکن جب پٹواری نے ابراہیم میاں کا نام پکارا تو وہ وہاں پہلے ہی سے موجود پائے گئے۔ ابراہیم میاں اور بھیکن چودھری میں امتیاز کرنا مشکل تھا۔

جناب وصی احمد صاحب بلگرامی نے اپنی کتاب "ملک خطا کے شہزادے" میں "روحانی طاعون" کی چند مثالیں پیش کی ہیں[1]۔ اور اُن کو پڑھکر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچر الگ الگ ہیں اور اُن کی قومیت ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہے۔

یہ بات بھی اکثر کہی جاتی ہے کہ ہندو مسلمانوں کی زبان الگ الگ ہے۔ لیکن واقعات کی روشنی میں یہ دعویٰ بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ بلاشک و شبہ یو۔پی اور ایک حد تک صوبۂ بہار میں اوپر درجہ کے شہری مسلمانوں کی زبان ایک امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ لیکن دیہاتوں اور قریوں میں اس زبان کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ بدھو میاں اور چھنپت رائے دیہاتوں میں ایک ہی زبان بولتے ہیں اور اگر بدھو میاں کو نواب اسمٰعیل صاحب، صدر صوبائی مسلم لیگ بہار کے پاس تھوڑی دیر کے لئے بٹھا دیا جائے تو بدھو میاں کا دم نکل جائے۔ اُنھیں تو چھنپت رائے کی معیت ہی پسند آتی ہے اور اُنھیں سے وہ کھل کر باتیں کرتے ہیں۔

دوسرے صوبوں کی حالت زبان کے معاملہ میں بالکل الگ ہے۔ بنگال کے تمام مسلمان بنگلہ بولتے ہیں اور اُردو زبان سے اُنھیں کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔ یہی کیفیت دوسرے صوبوں کی ہے۔ ایک بار میں بالاسور (اڑیسہ) گیا ہوا تھا

---

[1] ملک خطا کے شہزادے صفحات ۱۷-۱۸

وہاں کے پڑھے لکھے مسلمانوں کے پاس میں بیٹھا تو میں نے محسوس کیا کہ انھیں میری گفتگو سمجھنے میں دقت ہو رہی ہے دراں حالیکہ میں اپنے خیال میں خالص ہندوستانی زبان میں اُن سے بات چیت کر رہا تھا۔ میں نے اُن سے دریافت کیا تو انھوں نے میرے خیال کی تائید کی اور کہا کہ انھیں چونکہ اُردو زبان میں بات چیت کرنے کے بہت کم مواقع ملتے ہیں، اس لئے انھیں اُردو سمجھنے اور بولنے میں دشواری ہوتی ہے۔ یہ حال بالاسور کا ہے جو صوبۂ اڑیسہ کا ایک ضلع ہے۔ اسی سے وہاں کے دیہاتوں کا پتہ چل سکتا ہے کہ وہاں مسلمانوں کی زبان اور معاشرت کیا ہوگی؟

اگر ان تمام باتوں کے جواب میں یہ کہا جائے کہ ہندو مسلمان کے درمیان حدِ فاصل قایم کرنے والی چیزیں "کُفر" اور "اسلام" ہیں اور یہ دونوں چیزیں کبھی ایک نقطہ پر جمع نہیں ہو سکتیں۔ تو اس حالت میں بھی "کفر" اور "اسلام" کا معیار قایم کرنا بہت دشوار ہے۔ آج کل کیفیت تو یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے نزدیک کافر ہے۔ بایں صورتِ حال کس کو مسلمان کہا جائے اور کس کو کافر؟ اگر اس کے جواب میں آپ یہ ارشاد فرمائیں کہ اسلام کو اسلام کے اندر ڈھونڈنے کی کوشش کیجئے تو سید مقبول احمد صاحب بی۔ اے کے "فلسفۂ مذہب" کو سمجھنے والے آج ہندوستان میں کتنے لوگ ہیں۔ گفتگو صرف تخیل کی دنیا میں نہیں کی جا سکتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کی عملی زندگی کیا ہے؟ اور جب اس کا جائزہ لیا جاتا ہے تو وہ سراسر ہندو مذہب، ہندو تہذیب اور ہندو معاشرت میں رنگی ہوئی ہے۔

بالکل صحیح فرمایا ہے مولانا ابوالکلام آزاد نے کہ:

> "ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا۔ اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم، اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علٰحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا دے سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہئے"
>
> (خطبۂ صدارت رام گڑھ)

اگر موقع ہو تو نگار میں اپنے مزید خیالات کا اظہار فرمائیے۔

نیاز مند

ظہیر الدین حیدر نیّر آروی

(نگار) ہندو مسلم قومیت کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے اور ضرورت ہے کہ دونوں جماعتوں کے اکابر اس پر غور کریں۔ میں اس باب میں ملک کے مخصوص اہلِ فکر کو دعوت دے رہا ہوں کہ وہ اس بحث میں حصہ لیں اور مجھے امید ہے کہ یہ سلسلہ آیندہ ماہ سے شروع ہو جائے گا۔ تنہا میری رائے کوئی چیز نہیں، تاہم جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ بھی اسی سلسلہ میں عرض کروں گا۔ (نیاز)

غزل فارسی : خان بہادر رضا علی وحشت

کہ مارا داد پیغامے کہ مارا کرد ایمائے ؟ زدل برخاست فریادے، بسر جوشید سودائے
زبیداد تغافلہا چناں بیمیں نہ گردیدم کہ از تحریک مژگانش خلد در دل تمنائے
نمی دانم بمنزل کے رسم لیک ایں قدر دانم کہ در ہر گام یابم ہمقدم یک لغزش پائے
چو نبود تاب نظارہ چہ سود از شوق نظارہ مرا تعلیم حیرت می دہد آئینہ سیمائے
ہمہ در فکر دنیا مبتلا یارب چہ دوراست ایں نہ فرہادے نہ شیرینے نہ مجنونے نہ لیلائے
بفکر حال چنداں بیخبر گشتی زمستقبل کہ امروز ترا گویا نباشد ہیچ فردائے

دجود وحشت دیوانہ ہم بس مغتنم باشد
نہ میرے نوحہ گرا ینجا نہ شور انگیز سودائے

عشق ناتمام

جمیل مظہری

وہ زندگی عجیب تھی نہ ہجر تھا نہ وصل تھا کہ دو دلوں کا مسئلہ نزاعِ عشق و عقل تھا
مرا عقیدہ یہ کہ ضبط شوق کی حیات ہے تمہارا فلسفہ کہ عشق صرف حبّ ذات ہے
مرے طریق عاشقی میں عرض مدعا غلط، تمہاری شرعِ حُسن میں نمایش ادا غلط
خیال دونوں ہی کا یہ کہ شورش دروں غلط تپش غلط کشش غلط فسوں غلط جنوں غلط
مجھے گماں کہ سوز عشق روح کا زوال ہے انانیت کا ضعف ہے خودی کا انفعال ہے
تمھیں یقیں کہ عشق اور نسائیت میں ڈاہ ہے کچھے جدھر کو دل اُدھر نگاہ بھی گناہ ہے
مجھے یہ وہم دل سے دور ہو گی پاس آکے تم، تآل سوچتی رہیں قدم بڑھا بڑھا کے تم،
نتیجہ یہ ہوا کہ شوق پا سکا نہ کھو سکا، تمھیں وفا نہ آسکی مجھے جنوں نہ ہو سکا

بُرا ہو عقل کا کہ عشق کے مزے نہ آسکے

حقیقتیں تھیں تلخ اس جہان اعتبار کی
ملا سکی نہ زندگی مٹھاس اس میں پیار کی
مزاج عشق طرح عاشقانہ مانگتا رہا
کہانی مانگتا رہا فسانہ مانگتا رہا
مگر شکن بہ ابروئے زمانہ ہم نہ بن سکے
کہانی ہم نہ دیسکے فسانہ ہم نہ بن سکے
مُصر رہی محبت اپنی تشنگی لئے ہوئے
دلوں کی دھڑکنیں جنوں کی موسقی لئے ہوئے
گھٹا کی طرح زندگی پہ خواب جھومتے رہے
ہوا میں نیند تھی گھلی شباب جھومتے رہے
دل اپنی آگ سے نئے شرر نکالتے رہے
ہم اس پہ اپنے فلسفے کی راکھ ڈالتے رہے
جوانی ایک چھاؤں تھی گزر گئی نکل گئی،
ہمارا انتظار کرکے دوپہر بھی ڈھل گئی
بڑھی جو عمر تو خرد کا نشہ بھی سوا ہوا
بگڑ کے شوق کا مزاج طاعت خدا ہوا
دماغ تھک کے آستانۂ حرم پہ سو گیا
مگر حقیقتوں کا زندگی کی خون ہو گیا

طبیعت نیاز دناز تشنہ کام رہ گئی
وہ داستان جو بن رہی تھی ناتمام رہ گئی

غزل : جناب رآز رامپوری

رازؔ کچھ دل کی حقیقت کا نمایاں نہ ہوا،
اُن سے گلشن نہ ہوا۔ مجھ سے بیاباں نہ ہوا
عشق پر درد کی تہمت ہے ازل سے لیکن
نہ ہوا پھول وہ غنچہ جو پریشاں نہ ہوا
زندگی موت کے آغوش میں رکھدی اسنے
اور دل جینے سے اس پر بھی گریزاں نہ ہوا
پھول چاہیں بھی تو کیا کیجئے تنقید بہار
چند کانٹوں کے سوا کچھ بھی نمایاں نہ ہوا
زندگی اس نے کچھ اس طرح عطا کی مجھ کو
آج تک دل یہ سمجھتا ہے کہ احساں نہ ہوا
کس نے رکھا ہے تغیر پہ نظام فطرت
میں ہی دنیا میں اگر امن کا خواہاں نہ ہوا
کس قیامت کے مصائب میں گزاری ہو کہ دل
تجھسے شکوے کی جسارت پہ پشیماں نہ ہوا

دیکھ اسے ضبط نہ ہو اُن کے یقیں کو صدمہ
جو سمجھتے ہیں کبھی رآز پریشاں نہ ہوا

فرشتوں کی چہ میگوئیاں

(پروفیسر شور علیگ)

ایک فرشتہ:

زلزلے سُرخ، زمیں سُرخ، فضا خانہ خراب
یہ ہواؤں کا تنفس، یہ جہنم کا عذاب

لو چراغِ سحر و شام کی تھراتی ہے
زندگی خون کی چھینٹوں سے بجھی جاتی ہے

یہ مہ و سال کے آنسو یہ زمیں کا ماتم،
تابِ نظارہ نہیں جبرِ مشیت کی قسم،

ہمنشیں زیرِ فلک حشر کی رفتار تو دیکھ
وقت کی پشت پہ آلام کے انبار تو دیکھ!

ہائے جس خاک پہ صدیوں ہوں رسولوں کے نزول
آج اُسی خاک سے اُٹھتی ہے جلی لاشوں کی دھول

وہی ہیکل، وہی معبد، وہی طاعت کا نظام
دیر شرمندہ، فلک بوسس کلیسا بدنام

نہ مُناجات میں تاثیر نہ آہوں میں اثر
آنسوؤں کی کوئی قیمت نہ کراہوں میں اثر،

اس میں کیا "قادر" و "قیوم" کی رسوائی نہیں
ننگ کیا آدمی زادوں کی جبیں سائی نہیں

مرکزِ ثابت و سیار ہے قدرت کس کی
دام افگن ہے دو عالم پہ مشیت کس کی

شب کے نغمات ستاروں کا ترنم بھی گیا،
ماہ و خورشید کے ہونٹوں کا تبسم بھی گیا

کس نے سورج سے کہا ہے کہ اُجالا نہ کرے
اپنی صبحوں کو اندھیروں سے نکالا نہ کرے

دوسرا فرشتہ:

ہم نشیں کیا تجھے تسلیم کی تاکید نہیں
کفر ہے کفر مشیت کی یہ تنقید نہیں،

کون ہے دفترِ حکمت کا جلانے والا
خاک سے خون کے طوفان اُٹھانے والا

درک و عرفاں کا لہو پی گئی کس کی تلوار
کس کے معبود ہیں الماس و گہر کے انبار

کس نے دنیا کو عزا خانہ بنا رکھا ہے
طاقِ تہذیب کی شمعوں کو بجھا رکھا ہے

کس نے تاراج کیا دیر و کلیسا کا سہاگ
کس کے ہاتھوں سے لگی طاعت و تقدیس میں آگ

کس نے بیچی ہے بتا عصمتِ انجیل و زبور
غارتِ مذہب و اخلاق ہے کس کا دستور

عفتِ مریم و سارہ کے خریدار ہیں کون
ابنِ رسول کو جدا چاہیں وہ بیمار ہیں کون

کس کے ماتھے پہ ہے تہلیل و تلاوت کا شکوہ
[illegible] عرفاں و خرد کا رونق

فطرتِ اہلِ زمیں کیا تجھے معلوم نہیں — تو سمجھتا ہے یہ معصوم ہیں، معصوم نہیں،
آدمی زاد درندوں پہ ذرا غور تو کر، — دیکھ تو خاک پہ لہراتے ہیں کتنے اژدر
امتِ دیر و حرم بٹ گئی شیطانوں میں — بھیڑئے اب تو جنم لیتے ہیں انسانوں میں،
نسلِ ابلیس کی گنتی، نہ خداؤں کا شمار — الاماں فتنۂ تسبیح و فریبِ زنار !
یہی دنیا ہے تو پھر ہو کے رہے گی برہم — اپنے اوراق اُلٹ جائے گی تاریخِ امم
یہ نجاست ہے اسے خون سے دھونا ہوگا — محو اس خطۂ ناپاک کو ہونا ہوگا "

وقت کا سوگ نہ کر وقت کی آواز سمجھ
اس اندھیرے کو نئی صبح کا آغاز سمجھ!!

حدیثِ فراق

سیدہ اختر

تری فضاؤں میں اے خالقِ بہار و جمال !
یہ اک کمی سی مجھے ہو رہی ہے کیوں محسوس ؟

وہی چمن ہے وہی جلوۂ بہار ہنوز، — رفیقِ دامنِ گل ہے غریب خار ہنوز
شباب پر ہے تری بزمِ روزگار ہنوز — رواں ہے وادیِ رنگیں میں آبشار ہنوز

یہ وسعتِ جملہ مناظر — مجھے بتائے کوئی
یہ اک کمی سی مجھے ہو رہی ہے کیوں محسوس ؟

وہی فلک ہے وہی چاند اور تارے ہیں — ہر ایک ذرہ میں پوشیدہ ماہ پارے ہیں
وہی ہے بحر وہی موج اور دھارے ہیں — وہی فضا ہے وہی حسن کے نظارے ہیں

مگر یہ آج ہوا کیا مری نگاہوں کو !
یہ اک کمی سی مجھے ہو رہی ہے کیوں محسوس

اب التفات کرم بھی ہے اک ستم مجھ کو — ستا رہا ہے بہت آج اُن کا غم مجھ کو
سمجھ میں آگیا یہ رازِ کیف و کم مجھ کو — اسی لئے تو ہے ہر ہر نفس الم مجھ کو

نہ وہ یہاں ہیں، نہ ان کا پیام آتا ہے
اسی لئے مجھے ہوتی ہے یہ کمی محسوس!

مطبوعات موصولہ

تنقیدی جایزے مجموعہ ہے پروفیسر سید احتشام حسین ام۔اے کے بارہ انتقادی مقالوں کا، جن میں عنصر غالب ان مقالات کا ہے جو "ادب جدید" یا "ترقی پسند ادب" کے اغراض و مقاصد اور اُنکے موقف سے بحث کرتے ہیں۔

احتشام صاحب نے اُس دور میں ہوش سنبھالا جب قدامت ختم تو نہ ہوئی تھی لیکن "تجدد و ابداع" کے لئے بہت آہستہ آہستہ جگہ چھوڑتی جاتی تھی، اس لئے پُرانے "اقدار" ان کے ذہن میں پوری طرح مرتسم نہ ہوسکے تھے کہ "نئی آوازوں" نے انھیں اپنی طرف متوجہ کرلیا اور وہ اس برادری میں شامل ہوگئے جو ہمارے ادب کی خدمت کے لئے بڑے بڑے حوصلے اپنے دل میں رکھتی ہے اور جس کا ثبوت ہم کو احتشام صاحب کے ان مقالات سے بھی ملتا ہے۔

احتشام صاحب باوجود جوان ہونے کے بھی جوانی کا وہ جوش نہیں رکھتے جو حسن و قبح کے امتیاز سے بے نیاز ہوتا ہے، اس لئے ان کی باتیں صرف "برائے گفتن" نہیں ہوتیں اور ہمیں ان کی تحریروں میں ایک ایسا سنجیدہ ٹھراؤ، ایک ایسی غامض فکر کا پتہ چلتا ہے جو ہمارے احساس استدلال کو حرکت میں لے آتا ہے اور جس پر رائے زنی کرنے کے لئے، ہم کو کچھ سوچنے پر بھی مجبور کردیتا ہے اصولاً ادب جدید کے رجحانات کی افادیت و معقولیت سے کسی کو انکار نہیں، لیکن طریق کار و اسلوب عمل کے لحاظ سے یہ مسئلہ بڑے جھگڑے کی چیز بن گیا ہے۔ احتشام صاحب نے ان مقالات میں اسی جھگڑے کو طے کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی حد تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اس نوع کے مقالات کے علاوہ بعض مقالات اور بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں جن میں فانی، نظیر اکبرآبادی اور چکبست کی شاعری اور مثنوی سحرالبیان پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور سب اپنی اپنی جگہ نہایت اچھے ہیں، ضخامت ۔۔۳ صفحات طباعت و کتابت نہایت پاکیزہ۔ قیمت تین روپیہ بارہ آنے اور ملنے کا پتہ: ادارۂ اشاعت اُردو۔ حیدرآباد دکن۔

فن صحافت اخبار کیونکر طیار ہوتا ہے، بظاہر یہ بہت معمولی سا سوال معلوم ہوتا ہے، لیکن عملاً یہ بڑی پیچیدہ چیز ہے اخبار نویسی کے دو شعبے ہوتے ہیں، ایک تحریری، دوسرا انتظامی اور دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل چیز ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اتنے وابستہ ہیں کہ ان کی تفریق ممکن نہیں۔

اس کے مصنف چودھری رحم علی الہاشمی بی۔اے نے جو ہندوستان کے بڑے کہنہ مشق صحافی ہیں، اس کتاب
، اخبار نویسی کے اُصول وضوابط پر علمی وعملی دونوں حیثیتوں سے ایسی معلومات فراہم کردی ہیں کہ اگر واقعی ان پر عمل
جائے تو ایک اخبار کے ناکام رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ اُردو زبان میں اس موضوع پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے
ے انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی سے شایع کیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنے۔

لکھنؤ کا دبستان شاعری ڈاکٹر محمد ابواللیث صدیقی (لکچرار شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی) کا وہ مقالہ ہے جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی سند عطا کی گئی تھی۔ یہ مقالہ بڑے سائز کے ۱۲ صفحات
محیط ہے، اور چھان بین کے لحاظ سے اتنی مکمل چیز ہے کہ لکھنوی شاعری سے متعلق ہر ممکن اطلاع حاصل ہوسکتی ہے۔
یہ مقالہ دس ابواب میں منقسم ہے، پہلے باب میں مختصراً سلطنت اودھ کی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے اور دوسرے باب
، لکھنؤ کے تمدن سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں لکھنویت کی صراحت کی ہے اور چوتھے میں حکمراں شاعروں کا ذکر ہے
نچواں باب ان شعراء کے لئے وقف کیا گیا ہے جو دہلی سے ہجرت کرکے لکھنؤ آئے، اس کے بعد چھٹے، ساتویں اور آٹھویں
ب میں ناسخ، آتش اور مصحفی اور ان کے سلسلہ کے شعراء کا ذکر ہے اور نویں باب میں لکھنؤ کی مرثیہ گوئی سے بحث کی گئی
ہے۔ دسویں باب میں لکھنؤ کے آخری دور کے شعراء کا ذکر ہے جن میں سے اکثر اب بھی موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں ہر موضوع
پنی جگہ اک مستقل تصنیف چاہتا ہے، اس لئے وہ کتاب جس میں ان تمام باتوں پر یکجائی روشنی ڈالی گئی ہو، اسے یقیناً
ہم ہونا ہی چاہئے۔
ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ اس میں شک نہیں کہ بڑی محنت کا نتیجہ ہے، اور شاید اسی جستجو نے اس کو زیادہ تر تذکرہ
ا حیثیت دیدی ہے۔ کتاب کا انتقادی پہلو بھی خوب ہے لیکن شاید خوب تر نہیں۔ قیمت پانچ روپیہ اور ملنے کا پتہ:
شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ۔

سگ لیلیٰ طویل فسانہ ہے، جناب فضل حق قریشی کا لکھا ہوا۔ اس میں انھوں نے ایک کتے کی سرگزشت پیش کی ہے لیکن چونکہ وہ ایک حسین وجمیل عورت کا کتا تھا اس لئے یہ داستان دراصل سگ لیلیٰ کی نہیں بلکہ خود
لیلیٰ کی ہے۔ قریشی صاحب بڑے شوخ نگار ادیب ہیں اور انھوں نے اس فسانہ میں جس لطیف طنزیہ انداز سے سوسائٹی
کا نقشہ پیش کیا ہے، اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ یہ فسانہ اپنی زبان وانشاء اور فنی خصوصیات کے لحاظ سے بڑی
قابل قدر چیز ہے۔ اُردو نشر گاہ دہلی نے اسے بڑے اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

میر صاحب مجموعہ ہے عادل رشید صاحب کے ان مضامین کا جو میر صاحب کا ایک فرضی کیرکٹر سامنے رکھکر انھوں نے مختلف اوقات میں لکھے تھے۔ ان میں انھوں نے زیادہ تر فلمی دنیا کو پیش کیا ہے اور وہیں کا
ماحول انکا موضوع سخن ہے۔ جیسا کہ خود انھوں نے شروع میں ظاہر کیا ہے، یہ کتاب چونکہ خالص تفریح کی چیز ہے اور

اُن فوجی سپاہیوں کے لئے لکھی گئی ہے جن کو صرف تفریح ہی کی ضرورت ہے اس لئے اس خیال سے ہٹ کر اس پر تبصرہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ اس بات کی ضرورت کہ کوشش کر کے اسے "قدر اول" کی کتابوں میں شامل کیا جائے
قیمت تین روپیہ ۔ ملنے کا پتہ : مکتبۂ سلطانی بمبئی (۴)

اوراقِ گل

کچھ عرصہ ہوا رامپور میں ایک مجلس "بزم سخن" کے نام سے قائم ہوئی تھی جس کی حیثیت ایک "نیم سرکاری" ادارہ کی سی تھی ۔ اس مجلس نے دو سال کے اندر متعدد مشاعرے برپا کئے اور ملک کے اچھے اچھے شعراء نے ان میں شرکت کی ۔ یہ مجموعہ انھیں شعراء کے منتخب کلام کا ہے جسے نہایت اہتمام کے ساتھ جناب ضمیر احمد صاحب ہاشمی ڈپٹی ریونیو منسٹر رامپور نے (حسب الحکم فرمانروائے رامپور) آرٹ پیپر پر شایع کیا ہے ۔

شعراء کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے چند کے ہندوستان کے سبھی مشہور شعراء نے بزم سخن میں حصہ لیا تھا اور اس لئے یہ مجموعہ ایک ایسے تذکرہ کی حیثیت رکھتا ہے جو واقعی دربار رامپور کی ادبی روایات کے شایان شان ہے ۔ انتخاب کے ساتھ ہر شاعر کے حالات بھی مع اس کی تصویر کے دئے گئے ہیں اور اس کے سوا خط کا فوٹو بھی شامل کر دیا گیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان گراں تر خصوصیات کو سامنے رکھ کر کوئی تذکرہ شایع کرنا ممکن نہ تھا جب تک کسی فرمانروا کا فضل شامل حال نہ ہوتا اور ملک کو موجودہ فرمانروائے رامپور کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ان کی عنایت سے یہ چیز اس کے ہاتھ آئی ۔

اس مجموعہ کے حصۂ نظم کا آغاز فرمانروائے رامپور کی ایک منقبت سے ہوتا ہے جو ہندی زبان، یمن کلیان راگ اور کہروا تال میں لکھی گئی ہے ۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ منقبت کی چیز، کسی مخصوص راگ یا تال سے متعلق ہونے کے بعد عقیدت و فن کے اس امتزاج کی متحمل ہو سکتی ہے یا نہیں ۔ لیکن یوں بھی اس نظم کو اس مجموعہ سے علیحدہ رکھنا چاہئے تھا

یہ نظم اس قابل تھی کہ جب تاجدار شعراء کا تذکرہ مرتب ہوتا تو حضور نظام کے فارسی منظومات کے ساتھ ساتھ فرمانروائے رامپور کا یہ ہندی کلام بھی پیش کیا جاتا تاکہ ایران و ہندوستان دونوں ملکوں کی شاعری کی نیابت شاہانہ طریقہ سے ہو جاتی ۔

یہ کتاب چونکہ "سلسلۂ مطبوعات کتب خانۂ رامپور" سے تعلق رکھتی ہے، اس لئے کتب خانۂ رامپور ہی بتا سکتا ہے کہ کیونکر مل سکتی ہے ۔

ٹوٹے ہوئے دل

جناب رام پرتاب بہادر سکسینہ کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ ہے، جو پہلے ہندی میں شایع ہوئے تھے اور اب اردو رسم خط میں شایع کئے گئے ہیں ۔ افسانوں کی زبان ہندی زبان کے شعبہ الفاظ کا اُسے غیر مانوس الفاظ سے گرانبار نہ کیا جائے، بہت موزوں ہے اور زبان کی سادگی اندازِ ادا جذبات کو سادہ کچھ

کے ساتھ ظاہر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن اُردو میں ان افسانوں کی زبان ہمیں کچھ مختلف نظر آتی ہے۔ فسانے بہت دلچسپ ہیں اور پلاٹ، کردار و زبان ہر اعتبار سے مطالعہ کے قابل۔ مقدمہ میں فسانہ نگار نے اُردو ہندی زبان کے متعلق بھی بہت نتیجہ خیز گفتگو کی ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: اسرار کریمی پریس الہ آباد۔

بچوں کی نفسیات بچوں کی نفسیات دانی بڑی ضروری چیز ہے اور ہمارے یہاں بدقسمتی سے اسی موضوع پر کتابوں کا فقدان ہے۔ اس لئے شیر محمد صاحب اختر کی یہ تصنیف بڑی برمحل چیز ہے اور ہر شخص کے مطالعہ کے قابل۔ اس میں عہد شیرخوارگی سے لیکر عنفوان شباب تک بچوں کی زندگی کے ہر پہلو کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے نمایاں کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کی تربیت میں کن کن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ زبان بھی بہت سادہ وسلیس ہے اور طباعت و کتابت نہایت پاکیزہ و نفیس۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ: ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن۔

ذکر جمیل جناب ماہر القادری کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے جس میں غزلیں کم اور نظمیں زیادہ ہیں۔ وہ زمانہ تو خیر ختم ہو گیا جب "نعت گو" شاعر کچھ کمتر سمجھا جاتا تھا لیکن یہ احتیاط اب بھی بہت کم کی جاتی ہے کہ اعتقادی نظموں میں قصیدہ گوئی اور بیجا جذباتیت اور غلو سے کام نہ لیا جائے۔ ماہر صاحب کے مقدمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ سے غیر معمولی شغف رکھتے ہیں اور محبت میں انسان بہت سی باتیں ایسی بھی کہہ جاتا ہے جو "درخور نکتہ" نہیں ہوتیں۔ اس لئے ان سے یہ امید تو نہیں ہو سکتی کہ انھوں نے جا بجا منصب نبوت پیش کرنے میں کیوں اس قدر غلو سے محبت سے کام لیا کہ اہل نظر اس کو دیکھ کر "خفض بصر" سے کام لیں، لیکن ان سے یہ مطالبہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ نعت کی باتوں میں انھوں نے اپنے جذبۂ افتخار کو کیوں شامل کیا۔ ہر چند مقدمہ میں بظاہر انھوں نے صرف اپنی محبت ہی کا ذکر کیا ہے، لیکن جا بجا فخریہ اشعار[1] کا استعمال اور رخ رخ کا تمنع غمازی کر رہا ہے کہ اصل مقصود کچھ اور ہے۔

انھوں نے اسی جذبہ کی تکمیل کے لئے سب سے پہلی نظم فارسی زبان میں لکھی ہے، جو نہ ان کی زبان ہے اور نہ جسمیں انھیں ملکہ شعری حاصل ہے۔ ایک فارسی نظم "پیغمبر" کے عنوان سے اور بھی انھوں نے لکھی ہے، جس میں مرد مومن کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ دونوں نظمیں ان کی بہت گری ہوئی ہیں اور متعدد نقائص رکھتی ہیں۔

اُردو کی نظمیں غنیمت ہیں، لیکن مجھے ان کے کسی ایک شعر میں بھی وہ عاشقانہ کیفیت نظر نہیں آتی جو شہیدی کے

---

[1] صفحہ ۱۹ پر جو فارسی شعر مصنف نے نقل کیا ہے اس کا دوسرا مصرعہ "پنہاں است و چنان نیست" نہیں بلکہ "پیداں ست و چنان نیست" ہے

کلام میں پائی جاتی ہے اور نہ فن کی وہ خوبیاں جو محسن کاکوروی کے مجموعۂ نعت میں نظر آتی ہیں۔

ماہر صاحب کا دعویٰ تو یہ ہے کہ انھوں نے محض محبت کے جذبہ سے متاثر ہو کر یہ سب کچھ کہا ہے لیکن کلام کا رنگ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ اقبال کے ناقص تتبع سے زیادہ نہیں۔ سیرت نبوی سے متعلق بعض واقعات کا ذکر بھی کافی احتیاط سے نہیں کیا گیا۔ ماہر صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انھیں اپنے نعتیہ کلام سے اپنا فاسقانہ شاعری کا کفارہ دینا ہے، اسلئے اگر انھوں نے اپنی فاسقانہ شاعری سے توبہ نہیں کی ہے تو ہم کو کفارہ [illegible] کے بعد [illegible] کا بھی انتظار کرنا چاہئے اور ہو سکتا ہے کہ اداے کفارہ [illegible] زیادہ [illegible] صورت میں پیش کر سکے۔ لکھائی چھپائی البتہ نہایت پاکیزہ ہے۔ قیمت ایک [illegible] نفیس اکاڈمی [illegible]

آثارِ اقبال

اقبال پر اس وقت تک متعدد کتابیں [illegible] کو ایک جگہ شائع کرنا سب سے پہلی کوشش ہے [illegible] کتاب [illegible]

اس مجموعہ میں اقبال کے متفرق [illegible] نکلے ہیں اور جس وقت ہم ان پر نگاہ ڈالتے ہیں تو بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب [illegible] اقبال [illegible] جامع چیز نظر آتی ہے۔

اقبال کے حالات، ان کے افکار، ان کی فلسفیانہ [illegible] سب کچھ اس کتاب میں موجود ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ طلبہ جو اقبال کا [illegible] کتاب سے کافی مستفید ہو سکتے ہیں۔

طباعت و کتابت نہایت [illegible]

روس کا ادب

دنیا کے ادبی [illegible] روس کا [illegible] دلچسپیاں [illegible] دونوں کی زندگی [illegible] صاحب کی یہ تصنیف بہت برمحل چیز ہے۔

فاضل مصنف نے [illegible] پہلے [illegible] روسی ادب [illegible] پشکن، چیخوف [illegible] وغیرہ متعدد شعرا اور [illegible] حکایتوں اور ڈراموں [illegible] کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ اس اہتمام و ترتیب سے کیا گیا ہے کہ [illegible] روسی ادب [illegible] واقف ہو جاتے ہیں۔

پروفیسر صاحب اپنے طرزِ ادا اور [illegible] کافی شہرت رکھتے ہیں، اس لئے یہ کتاب تاریخی افادیت کے علاوہ ادبی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ [illegible] اضافہ کیا ہے اس کا ذکر غالباً آیندہ ایڈیشنوں میں کیا جائے گا۔ کتابت و طباعت وغیرہ نہایت نفیس ہے اور ضخامت ۱۸۳ صفحات۔ قیمت درج نہیں ہے۔ دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) [illegible] سے طلب کیجئے۔

کیفیات

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوآنہ کی تازہ نظموں کا مجموعہ ہے (جن کو سرورق پر غزلیات ظاہر کیا گیا ہے) ڈاکٹر دیوآنہ، نہ نئے ادیب ہیں نہ نئے شاعر، لیکن وہ شاید ہمیشہ نئے رہیں گے۔ انھوں نے اپنی غزلوں اور نظموں میں کبھی قدامت کی پیروی نہیں کی اور ہمیشہ وہی کہا جو انھوں نے دیکھا اور سمجھا، اسی لئے انکا اندازِ بیان انھیں کا ہے۔

ان کی شاعری اسی زمانہ اور اسی دنیا کی پیداوار ہے، اسلئے وہ اسی زمانہ اور اسی دنیا کی شاعری کرتے ہیں اور چونکہ رسمی واہ واہ حاصل کرنا ان کا مقصود نہیں، اس لئے وہ رسمی آہ آہ بھی نہیں کرتے۔ وہ کام کی باتیں کام والوں ہی کی زبان میں ظاہر کرتے ہیں، اس لئے کوئی خاص فنی دلکشی تو ان کے کلام میں نہیں ہے، بلکہ زبان و بیان کے نقایص بھی اس میں پائے جاتے ہیں، لیکن اک نوع کی گہرائی ضرور ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھ کو خدا نے دی تھی بہا، آفریں نظر — تو نے نظر کو بیچ دیا برگ و گل کے ہاتھ

کرے گا درد کا اپنے علاج تا بہ کجا، — جو بے نیازی درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ: آتما رام اینڈ سنز - انارکلی - لاہور -

گاؤں سدھار گیت

یہ مختصر سا مجموعہ ان نظموں کا ہے جو گاؤں سدھار کی غرض سے ماسٹر محمد شفیع نیر نے لکھی ہیں۔ ابتدا میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا "تعارف" بھی شامل ہے جس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ جن صوبوں میں گاؤں سدھار کا کام ہو رہا ہے وہاں ان گیتوں سے بہت مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ گیت اپنی زبان اور اپنے مفہوم دونوں حیثیتوں سے دلچسپ بھی ہیں اور کارآمد بھی۔

قیمت ۸ آنے - ملنے کا پتہ: آزاد بک ڈپو - کوچہ چیلان - دہلی

ہندوستان کی آبادی

ڈاکٹر ایم اقبال قریشی، حیدرآباد میں ماہر معاشیات کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں، اور یہ کتاب انھیں کی لکھی ہوئی ہے۔ معاشیات کے بنیادی مسائل میں ایک مسئلہ آبادی کا بھی ہے، جس کے متعلق ماہرین فن نے متعدد نظریے قائم کئے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہماری زبان میں اس طرح کی کوئی قابل اعتنا ولٹریچر اس موضوع پر شائع نہ ہوا تھا۔ ہمیں بڑی مسرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ اس میں آبادی کے قدیم نظریوں کے ساتھ ساتھ ماتھس کے مشہور نظریہ کو بھی پیش کیا ہے اور اس سلسلہ میں ہندوستان کی آبادی کی ... کتاب بہت مفید ہے اور ہر اس شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے جو ہندوستان کے معاشی مسائل سے دلچسپی رکھتا ہے۔

قیمت تین روپیہ - ملنے کا پتہ: ادارہ معاشیات - ڈاکٹر منزل - حمایت نگر - حیدرآباد دکن

اسلام اور سود

یہ کتاب بھی ڈاکٹر انور اقبال قریشی کی لکھی ہوئی ہے۔ اور اپنے موضوع کے لحاظ سے بڑی جامع و مانع چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مغرب و تعلیم مغرب نے سود کے کاروبار کو اتنا عام کر دیا ہے کہ اب اس کے مذموم پہلو کی طرف لوگوں کی نگاہ بھی نہیں جاتی، تاہم بعض غایر نظر رکھنے والے سمجھتے ہیں کہ دنیا کی تباہی کا بڑا سبب سود ہی ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر سے گفتگو کی ہے، بلکہ معاشیاتی حیثیت سے بھی اس کی مضرتوں کو ثابت کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر یہ کتاب اپنی نوعیت کی بالکل پہلی چیز ہے اور اس کے مطالعہ سے ہمارے بہت سے ایسے مغالطے دور ہو جاتے ہیں، جو سود کے جواز کے متعلق ہمارے کاروبار تجارت نے پیدا کر رکھے ہیں۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ: ادارۂ معاشیات۔ فاطمہ منزل، حمایت نگر حیدر آباد۔

نئی دُنیا

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کی ان نظموں کا مجموعہ ہے، جو بالکل نئی شاعری سے متعلق رکھتی ہیں، خیالات و ٹکنک دونوں حیثیتوں سے ــــ نظمیں مختلف جذبات کا نتیجہ ہیں اور ان میں، مذہب، ملک، قوم، معاشرت، سیاست و اخلاق وغیرہ بہت سی چیزوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

اس وقت بعض ترقی پسند شعراء کا نصب العین شعر کہنا نہیں، بلکہ ایسی زبان میں باتیں کرنا ہے جسے ہم نہ نثر کہہ سکتے ہیں، نہ نظم اور یہی خصوصیت جناب دیوانہ کی بھی اکثر نظموں میں پائی جاتی ہے۔ خیالات اچھے ہوں تو قدرتاً جی چاہتا ہے کہ وہ اچھے ہی اسلوب سے پیش بھی کئے جائیں، لیکن اگر ہم میں سے بعض کا جی ایسا نہیں چاہتا، تو کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ گدڑی میں کبھی کبھی لال بھی مل جاتا ہے، لیکن آج کل زمانہ اتنی فرصت کب دیتا ہے کہ تمام گدڑیوں کے ایک ایک ٹانکے کو دیکھ کر لعل ڈھونڈھا جائے، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ اس کے ملنے کی کوئی توقع بھی میسر نہ ہو۔ یہ کتاب آتما رام اینڈ سنز، انارکلی، لاہور سے مل سکتی ہے۔

دیوان تاباں

میر عبدالحی تاباں دہلوی، دور محمد شاہ کے نہایت خوشگو شاعر تھے۔ لیکن ان کا دیوان بہت کمیاب تھا۔ انجمن ترقی اردو نے اس کے متعدد قلمی نسخے فراہم کرکے اس کو شائع میں طبع کرایا اور یہی نسخہ اس وقت میرے سامنے ہے۔

ابتدا میں مولانا عبدالحق صاحب کا مختصر سا دیباچہ بھی شامل ہے، جس میں تاباں کے تلمذ اور رنگ سخن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

انتخاب جدید

شعراء عہد حاضر کے کلام کا انتخاب ہے جسے عزیز احمد صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ اور آل احمد سرور پروفیسر مسلم یونیورسٹی نے مرتب کیا ہے۔

اس مجموعہ میں ردیف وار اقبال سے لیکر یگانہ تک ۵۱ شعراء کے کلام کا انتخاب پایا جاتا ہے، انتخاب

چھاپا ہے اور شروع میں ان دونوں حضرات کا مقدمہ اس سے بھی اچھا۔ جلیل، صفی، وحشت اور نوح کا نام البتہ نظر نہیں آیا، حالانکہ ان کے رنگ کے دوسرے ہمعصر شعراء کا کلام موجود ہے۔ قیمت ۸/عہ۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

گلِ عجائب — تذکرہ ہے، تمنا اورنگ آبادی کا لکھا ہوا، جو اب سے تقریباً پونے دو سو سال قبل مرتب ہوا تھا تذکرہ کی حیثیت سے گو یہ خاص چیز نہ ہو لیکن ایک قدیم و نادر مخطوطہ ہونے کی حیثیت سے یقیناً قابلِ قدر ہے۔ کتاب خانۂ آصفیہ کے ایک بوسیدہ نسخہ سے اس کو بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔

سیدہ کی بیٹی — سیرت ہے بی بی زینب کی جسے جناب ازرق الخیری صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اردو میں اس موضوع پر اتنی تفصیل و تحقیق کے ساتھ غالباً یہ بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت دو روپیہ۔

ملنے کا پتہ: عصمت بک ڈپو۔ دہلی۔

لالۂ خودرو — ایک اٹھارہ سال کی نوجوان خاتون سیدہ برجیس جو نازش کی چند غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے جسے مرنے والی کی یادگار کے طور پر شایع کیا گیا ہے۔ ابتدا میں سید صفی حیدر صاحب دانش نے اپنے مقدمہ میں مرحومہ کے ذوقِ علم و ادب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کو پڑھکر بہت افسوس ہوتا ہے کہ یہ خوش رنگ کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی۔

مرحومہ خاتون اپنے باپ ڈاکٹر سید ریاض الحسن صاحب کی تنہا صاحبزادی تھیں اور فطرت کی طرف سے بڑا پاکیزہ ذوقِ علم و ادب لیکر آئی تھیں۔ کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر قدرت کچھ دن اور مہلت دیتی تو یہ واقعی ہمارے لئے وجہ نازش ثابت ہوتیں۔ یہ نسخہ سید شاہد جعفر الحسن صاحب بیرسٹر انسٹیٹیوٹ روڈ [illegible] سے مل سکتا ہے۔

[illegible] — مجموعہ ہے [illegible] کے ۱۷ افسانوں کا۔ اس سے قبل ان کے افسانوں اور ادبی مقالات کے متعدد مجموعے شایع ہو چکے ہیں اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ وہ اس سلسلہ میں ان کی ادبی خدمات بڑا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کا طرز تحریر [illegible] دلکش ہوتا ہے اور انشاء لطیف سے ان کو خاص شغف ہے۔ اول اول انکے مقالات زیادہ تر [illegible] رنگ کے ہوتے تھے لیکن اب انھوں نے افسانوی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ حجم ۲۰۹ صفحات قیمت مجلد دو روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: دار الاشاعت انجمن ترقی اردو، کراچی۔

شمس بازغہ — [illegible] کے مختلف پہلوؤں کو [illegible] انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں ایک باب کربلا [illegible] کے متعلق بھی ہے [illegible] جو [illegible] صورت میں نگار کے صفحات پر شائع ہو چکا ہے۔

قیمت [illegible] روپیہ۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔

زارینہ داستان ہے اس ملکۂ روس کی جس نے راسپوٹین سے مل کر حکومت زار کو تہ و بالا کر دیا تھا چونکہ اس ملکہ کی زندگی، انقلاب روس سے خاص تعلق رکھتی ہے، اس لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ محمد رحیم صاحب دہلوی اس کے مصنف ہیں اور نیا کتاب گھر اردو بازار دہلی نے اسے شایع کیا ہے۔ قیمت دو روپیہ ہے۔

زہراب ترجمہ ہے ہمنگ وے کے مشہور ناول کا جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک شخص نے ہیروئن سے بدمست ہوکر کس طرح اپنی بیوی کو عزت فروشی پر مجبور کیا۔ قصہ بہت دلچسپ اور عبرت انگیز ہے۔ محمود احمد خاں ام۔ اے نے اس کا ترجمہ کیا ہے اور خوب ہے۔

قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ : خاتون کتاب گھر، اردو بازار - دہلی۔

زرد چہرے مجموعہ ہے ابراہیم جلیس بی۔ اے کے پندرہ افسانوں کا جنھیں ہم افسانہ صرف اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ ان میں کچھ نہ کچھ افسانوی پلاٹ ملتا ہے، ورنہ در حقیقت یہ اقتصادی نقشے یا خاکے ہیں جن میں خاص طنزیہ انداز سے انھوں نے ہماری سوسائٹی کے اس تاریک رخ کو پیش کیا ہے جس کی ذمہ داری کو ہماری سوسائٹی بہت کم محسوس کرتی ہے۔

اس وقت افلاس اور افلاس کی وجہ سے ملک کی بگڑی ہوئی اخلاقی حالت پر ہمارے اکثر شعراء و ادباء قلم اٹھا رہے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بعض کو اس فرض کے ادا کرنے میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ انھیں میں ایک ابراہیم جلیس بھی ہیں — ان کی مزاحیہ تعبیریں، اور طنزیہ اشارے بہت لطف دیتے ہیں۔

قیمت دو روپیہ چار آنے اور ملنے کا پتہ : اردو مجلس معظم جاہی مارکیٹ حیدر آباد دکن

روسی ظرافت جناب مسلم ضیائی نے روس کے مشہور مزاحیہ روسی افسانوں کا ترجمہ اس مجموعہ میں پیش کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض افسانے نہایت پر لطف ہیں۔

ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے جس میں مزاح و ظرافت کی روح کو پوری طرح قایم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے

قیمت دو روپیہ چار آنے۔ ملنے کا پتہ : اردو محل۔ معظم جاہی مارکیٹ حیدر آباد دکن۔

ہندوستان کی معاشی ترقی کا لائحۂ عمل جنگ کے بعد معاشی نشو و نما کا سوال اس وقت اکابر قوم کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اور اس سلسلہ میں بمبئی کی وہ اسکیم جو سات آٹھ ماہرین معاشیات نے مرتب کی ہے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس اسکیم کے پہلے حصہ کا ترجمہ ادارۂ معاشیات کی طرف سے پہلے شایع ہو چکا تھا۔ اب اس نے یہ دوسرا حصہ شایع کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی کتابوں کا ترجمہ بہت مشکل ہے لیکن ادارہ نے اس فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا ہے۔ ترجمہ جناب ... نے کیا ہے اور ادارۂ معاشیات حیدر آباد دکن نے اسے شایع کیا ہے - قیمت بارہ آنے۔

انتقادیات میں کیا ہے؟

فہرست ملاحظہ ہو

حصۂ اول

حصۂ دوم

"نگار" بک ایجنسی لکھنؤ

"نگار" کے خاص نمبر

"نگار" بک ایجنسی لکھنؤ

جنوری ۳۹ء

(مصحفی نمبر)

اسکے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیات مصحفی۔ اردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ وغیر مطبوعہ۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جنوری ۴۰ء

(نظیر نمبر)

اسکے بعض عنوانات یہ ہیں:- نظیر کا مسلک۔ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب کلام مطبوعہ وغیر مطبوعہ

قیمت دو روپے

علاوہ محصول

جنوری ۴۱ء

یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اسوقت کے تمام مشہور غزلگو شعرا نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔

قیمت تین روپے

علاوہ محصول

جنوری ۴۲ء

اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ئہ میں شایع ہوا تھا

قیمت دو روپے

علاوہ محصول

جنوری ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۲۰۰ روپیہ	[illegible]	[illegible]	۵۰ روپیہ
نصف صفحہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۳۰ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۱۰۰ روپیہ	[illegible]	[illegible]	۱۵ روپیہ

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجیے۔ "منیجر"

جنوری ۴۴ء

(جدید شاعری نمبر)

اس میں بتایا گیا ہے کہ جدید رجحانات شعری کی کیا حقیقت ہے اور آزاد نظم نگاری کا وزن و قافیہ سے بے نیاز ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے۔

قیمت دو روپے علاوہ محصول

جنوری ۴۵ء

(قرآن نمبر)

اس میں ڈاکٹر ٹسڈل کے اُن تمام اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں حضرت نیاز کے نفد اور استدراک کے ساتھ۔

قیمت دو روپے

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ

ششماہی جاری نہیں ہو سکتا

سالانہ بیرون ہند دس روپیہ

نوٹ: رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہے ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ بعد کو [illegible] فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔ "منیجر"

حصول جواب کے لیے ٹکٹ آنا ضروری ہے خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔

رجسٹرڈ نمبر ل ۶۶۴

Syed Mohsi

June 55

شمارہ ۱۹

قیمت فی کاپی ۸ر

"نگار" بک ایجنسی لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

"نگار" بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں زبان و بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشا لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصہ اول

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو ادبی نگارش، سلاست بیان، شگفتگی اور لطف ادا کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل نئی چیز ہیں اور جن کے ... خطوط ... ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز (حصہ دوم)

یہ حصہ پہلے حصہ سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں اکثر مکاتیب نقادی حیثیت رکھتے ہیں وہ حضرات جنھیں شعر و شاعری سے دلچسپی ہے خصوصیت سے ان مکاتیب میں بہت عجیب و غریب نکات شعری نظر آئیں گے رنگین تحریر اور اسلوب ادا کی دلکشی کا ذکر فضول ہے کیونکہ حضرت نیاز کی یہ خصوصیت ہر شخص پر ظاہر ہے۔

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان، تخئیل، اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے

ترغیبات جنسی (یا)

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ مختلف تبصرہ کیا گیا ہے ... بتایا گیا ہے ... میں کب اور کس طرح ... مذاہب عالم ... کتاب مرتب ... الٰہیات نظر ...

مجموعہ استفسار و جواب (۳ جلد)

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کا جو حصہ وصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور ... مذہبی ... انکی نسبت ... ماہنگار ... کی ہے

آیندہ جولائی کا "نگار" زیادہ ضخیم ہوگا

اور اس میں دو نہایت اہم مضامین اڈیٹر نگار کے قلم سے شائع ہوں گے

۱ — ڈاکٹر ٹسڈل کے ماخذ القرآن پر اصولی گفتگو ———

۲ — مذہب میں شہوانیات کا عنصر (تاریخی و علمی نقطہ نظر سے):

علاوہ ان مضامین کے "سن فرانسسکو" کی کانفرنس پر بھی تبصرہ کیا جائے گا

نگار

مدیر اعلیٰ
نیاز فتحپوری

ادارہ معاونت: اخوند فیض محمد فاروقی
مجید نیازی - شوکت جہاں

| شمار ۶ | فہرست مضامین جون سنہ ۴۵ء | جلد ۴۷ |

ملاحظات

افسانہ از افسانہ می خیزد اس بڑی لڑائی کی وہ آگ جو یوروپ میں لگی تھی، آخر کار بجھی، لیکن اس پانچ سال، سات مہینے اور سات دن کے اندر وہ دنیا کو جتنا تباہ کرگئی، اس کا اندازہ مادی و غیر مادی، دونوں حیثیتوں سے مشکل ہے۔ اس موضوع پر کتابیں لکھی جائیں گی، نقوش و تصاویر کے ذریعہ سے اسے سمجھایا جائے گا، لیکن اس حقیقی سبب کو غالباً کبھی زبان پر نہ لایا جائے گا جس نے یہ آگ دنیا میں لگائی اور جو آیندہ بھی برابر اس کو مشتعل کرتی رہے گی۔

لڑنے والی قومیں ہمیشہ یہی کہتی ہیں کہ ان کا مقصود لڑائیوں سے امن کرلینا ہے، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہ امن کبھی حاصل نہیں ہوا اور نہ شاید آیندہ عرصہ تک حاصل ہو۔ ایک زمانہ تھا جب انسان صرف زندہ رہنا چاہتا تھا اور محض بقاء حیات کے لئے وہ گوشت و استخواں کے ٹکڑوں، درختوں کے پھلوں اور ایک ایک چشمہ آب کے لئے ایک دوسرے کا خون بہاتا تھا۔ اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب انسان نے مذہب کو پیدا کیا اور خدا کو خوش کرنے کے لئے وہ اپنے ابناء جنس کو صد درجہ بے رحمی کے ساتھ ہلاک کرتا رہا اور۔۔۔ ابھی یہ عہد جہل و تاریکی پوری طرح ختم نہ ہوا تھا کہ موجودہ تہذیب و تمدن کا دور شروع ہوا۔۔۔ فضل و کمال کا دور، علم و فراست کا دور، ذہنی عروج و ارتقاء کا دور۔۔۔ لیکن یہ نوع انسانی کی تباہی کے لئے مذہب سے زیادہ مہلک چیز اپنے ساتھ لایا جس کا نام "قومیت" ہے۔

یہی وہ "قومیت" تھی جس نے جرمنی میں ہٹلر کو اور اٹلی میں مسولینی کو پیدا کیا اور یہی وہ بلا ہے جو جاپان پر مسلط ہے اور اگر سان فرانسسکو کی کانفرنس کوئی بین الاقوامی امن و سکون کی صورت پیدا کرنے میں ناکام رہی اور تیسری جنگ شروع ہوئی، تو یہ بھی نتیجہ اسی "قومیت" کا ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں مختلف قومیں آباد ہیں اور ہر اس حصۂ زمین میں جہاں کسی قوم کی اکثریت پائی جاتی ہے اسی کی حکومت ہونا چاہئے اور اسی اصول کو سامنے رکھ کر سن فرانسسکو میں کرۂ ارض کو امن و نجات کا پیغام دیا جانا تجویز ہوا ہے، جسے اٹلانٹک چارٹر اور تصفیۂ ڈمبارٹن اوکس بھی کہتے ہیں، لیکن کیا یہ اصطلاح کامیاب ثابت ہوگا، کیا اب دنیا انسانی درندوں کے وجود سے پاک ہو جائے گی، اور کیا اب دنیا میں شانتی ہی شانتی نظر آئے گی

ایں سخن را چہ جواب ست تو ہم میدانی!

حکومت کے نظرئے اس وقت تک متعدد پیش کئے جا چکے ہیں، اور بار بار کی یہ کوشش ہی ثبوت ہے اس امر کا کہ ابتک کوئی نظریہ صحیح معنی میں کامیاب نہیں ہوا۔ اول اول دنیا میں بطریقی حکومت قائم ہوئی۔ جس کا ارتقار

ملوکیت تھا، اور اب بھی دنیا کے بعض حصوں میں کہیں اپنے اصلی روپ میں اور کہیں انتقرالی (حکومت امراء) صورت میں) یہ لعنت باقی ہے، لیکن زبانی اور شاید اصولاً بھی اب سب نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس ملوکیت کو ختم ہو جانا چاہئے چنانچہ اس کی جگہ اکثر ممالک میں دیمقراطی (ڈیماکریٹک) حکومت نے لی ہے جس کو اصطلاحی زبان میں جمہوریت کہتے ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی جمہوریتیں بھی اسوقت تک دنیا کے اضطراب کو دور نہیں کر سکیں اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہی جبر و استبداد جو پہلے کلیسائی یا مذہبی اور بعد کو شخصی حکومتوں میں پایا جاتا تھا، اب جمہوریت و قومیت کے نام سے روا رکھا جاتا ہے اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ اگر دور ملوکیت میں ملک کی دولت پر صرف ایک شخص کا اختیار ہوتا تھا، تو اب امراء و اعیان کی مخصوص جماعت اس پر قابض ہے، پہلے انسان ایک شخص کا غلام تھا اور اب اسے خراج غلامی پوری جماعت کو ادا کرنا پڑتا ہے ۔ پہلے اگر اس کا خون صرف ایک شخص کے قصر و ایوان کی زیبائش میں صرف ہوتا تھا، تو اب وہ ایک سے زائد افراد کے اسباب عیش و تنعم کی فراہمی میں صرف ہوتا ہے۔ قومیت کا جذبہ فی نفسہ بُرا نہیں، اگر واقعی وہ بلا فرق و امتیاز قوم کے تمام افراد کی اصلاح و ترقی کا ضامن ہو، لیکن اگر اس سے یہ مقصود پورا نہیں ہوتا اور اس جذبہ کو صرف اس لئے پیدا کیا جاتا ہے کہ دوسری قوموں کے حقوق چھینے جائیں اس سے ہڑپ کیا جائے تو قومیت سے زیادہ بڑی لعنت دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتی ۔

یہی وہ تلخ حقیقت تھی جس نے لوگوں کو جمہوریت کی طرف سے بدگمان بنا دیا اور آخرکار انسانی بیزاری اشتراکیت اشتمالیت اور عدمیت کی صورت میں رونما ہوئی ۔

جنوری سنہ ۴۶ء کا سالنامہ

اپنی نوعیت کے لحاظ سے خاص چیز ہوگا

اس کی تفصیل

آئندہ اشاعت میں ملاحظہ ہو

پچھلی جنگ کے بعد جب روس میں اشتراکیت و اشتمالیت کا تجربہ شروع ہوا تو جمہوریتوں نے اسے نہ صرف شک و شبہ بلکہ مخالفانہ نگاہ سے دیکھا اور بالشیوزم کے خلاف ایک عام پروپاگنڈا شروع کیا گیا کہ وہ مذہب کی دشمن اور اخلاق و تہذیب کو تباہ کرنے والی ہے اور جب باوجود اس پروپاگنڈا کے بھی اس کے جراثیم یورپ میں پھیلتے نظر آئے تو اندرونی طور پر بالشویزم کو فنا کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں، اور انھیں تدبیروں میں سے ایک تدبیر یہ تھی کہ جرمنی کو پوری طرح مسلح ہوتے رہنے کا موقعہ دیا گیا تاکہ وہ روس کی اشتراکیت اور یورپ کی جمہوریت کے درمیان ایک مضبوط حد فاصل بن جائے اور ضرورت کے وقت اسے اشتراکیت سے ٹکرا دیا جائے، لیکن یہ خبر نہ تھی کہ جرمنی مسلح ہو کر پہلے خود دوستوں ہی کو اپنا شکار بنائے گا اور ایک وقت ایسا آئے گا جب جمہوریتوں کو خود اشتراکیت ہی سے ملکر جرمنی کی مسلح نازیت کا مقابلہ

کرنا پڑے گا۔

اس لڑائی میں جرمنی نے روس پر کیوں دفعتاً حملہ کیا، اس کے اور اسباب جو کچھ بھی رہے ہوں، لیکن ایک بات بالکل یقینی ہے اور وہ یہ کہ روس کی قوت اور بالشیوزم کی مقبولیت دونوں کا جرمنی نے بالکل غلط اندازہ کیا۔ فن لینڈ میں روسی فوجوں کی کمزوری سے جرمنی کو یہ نتیجہ کا موقعہ ملا کہ نہ سرخ افواج اس قابل ہیں کہ اس کی قوت کا مقابلہ کر سکیں اور نہ روس کا ملک بالشیوک حکومت سے خوش ہے، اس لئے حملہ ہوتے ہی سارا ملک بالشیوک حکومت کا ساتھ چھوڑ دے گا اور اس کے فسون قاہرہ نہایت آسانی کے ساتھ اشتراکیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں گے۔ یہ مغالطہ جرمنی کے علاوہ شاید یورپ کی اور بڑی بڑی حکومتوں کو بھی رہا ہوگا، لیکن جب امتحان کا وقت آیا تو پتہ چلا کہ ممکن ہے روسی عساکر بھی اتنی ہی طیار ہیں جتنی جرمن افواج، اور ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کرنا پڑا کہ روسی آبادی بالشیوزم کے اصول حکومت کو اپنے لئے رحمت سمجھتی ہے اور اس طرح اس جنگ سے اگر کوئی فایدہ دُنیا کو پہونچے یا نہ پہونچے لیکن یہ فایدہ ضرور ہوگا کہ اشتراکیت کی حقیقت ساری دُنیا پر بے نقاب ہو گئی۔

میں اس وقت نہ اشتراکیت کے اصول کو پیش کرنا چاہتا ہوں اور نہ یہ کہنے کے لئے آمادہ ہوں کہ وہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے ہر ملک کے لئے یکساں طور پر مفید ثابت ہو سکتی ہے، لیکن جس حد تک دُنیا کے مستقبل اور اس کے نظام جدید کا اصول تعلق ہے، یہ ظاہر کرنے میں مجھے تامل نہ کرنا چاہئے کہ اگر واقعی دنیا میں پایدار امن و سکون قایم کرنا مقصود ہے، تو اس کی جستجو ڈماکریسی اور استعماریت میں نہ کرنا چاہئے، جو "قومیت" کو قومی تفوق و بلندی حاصل کرنے کے لئے نہایت مکروہ قسم کی سرمایہ دارانہ، ملوکانہ و آمرانہ حکومتوں میں تبدیل کر دیتی ہے بلکہ اس سے ہٹ کر ان اصول میں اسے ڈھونڈھنا چاہئے جو قومی دولت و قومی سرمایہ کو کسی مخصوص جماعت کی ملکیت قرار نہیں دیتے اور جو بلا امتیاز نسل و رنگ نوع انسانی کے تمام افراد کو عطایائے قدرت سے فایدہ اُٹھانے کا یکساں حقدار سمجھتے ہیں۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ نازیت و فاسقیت، جمہوریت ہی کے غلط استعمال کا ردعمل تھی اور ضروری تھا کہ جمہوریت اس درمیانی منزل سے گزر کر یا تو رجعت قہقری کے بعد پھر ملوکیت میں تبدیل ہو جائے یا آگے بڑھ کر اشتراکیت سے ہاتھ ملائے اور اب اسی فیصلہ کا وقت ہے جس کے سامنے بڑے بڑوں کے کلیجے تھر تھرا رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ روس کی یامردی، برطانیہ کی فراست اور امریکہ کی دولت نے اس لڑائی کو جیتنا ہے اور انھیں تینوں قوتوں کو ملکر دنیا کا نیا نظام مرتب کرنا ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب جنگ کے زمانہ کا اتحاد جنگ کے بعد بھی قایم رہے، اور دولت و زمین کی بھوک ان کو باہم گردست و گریباں ہونے پر مجبور نہ کر دے۔ اس لئے وقت کا سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ کیا "نئی دُنیا" کے نظام میں، حکومت کے نظریوں کا وہ اختلاف جو اس جنگ کے باعث ہوا تھا، مٹے گا یا نہیں اور اگر نہ مٹا تو پھر آیندہ امن و سکون کی توقع کیا ہو سکتی ہے۔

اس وقت دنیا کی نگاہیں سن فرانسسکو کی طرف لگی ہوئی ہیں، جہاں اس وقت وہی ہنگامہ برپا ہے جو غالباً زمین کی آفرینش کے وقت عناصر میں پایا گیا ہوگا اور اگر یہ ہنگامہ کوئی اور تازہ جنگ چھیڑے بغیر ختم ہوگیا تو اس کا باعث انسان کی عقل سلیم کا نتیجہ نہ ہوگا، بلکہ نتیجہ ہوگا صرف مصلحت و دور اندیشی کا، تحریر میں خلوص کم اور خوف کا عنصر زیادہ ہے، وہ موقت ہے کیونکہ جن اصول پر سن فرانسسکو میں دنیا کی تقسیم کا مسئلہ پیش کیا جا رہا ہے، وہ اپنے اندر بہت سی چنگاریاں چھپائے ہوئے ہیں جن کا جلد یا بدیر ابھرنا لازم ہے ـــــ کہا تو یہ جاتا ہے کہ اس کانفرنس میں دنیا کی تمام قوموں کو مکمل آزادی کا حقدار سمجھ کر "جدید نظام عالم" مرتب کیا جائے گا، لیکن جب تک دنیا میں آزادی مانگنے اور دینے کا دستور قائم ہے، صحیح آزادی کسی کو نہیں مل سکتی، صحیح آزادی دنیا میں ہمیشہ حاصل کی جاتی ہے اس کی بھیک نہیں مانگی جاتی اور نہ بخشش و عطا کی طرح وہ کسی کو دی جا سکتی ہے۔ پھر جب ان حقائق کو سامنے رکھ کر ہم سن فرانسسکو کے حال پر غور کرتے ہیں، تو اس کے مستقبل کی طرف سے تو نہیں، لیکن دنیا کے مستقبل کی طرف سے ضرور مایوسی پیدا ہوتی ہے، کیونکہ سب سے پہلی گفتگو وہاں "ٹرسٹی شپ" اور "منڈیٹ" یعنی "تولیت" و "سیادت" کے متعلق شروع ہوئی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا پہلے جس گرفت میں تھی وہ اب بھی بدستور باقی رہے گی اور اس "نظام جدید" میں بھی اسے غلام ہی بنا رہنا ہے۔ یہ تو ہے عمومی فضا اس کانفرنس کی جو یقیناً مایوس کن ہے۔ اب رہے وہ خصوصی مطالبات جو "اکابر ثلثہ" کے درمیان اور دوسری قوموں کے جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں، سو وہ نہ صرف مایوس کن بلکہ ایک حد تک خطرناک بھی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ باتوں ہی باتوں میں تلوار کھینچنے تک کی نوبت آجائے۔

برطانیہ صاف صاف کہہ چکا ہے کہ جو چیز اس کی تھی وہ اسی کی رہے گی۔ امریکہ کا کہنا یہ ہے کہ بعض چیزیں جو میری نہیں تھیں اب انھیں میرا ہونا چاہئے، روس کہتا ہے کہ اگر "تولیت و سیادت" ہی کے اصول پر دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہونا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے بھی ایشیائے بعید کے بعض حصوں پر تولیت و سیادت کا حق حاصل نہ ہو۔

الغرض یہ ہے وہ آپا دھاپی جس کا مظاہرہ اس کانفرنس میں ہو رہا ہے اور دل کے جو کانٹے آہستہ آہستہ زبان پر آرہے ہیں، وہ کافی تشویش انگیز ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ روس کے اثرات ریاستہائے بلقان میں زیادہ وسیع ہوتے جاتے ہیں، بالٹک ریاستوں کو بھی وہ اپنی گرفت سے آزاد نہیں کرنا چاہتا، پولینڈ کے مشرقی نصف حصہ کو بھی وہ ہاتھ سے دینے پر راضی نہیں اور نہ وہاں کوئی ایسی حکومت قائم ہونے دینا چاہتا ہے جو روس کی مخالف ہو، فنلینڈ سے جو معاہدہ وہ کر چکا ہے، اس میں بھی کوئی تبدیلی پسند نہیں کرتا، کمیونسٹ چین میں جو سیاسی اثرات اس کے پیدا ہو چکے ہیں ان سے بھی وہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ جاپان سے بھی وہ اپنی پرانی شکست کا بدلہ لینے کے لئے بعض کھوئے ہوئے حصے واپس لینا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر یہ سب کچھ روس کی مرضی کے مطابق طے پا گیا، تو یہ برطانیہ و امریکہ کی سیاست کی بڑی شکست ہوگی، جسے یہ کبھی گوارا

نہیں کر سکتے ۔

اس لئے ان حالات میں اگر تیسری جنگ کا خطرہ سامنے ہے اور قدرت کا فیصلہ یہی ہے کہ نئی دُنیا کی تعمیر پُرانی دنیا کی کامل تخریب ہی کے بعد ہو سکتی ہے تو پھر یہ خطرہ برداشت کرنا ہی ہے ۔

خیال تھا کہ دُنیا کی وہ حکومتیں جو کسی نہ کسی طرح اس جنگ سے متاثر ہوئی ہیں، آیندہ کے لئے سنبھل جائیں گی اور وہ پھر اس خطرناک راہ کو اختیار نہ کریں گی، جو اس کُشت و خون کا باعث ہوئی تھی، لیکن کسقدر عجیب بات ہے کہ ابھی زمین کے خونی دھبے خشک بھی نہیں ہوئے کہ پھر وہی حریصانہ ذہنیت اُبھرنے لگی اور تماشا یہ ہے کہ اس ذہنیت کا اظہار سب سے پہلے فرانس کی طرف سے ہوا ہے، جس کا کوئی جنگی کارنامہ ہمارے سامنے نہیں ہے ـــــ ڈی گال، آزاد فرانسیسی جماعت کا قاید اعظم سہی، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اگر اتحادی مدد نہ کرتے تو شاید اسے کبھی فرانس کی سرزمین دیکھنا نصیب نہ ہوتی، لیکن اب اُس کی نیت کا یہ حال ہے کہ سن فرانسسکو کی کانفرنس ابھی ختم بھی نہیں ہوئی کہ وہ بیروت میں اپنی فوجیں اُتار کر شام و لبنان کی حکومتوں کو پھر اپنے تصرف میں لانا چاہتا ہے ۔

اسی جنگ میں جب جرمن اور وشی حکومت کی فوج کو یہاں سے نکالا گیا تھا تو اُسوقت یہ بات طے ہو گئی تھی کہ یہ عرب حکومتیں خود مختار رہیں گی اور ان کی آزادی کی ذمہ داری برطانیہ اور امریکہ دونوں نے لی تھی، لیکن ڈی گال نے اس کی مطلق پروا نہیں کی اور یہ سمجھ کر کہ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو دبا لینا آسان ہے، پھر اسی استعماری پالیسی کو اختیار کیا۔ جسے عرب قوم کبھی گوارا نہیں کر سکتی ۔

چونکہ برطانیہ و امریکہ نے ان عرب حکومتوں کی آزادی کی طرفداری اس لئے کی تھی کہ جاپان کے خلاف جنگ قایم رکھنے کے لئے مشرق وسطیٰ ہی سب سے بڑا فوجی مرکز ہوگا، اس لئے یقین ہے کہ ڈی گال کی توقعات پوری نہ ہوں گی لیکن ان حرکتوں سے اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ جب فرانس ایسی حکومت کی (جسے اس وقت بالکل کمیونسٹ حکومت کہنا چاہئے) ذہنیت یہ ہے تو اور دوسری حکومتوں کا کیا حال ہوگا ۔

ایک اور ہنگامہ جس کے نتایج بہت دور رس ہیں، بندرگاہ ٹریسٹ کا ہے ۔ یہ علاقہ اٹلی کے قبضہ میں تھا جسے یوگوسلیویا کے مارشل ٹیٹو نے فتح کرکے آزاد کرایا ہے ۔ اب مارشل ٹیٹو اسے یوگوسلیویا میں شامل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے چھوڑنے پر راضی نہیں ۔ اگر معاملہ صرف ٹیٹو اور یوگوسلیویا کا ہوتا تو چنداں اہم بات نہ تھی، لیکن چونکہ اسوقت یوگوسلیویا بلقان کی اور دوسری ریاستوں کی طرح بالشویک اثرات سے متاثر ہے، اس لئے ٹریسٹ کا مسئلہ بھی روس کا مسئلہ بن گیا ہے اور یوں آسانی سے اسے نہیں سلجھایا جا سکتا ۔

الغرض دُنیا اس وقت برزخی دور سے گزر رہی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور سن فرانسسکو میں کرۂ زمین کے باشندوں کی قسمت کا فیصلہ کن اُصول پر کیا جائے گا ـــ حالانکہ اگر دنیا میں امن و سکون پیدا کرنا ہے

تو اس کا صرف ایک ہی اُصول ہے اور وہ یہ کہ دنیا کی تمام قوموں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور متمدن قومیں، غیر متمدن قوموں کو مہذب و شائستہ بنانے کی ذمہ داری سے ہاتھ اٹھا لیں اور اپنی محبت و ہمدردی سے ہم کو زیادہ گراں بار احسان نہ بنائیں۔

ہوئے تم دوست جسکے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو!

ماخذ القرآن کی بحث

یہ مسئلہ اب اُس منزل پر پہونچ گیا ہے کہ اس کو اب یا تو ختم ہو جانا چاہئے۔ ہمارے علماء کرام بالکل خاموش ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص معقول بات نہ کہہ سکتا ہو تو دانشمندی یہی ہے کہ سکوت اختیار کیا جائے۔

اس دوران میں قارئین نگار کے متعدد خطوط ایسے موصول ہوئے ہیں، جن میں تقاضہ کیا گیا ہے کہ بلا کسی مزید انتظار کے مجھے خود اپنی رائے اس مسئلہ میں ظاہر کر دینا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ مطالبہ ان کی خواہش کے لحاظ سے بالکل درست ہے، لیکن شاید انھوں نے غور نہیں کیا کہ ان اعتراضات کا جواب دینے کی ذمہ داری مجھ پر عاید نہیں ہوتی۔ کیونکہ میں بہت سی اُن باتوں کو مانتا ہی نہیں جن پر اعتراض کیا گیا ہے اور اسی لئے میں نے ابتدا ہی میں ظاہر کر دیا تھا کہ علمائے کرام کے جوابات کا صرف تبصرہ میرے ذمہ ہوگا۔۔۔۔ میں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تھا کہ ہندوستان کے اکابر علمائے دین سے کوئی نہ کوئی ضرور جواب کا ایسا پہلو اختیار کرے گا جو مسلمانوں کے عام اعتقادی نظریوں کو دنیا سے تسلیم کرائے اور اس طرح میں خود گمراہی سے نکل کر "صراطِ مستقیم" پر آجاؤں گا۔ میرا یہ اقدام نہ ظرافتہً تھا بلکہ صرف متعلمانہ تھا۔ میں اس بحث میں ان کے علم و فضل کا امتحان لینا نہ چاہتا تھا بلکہ اس سے خود فایدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس تحریک کے ابتدا ہی میں ان کی نیتیں بدل پڑ گئیں اور ان کی بدگمانیوں اور سرگرمیشانیوں نے جنھیں میں نہ سہی مگر دنیا بجا طور پر ان کی نااہلی قرار دے سکتی ہے، میرے اس اقدام کو بجائے مفید ہونے کے مضرت رساں بنا دیا۔ بہرحال اب کہ نوبت یہ کار رازِ دو و گزشتہ و افسوس نے کر دہ کس تک پہونچ گئی ہے، اس بحث کو کسی نہ کسی طرح ختم کرنا ہے اور آیندہ اشاعت (جولائی) میں تفصیل کے ساتھ بتاؤں گا کہ میں مستدل کے ان اعتراضات کو کیا سمجھتا ہوں اور اس سلسلہ میں بالکل آخری مرتبہ ظاہر کر دوں گا کہ میں نظریۂ اسلام و علماء کے متعلق کیا ہے۔ اور اس طرح جولائی کے پرچہ ہی کے ساتھ یہ بحث قطعاً نگار میں ختم ہو جائے گی۔ ہاں علمائے کرام ہونے ارشادات کی اشاعت کے لئے نگار کے صفحات ہمیشہ وقف رہیں گے، کیونکہ میں آخری سانس ختم ہونے تک اپنے دل کے دروازے صداقت و حقیقت کی روشنی کے لئے کھلے رکھنا چاہتا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ انتظار کی انھیں ساعتوں میں کوئی لمحہ ایسا بھی آجائے کہ میں شاہدِ حقیقی کو بے نقاب دیکھ سکوں، اور یہ ایسی شیوہ تسلیم ہو میرے نے تمھیں ہدایت

که اینجا از نم یک جبهه می ریزند کوثر ها

۴۶ء کا سالنامہ

کیسا ہو، کس موضوع کے لئے وقف ہو اور کس کس کو شرکت کی دعوت دی جائے، یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی فیصلہ میں اس وقت تک نہیں کر سکا۔

مذہبیات کے متعلق جو کچھ مجھے کرنا تھا وہ کر چکا اور جو باقی ہے وہ ۴۵ء ہی کے اندر ختم ہو جائے گا، اس لئے اس کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ رہا سلسلۂ "ادبیات" سو اس موضوع پر بھی اس وقت تک نگار کے اتنے سالنامے نکل چکے ہیں کہ اگر اس کو فی الحال ملتوی کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

اب تیسری چیز جو شاید "مذہب و ادب" دونوں سے زیادہ ضروری ہے، "سیاسیات" ہے کیونکہ اس جنگ عظیم کے بعد یقیناً دنیا کو نئی کروٹ لینا ہے، اور ہم میں سے ہر شخص کو ابھی سے سمجھ لینا ہے کہ اس "تعمیر جدید" میں انسانی دقومی دونوں حیثیتوں سے اس کے فرائض کیا ہونا چاہئے اس سلسلہ میں جنگ عظیم کے نتائج، تعمیر بعد از جنگ، جدید بین الاقوامی مسائل، دُنیا کی اقتصادی و سیاسی گتھیاں، "دُنیائے جدید" کی حکومتوں کے نظریئے، مستقبل کے تاریک پہلو اور اسی طرح کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن پر ہم کو غور کرنا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ آیندہ سالنامہ اس گفتگو کے لئے وقف کر دیا جائے۔

ایک اور چیز جس پر اب تک بہت کم توجہ کی گئی ہے وہ ادبیات ہی کے سلسلہ کی ہے یعنی "فن نقد" ——— اور بعض احباب کی رائے ہے کہ آیندہ سالنامہ اسی موضوع پر شایع کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہم کو دیکھنا ہوگا کہ محض فنی حیثیت سے "نقد و انتقاد" کیا چیز ہے۔ اس کے کیا شرائط ہیں، دُنیا کی قوموں نے اس کے کیا اُصول مقرر کئے ہیں اور ہماری ادبی زندگی کو اس کی کتنی ضرورت ہے، اور ہمارے لٹریچر میں اس کا اضافہ کس قدر ضروری ہے۔

یقیناً یہ تجویز بھی بہت اہم ہے، اور میں اس پر بھی غور کر رہا ہوں۔

ان کے علاوہ ایک تیسری تجویز اور بھی ہے: وہ یہ کہ ۴۶ء کے اختتام کے ساتھ نگار کی عمر کے ۲۵ سال ختم ہو جائیں گے اور ۴۷ء کا سالنامہ اس کا جوبلی نمبر ہوگا۔ جسے کم از کم ۲۵۰ صفحات کا ہونا چاہئے، لیکن چونکہ اس کا امکان ہے کہ کاغذ کی کمیابی ۴۷ء میں بھی اتنے بڑے ضخیم سالنامہ کی اشاعت کی اجازت نہ دے، اس لئے کیوں نہ جوبلی نمبر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس کا پہلا حصہ ۴۶ء کا سالنامہ قرار دیا جائے اور دوسرا حصہ ۴۷ء کا سالنامہ ——— ان دونوں حصوں میں کیا ہوگا اس کے متعلق تفصیل کے ساتھ فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن خیال یہی ہے کہ جوبلی نمبر کے دونوں حصوں کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ آپ ایک طرف، مدیر نگار کی شخصیت سے بھی پوری طرح واقف ہو جائیں اور دوسری طرف نگار نے اس وقت تک جو کچھ کیا ہے وہ اس طرح آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے کہ اگر اس کے بعد نگار فنا بھی ہو جائے تو آپ کو افسوس نہ ہو۔

بہرحال ابھی تک میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا، کیونکہ اس باب میں مجھے پہلے قارئین نگار کی رائیں معلوم کرنا ہیں جو غالباً آخر جون تک معلوم ہو جائیں گی اور میں جولائی میں عرض کر سکوں گا کہ ۴۶ء کا سالنامہ کیا اور کیسا ہوگا۔

نیاز

سرچشمۂ قرآن

(بہ سلسلۂ ماہ اپریل)

جامعیت تعلیمات قرآن

زمان و مکان کے اختلافات کے باوجود مذہبی احساس ہمہ گیر اور عالمگیر رہا ہے انسانی آبادی کی چیزوں میں مختلف ہونے کے باوجود جماعت مذہبی میں متفق ہے اسوقت سے جب انسان متمدن نہ تھا آج تک جبکہ تمدن و تہذیب عروج پر ہے انسانی آبادی کا مذہبی احساس پر اجماع اس پر دلالت کرتا ہے کہ جاسۂ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ہم ان ہی چیزوں کو انسان کی فطرت خیال کرتے ہیں جو تمام دنیا کے آدمیوں میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ مثلاً خوف اور نفرت تمام کے جذبات اس لئے فطری تسلیم کئے جاتے ہیں کہ وہ تمام انسانوں میں مشترک ہیں، حالانکہ یہ جذبات بعضوں میں کم اور بعضوں میں بظاہر مفقود ہیں۔ تو بلا اختلاف زمان و مکان دنیا بھر میں مذہب کا پایا جانا اس کا ثبوت ہے کہ احساس مذہبی ایک فطری چیز ہے اور کوئی انسان اس سے خالی نہیں اور کسی کا اس سے خالی ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسا کہ احساس زندگی سے خالی ہونا بقول پرنسپل اسپرانگر :

"یہ مذہبی احساس کسی شخص کے اندر نفسی میں ایک ہستی ہے ... زندگی وقلندرانہ وجد وحال پیدا کر دیتا ہے کسی کے دل میں ... رہتا ہے کہ اس کی گہرائی اور ... کا شعور نہیں ہوتا لیکن ہر صورت میں زندگی کا آغاز و انجام وہی ہے"

مذہب کی بنیادی امتیازی ایمان ہے کہ ہمارے عالم مجاز سے بالاتر ہمارے نظام کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک ان دیکھی ہستی ہے جس کے مشاہدہ کے ساتھ خود کو مطابق کرنا ہے۔ یہ احساس کسی تجربہ و خارجی اسباب اور امتحان اور کسی عقلی ثبوت کے بغیر انسانی قلب سے اٹھتا ہے۔ اس پر ایسا یقین ہوتا ہے کہ کسی آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز پر بھی نہیں ہوتا۔ اور جذبیت پر اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ انسان کے تمام جذبات و افعال پر غالب ہو جاتا ہے۔ سادھو کا دھونی رمائے بیٹھنا۔ رات کو دن کر دینا۔ کبھی اعضائے جسم کا سکھا دینا۔ پارسی کی شعلہ نوازیاں۔ عیسائی کی کلیسائی دعائیں۔ یہودیوں اور فریسیوں کی رہبانیت مسلم کے سجدے۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو اس امر کا ثبوت ہیں کہ انسان وراء الوریٰ ہستی کا متلاشی ہے گویا کہ وہ اسے کھو چکا ہے۔ وہ اپنا سب کچھ کھو کر اپنے محبوب حقیقی کو پانا چاہتا اور اس کی راہ میں گداز ہو جانا چاہتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز کا انسان سے

نذر عقیدت حاصل کرنا اس کا مزید ثبوت ہے کہ انسان ہر چیز کو اٹھا اٹھا کر، دیکھ دیکھ کر اپنے گم شدہ محبوب کی تلاش کر رہا ہے۔ تاکہ اس کی زندگی اپنے محبوب کی مرضی و منشاء کے مطابق بسر ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی ہر ایک ضرورت کی تکمیل کرتا ہے۔ ہوا کے بغیر انسانی زندگی محال تھی قدرت نے ہوا عطا کی۔ انسان پانی کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے وہ ذرائع پیدا کئے کہ پانی مہیا ہو جائے تو یہ ناممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ انسان کی روحانی پیاس کو نہ بجھائے اور وہ راہیں نہ بتائے جن پر چل کر انسان اس کو پا سکتا ہے اور اپنی معرفت کی پیاس بجھا سکتا ہے۔ جس طرح آسمان سے آنے والا پانی مردہ زمین کو حرکت دے کر اس کی پوشیدہ قوتوں کو مختلف شکلوں میں ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح انسانوں کے مردہ قلوب اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے روحانی بارش کے محتاج ہیں۔ زمین کی طاقتیں اپنے اندر مادی کیفیت رکھتی ہیں اس لئے وہ پانی جو زمین کی موت کو زندگی سے بدل دینے کے لئے نازل ہوتا ہے مادی شکل رکھتا ہے۔ لیکن قلب کی صلاحیتوں کا تعلق ادراک و علم سے ہے اس لئے ان کو حرکت میں لانے اور نشو و نما دینے کے لئے جو آب حیات نازل ہوا، اس کی شکل بھی علمی و ادراکی ہے۔ یہ روحانی بارش وہ علم ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف انسانوں پر بصورت وحی نازل ہوا۔

ہمارا رات دن کا مشاہدہ و تجربہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ چیزیں کسی خاص قوم و ملک کے لئے مخصوص نہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم و ملک کا طرفدار نہیں۔ اس کا فیض عام ہے۔ جو چاہتا ہے اس سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی وحی بھی کسی خاص قوم و ملک کے لئے خاص و محدود نہیں۔ اس نے ہر قوم و ملک میں بلحاظ ضرورت وحی نازل فرمائی۔ ہر قوم و ملک میں نبی آتے رہے اور راہوں کو بتلاتے رہے، جن پر چل کر انسان اپنے محبوب حقیقی کو پا سکتا ہے۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اس دنیا پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جبکہ قوموں اور ملکوں میں تعلقات عام نہ تھے اور ایسی ذرائع بھی عام نہ تھے کہ تعلقات بین الاقوام کی راہیں عام ہو جاتیں۔ ایک قوم دوسری قوم سے جدا تھی ایک ملک دوسرے ملک سے علیحدہ تھا ان حالات کا اقتضا یہی تھا کہ ہر قوم و ملک کے لئے علیحدہ علیحدہ نبی مبعوث ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ سابقہ نبیوں اور مذاہب نے اپنی تعلیمات کو مخصوص قوموں اور ملکوں تک محدود کیا۔

زردشت کی تعلیم کی روشنی ایران تک محدود رہی۔ ویدوں کی تعلیم آریاؤں کے لئے مخصوص تھی چنانچہ اس منتر سے ظاہر ہے کہ:

> "اگر کوئی شودر بالارادہ وید کے منتر سن لے تو اس کے کانوں میں رانگا پگھلا کر ڈالا جائے گا۔ اگر وہ وید پڑھے تو اسکی زبان کاٹ ڈالی جائے گی اور اگر وہ ویدوں کو یاد کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دئے جائیں گے"
>
> (گوتم شاستر ادھیائے ۱۲ منتر ۴۔۶)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ہدایت کو بنی اسرائیل سے مخصوص کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں کو عالمگیر

تبلیغ سے روکا۔

"ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انھیں حکم دے کر کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا" (متی ب ۱۰ - ۵)

اور خود حضرت مسیح علیہ السلام کا عمل گواہ ہے کہ آپ انجیل کی تعلیم کی اشاعت بنی اسرائیل کے لئے فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک کنعانی عورت کو آپ نے جواب دیا کہ:

"میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ مگر اس نے آکر سجدہ کیا اور کہا اے خداوند میری مدد کر اس نے جواب میں کہا کہ لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینا اچھا نہیں" (متی ۱۵ ب ۲۴ - ۲۶)

اقوام و ممالک میں تعلقات عام نہ ہونے اور علیحدہ و جدا ہونے کی وجہ سے قوموں اور ملکوں کے حالات بھی مختلف تھے اس لئے ان حالات کا لحاظ کرتے ہوئے سابقہ تعلیمات نازل کی گئیں۔ کیونکہ مذاہب و شریعتیں انسانوں کے لئے بطور نسخہ ہوتی ہیں۔ جس طرح ایک ہی طبیب مختلف بیماروں کی حالت کے مطابق مختلف نسخے تجویز کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو علیم و حکیم ہے قوموں اور ملکوں کے مختلف حالات کے مطابق مذہبی نسخے تجویز کرتا رہا۔ اور ان قوموں کی زندگی کا جو اخلاقی پہلو بگڑ چکا تھا اسی کی اصلاح کی گئی جب بنی اسرائیل عرصہ دراز تک غلام رہ کر بے عزت ہو چکے تھے اور فرعون کی زیادتی اور استبداد و ظلم و جور نے ان کو ذلیل کر دیا تھا۔ اور ان میں قومی حمیت باقی نہ رہی تھی۔ احساس کمتری پیدا ہو چکا تھا تو اس وقت انکو غلامی سے نجات دلانے اور ان کی اس اخلاقی کمزوری کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ توریت یہ تعلیم دی کہ تم ہر شرارت کا بدلہ لو۔ کان کے بدلے کان۔ ناک کے بدلے ناک۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ اسی طرح پر اور طریقوں سے ان میں جوش انتقام پیدا کیا اور تشدد کی تعلیم دی اور جب چودہ سو برس کا لمبا عرصہ گزر چکا اور حضرت مسیح کا زمانہ آیا تو بنی اسرائیل نہایت انتقام گیر اور کینہ توز تھے۔ وہ آپس میں تشدد میں حد سے بڑھ چکے تھے اور ناحق خون ریزی ان کی عادت ثانیہ ہو چکی تھی۔ اس وقت ان کے لئے بذریعہ انجیل یہ تعلیم دی گئی کہ اگر کوئی تمھارے دہنے گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی پیش کر دو اگر کوئی کرتا مانگے تو چوغہ بھی اسے لینے دو اگر کوئی ایک کوس بیگار لیجائے تو اس کے ساتھ دو کوس چلے جاؤ ظالم کا مقابلہ نہ کرو (متی ب ۵ ۳۹ - ۴۲) عدم تشدد و نرمی ہی کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پیشتر کوئی مذہب عالمگیر اور ابدی نہ تھا۔ ہر ایک مذہب کی تعلیم خاص زمانہ اور مقام کے لئے محدود تھی اقتضائے زمانہ کے مطابق مخاطب انسانوں کی زندگی کا جو پہلو قابل اصلاح ہوتا اسی کے متعلق تعلیم دیجاتی تھی۔ کوئی ایسی شریعت پیش نہیں کی جا سکتی جس کی تعلیم ہمہ گیر اور انسانی زندگی کے تمام تر شعبوں پر مشتمل ہو یہ صرف نرا دعویٰ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ قرآن کریم کے سوا کسی اور الہامی کتاب میں سیاسیات۔ معاشیات۔ عمرانیات اور انسانی زندگی کے دوسرے اداروں سے متعلق کوئی تعلیم موجود نہیں۔ خدا اور بندے کے تعلق اور چند مخصوص اخلاقی تعلیمات کے سوائے کسی دوسرے مذہب نے کوئی تعلیم

نہیں دی - کوئی مذہب ہم کو یہ بتا نہیں سکتا کہ انسان کا اپنے معاشرہ اور کائنات سے کیا تعلق ہونا چاہئے - چھٹی صدی عیسوی سے قبل یہ تخیل تھا کہ "خدا اور بندے کے تعلق اور چند رسموں و عبادتوں اور قربانیوں کا نام مذہب ہے" اور حقیقت بھی یہ تھی کہ انسان نے ابھی وہ کمال حاصل نہ کیا تھا کہ اس کو کوئی کامل تعلیم دی جاتی - یقیناً اللہ تعالیٰ کا علم اور گیان کامل ہے لیکن جن کو وہ تعلیم دے رہا تھا وہ اس قابل نہ تھے کہ کامل تعلیم کو سمجھ سکیں - اس لئے اس کی حکمت اور علم کا یہ تقاضہ تھا کہ ان کی سمجھ اور ضرورت کے لحاظ سے تعلیم نازل کرے - اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی نہاں در نہاں اور وراء الوریٰ ہے کہ محدود عقل انسانی اس کا احاطہ نہیں کر سکتی - اسی لئے قدیم مذاہب میں کہیں اللہ تعالیٰ کو محبت کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اور کہیں جلال کے رنگ میں تاکہ اس کی فرمانبرداری کی جائے کسی مذہب میں اللہ تعالیٰ کو ماں کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے (ستیارتھ پرکاش) اور کہیں باپ کے لفظ سے اس کے رحم و کرم کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے - کسی مذہب میں خدا سرب شکتیمان (قادر مطلق) اور (مالک) کے جلالی نام کے ساتھ یاد کیا گیا ہے - قدیم مذاہب میں سے کسی مذہب میں بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کو پیش نہیں کیا گیا - ہر ایک مذہب میں اس کی صفات ہی کا ذکر ہے - توریت میں الوہیم (وہ ہے) ویدوں میں اوم (محافظ) (ستیارتھ پرکاش) ایشور (رب) پرماتما (روح سے وراء) اور زرتشتی (پارسی) مذہب میں اہورمزد (دانا مالک) کے الفاظ سے اس کا اظہار کیا گیا ہے - حقیقت الامر یہ ہے کہ عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں ذات باری تعالیٰ کے لئے کوئی لفظ نہیں - اور سابقہ الہامی کتب میں سے کوئی بھی کتاب عربی زبان میں نازل نہیں ہوئی - یہی وجہ ہے کہ سابقہ مذاہب میں اللہ تعالیٰ کے اسم ذات کو ظاہر نہیں کیا گیا - بلکہ صرف اس کی صفات کا اظہار ہے - غرض قدیم مذاہب میں کوئی ایسا مذہب نہیں جو عالمگیر و کامل ہو - جس نے ذات باری تعالیٰ کا کامل اظہار کیا ہو - اور جس کی تعلیم انسانی زندگی کی تمام ادوار پر حاوی ہو*

*وہ زبانیں جن میں سابقہ مذاہب کی شریعتیں اور کتب الہام کی گئی تھیں متواتر تبدیلیوں کی مورد ہونے کی وجہ سے قطعی طور پر متروک استعمال ہو گئیں - وہ تمام زبانیں جن میں پہلے مذاہب کی الہامی کتب نازل کی گئیں تھیں موجودہ دور میں کسی ملک یا قوم کی زبانیں نہیں ہیں - یہی وجہ ہے کہ وہ کتب اس زمانہ و قوم کے لئے مفید تھیں جس زمانہ و قوم میں کہ وہ نازل ہوئی تھیں کیونکہ ان کی زبانوں کے متروک الاستعمال اور زندہ نہ ہونے کے باعث آئندہ نسلوں کے لئے اصل الفاظ کے صحیح مطلب و مفہوم تک پہونچنے کے لئے ناقابل عبور مشکلات اور رکاوٹیں پیدا ہو گئیں - ژندی اور پہلوی زبانوں میں زرتشتی (پارسی) مذہب کی مذہبی کتب پائی جاتی ہیں - لیکن یہ دونوں زبانیں زندہ نہیں ہیں اور متروک ہو گئی ہیں ایسی وجہ ہے کہ ان کتابوں کی تعداد زبان اور زمانۂ نزول کے متعلق اس قدر اختلاف ہے کہ کوئی امر قطعی طور پر معلوم نہیں ہو سکتا - خود حضرت زرتشت (جن کی طرف ان کتابوں کا اکثر حصہ منسوب ہے) کے نام کے تلفظ کے متعلق گیارہ رائے ہیں اور نام کے معنوں میں بیسیوں شبہات ہیں (دیکھو گاتھا سرود مہا زرتشت مطبوعہ ایرانی انجمن زرتشتیان بمبئی سنہ ۱۹۲۲ء کا دیباچہ)

ویدوں کی زبان سنسکرت بھی زندہ زبان نہیں - یہ ہندوستان کے کسی علاقہ و خاندان اور قوم میں بولی نہیں جاتی اور اسکے

محاورات اور الفاظ کے معانی میں بھی اس قدر تبدیلی ہو چکی ہے کہ ان کا سمجھنا مشکل بلکہ محال ہو گیا ہے۔ [illegible] الفاظ کے معنوں میں اختلاف ہو تو کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور کوئی صحیح حل دریافت ہو سکتا ہے۔ [illegible] زبان تو مردہ زبان ہے خود پادریوں کی اکثریت اس سے ناواقف ہے۔ یہ زبان بھی بولی نہیں جاتی ہے تو [illegible] اس کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کتاب کے ماننے والوں میں اس قدر اصولی اختلاف ہے کہ انھوں نے [illegible] کے بجائے ایک مستقل مذہب کی صورت اختیار کر لی ہے۔

ازمنۂ سابقہ میں ایسے موثر اور کارگر ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے کہ جو اپنی [illegible] کو زمانہ کے [illegible] صحیح وسلامت اور محفوظ رکھ سکتے۔ ایک زمانہ گزرنے پر انسانی الحاق و تحریف کے مواقع [illegible] زبانوں کے متروک اور حفاظت کے اسباب کی عدم موجودگی کے باعث تمام [illegible] الہامی کتب میں تحریف ہوئی اور کوئی الہامی کتاب اپنی اصلی شکل وصورت میں باقی نہیں رہی۔ ویدوں کی تعداد میں اختلاف ہے کہ تین ہیں یا چار۔ یجروید ادھیائے ۳۶ کے پہلے منتر میں "رگوید سام وید یجروید" کا نام ہے [illegible] کا کہیں ذکر نہیں۔ [illegible] ہیں کہ "جس سبھا میں رگوید۔ یجروید۔ سام وید کے جاننے والے تین سبھا سد ہو کر [illegible] ستیارتھ پرکاش باب ۲ [illegible] پنڈت دیانند جی کہتے ہیں "ایک ایک وید کو [illegible] بارہ بارہ سال [illegible] ختم کریں" (ستیارتھ پرکاش باب ۳ دفعہ ۲۶) اس حساب سے وید تین ہی ہوتے ہیں [illegible] کے خیال میں وید صرف تین ہیں۔ تینوں ویدوں میں اتھروید کا کہیں ذکر نہیں [illegible] اتھروید الہامی [illegible] باقی ہے [illegible] مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں لوگوں نے اپنے پاس سے منتر ملا دئیے ہیں (۱) پنڈت دیانند جی رگوید [illegible] بھومکا ہندی کے صفحہ ۹۶ پر لکھتے ہیں کہ اتھروید کا پہلا منتر اوم شنو دیوی ہے۔ پنڈت لیکھرام [illegible] بھی یہی مذہب ہے۔ لیکن موجودہ اتھروید میں یہ منتر چھبیسواں ہے اور پہلے پچیس منتر کسی [illegible] نے اتھروید میں ملا دئے ہیں۔ اسی طرح سام وید۔ یجروید اور اتھروید میں بھی تحریف اور ملاوٹ پائی جاتی ہیں ان کے منتروں کی تعداد میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو کتاب ویدسروسو مصنفہ پنڈت دیک منی جی صفحہ ۶۵ [illegible] اسی طرح بھگوت گیتا کے شلوکوں کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔

تحریف بائبل

انبیاء بنی اسرائیل میں جتنی کتابیں نازل ہوئی ہیں ان کو [illegible] بائبل نام دیکر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے (۱) عہد عتیق۔ اس سے وہ کتابیں مراد ہیں جو حضرت مسیح سے پیشتر انبیاء بنی اسرائیل پر نازل ہوئیں۔ (۲) عہد جدید۔ چار انجیلیں جن کے ساتھ حواریوں کے اعمال خطوط اور مکاشفات بھی شامل ہیں [illegible] عہد عتیق (۳۹) کتابیں ہیں لیکن علماء یہود نے ان کو (۲۴) کتابوں میں شمار کر کے تین سلسلوں میں منسلک کیا ہے (۱) توراۃ اس میں پانچ کتابیں شامل ہیں۔ پیدائش، خروج۔ احبار۔ گنتی۔ استثنا (۲) نبیم۔ جن میں یوشع قضاۃ۔ سموئیل اول و دوم

طین اول ودوم - یشعیاہ - یرمیاہ - حزقیل اور بارہ چھوٹے پیغمبروں کی کتب شامل ہیں (۳) کتیم - ان میں زبور - امثال سلیمان
ب - عوت - نوحہ یرمیاہ - واعظ - استر - دانیال - عزرا - نحمیاہ - ایام اول ودوم ہیں -

لیکن عہد عتیق کی سب کتابیں بائبل میں داخل نہیں ہیں - عہد عتیق کے موجودہ مجموعہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ
ر بھی چند ایسی کتب سماوی تھیں جو معدوم ہوگئیں جن سے خود الہامی لکھنے والوں نے استخراج کیا یا ان کی طرف اشارہ
یا ہے - وہ تقریباً (۱۶) ہیں - جن کے حوالے عہد عتیق میں موجود ہیں مثلاً عہد نامہ موسیٰ بائبل میں یہ آیت ہے کہ:

"پھر اس نے عہد نامہ لیا اور لوگوں کو پڑھ سنایا" (خروج باب ۲۴ - آیت ۷)

کتاب جنگ نامہ موسیٰ: "اس سبب سے خداوند کے جنگ نامہ میں لکھا ہے کہ وہ سوفہ میں واہب پر قابض ہوا" (گنتی ۲۱ ب ۱۴)
کتاب الیشیر: "تب آفتاب ٹھہرا رہا اور مہتاب ٹھہر گیا یہاں تک کہ ان لوگوں نے اپنے دشمنوں سے انتقام لیا - کیا یہ کتاب الیشیر میں
نہیں لکھا ہے - (یشوع ب ۱۰ - ۱۳) کتاب اسموئیل دوم میں ہے کہ "انہیں حکم دیا کہ بنی یہوواہ کو کمان کا سوز سکھائیں دیکھ
وہ کتاب ایاشر میں لکھا ہے" (باب ۱ - ۱۸) --- کتاب امثال سلیمان "اور اس نے تین ہزار مثلیں کہیں اور اس کے گیت
ایک ہزار اور پانچ تھے" (اسلاطین باب ۴ - ۳۲) - مفرڈ صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ کتابیں جن میں مسیح علیہ السلام کو ناصری
کہا گیا ہے (متی ب ۲ - ۲۳) نیست و نابود ہوگئی ہیں اس لئے کہ جو کتابیں نبیوں کی اب موجود ہیں کسی میں مسیح کو ناصری نہیں لکھا
ہے" (کتاب سوالات (سوال) ذیل سوال دوم مطبوعہ ۱۸۴۳ء لندن)

کریزاسٹم صاحب اپنی ہوملی (تفسیر) میں لکھتے ہیں کہ "پیغمبروں کی بہت سی کتابیں ناپید ہوگئیں اس لئے کہ یہودیوں نے
غفلت سے بلکہ بے دینی سے بعض کتابوں کو کھو دیا اور بعض کو پھاڑ ڈالا اور بعض کو جلا ڈالا"

تفسیر ڈائیلی میں لکھا ہے کہ "اس بادشاہ روشن ضمیر (سلیمان علیہ السلام) نے اس دانائی کو جو اس نے پائی انسانوں
کے فائدہ کے لئے استعمال میں لانا چاہا اور بہت سی کتابیں ان کی تعلیم کے لئے لکھیں مگر عذرا نے ان میں سے صرف تین کو مقدس
کتابوں میں داخل کیا اور باقی یا تو وہ مذہبی تربیت کے لئے نہیں بنائی گئی تھیں، یا ایک زمانہ کے گزر جانے کے سبب خراب اور
ناقص ہوگئیں تھیں" (تفسیر ڈائیلی مطبوعہ ۱۸۵۶ء جلد ۲ ص ۱۳۹)

بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جو مروجہ بائبل میں داخل نہیں لیکن ان میں کی بعض کو اب تک بعض عیسائی فرقے مانتے ہیں اور
چند ایسی ہیں جن کو صحیح ٹھیرا کر بائبل میں داخل کیا تھا اور پھر غلط اور غیر معتبر ٹھیرا کر خارج کر دیا اور ایسی کتابیں بھی ہیں جن کو جمہور
عیسائی جھوٹی اور جعلی کہتے ہیں ان کی تعداد تقریباً اکیس ہے مثلاً کتاب عذرا نمبر (۱) یہ سپٹواجنٹ کے بعض نسخوں میں شامل تھی
اور یونانی گرجے میں عموماً پڑھی جاتی تھی (تفسیر ڈائیلی جلد ۲ ص ۶۷۶) باقی حصہ بابوں کتابوں نمبر (۲) یہ بائبل کے چند رومی
ترجموں اور ایک عربی ترجمہ میں موجود ہے (تفسیر ڈائیلی جلد ۲ ص ۶۷۶) باقی حصہ بابوں کتابوں استھر کا یہ کتاب بائبل کے یونانی
اور رومی نسخوں میں موجود ہے (تفسیر ڈائیلی مطبوعہ ۱۸۵۶ء جلد ۲ ص ۸۴۹) کتاب پیدائش صغیر کو کونسل ٹرنٹ نے نامعتبر ٹھیرایا

(انٹروڈکشن علوم بائبل ہارن صاحب مطبوعہ ۱۸۲۵ء لندن جلد ۴ صـ۲)

توراۃ مروجہ عہد عتیق کی کتب کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں اس کا کوئی ثبوت نہیں اور نہ کوئی سند کہ یہ کتابیں جن انبیاء سے منسوب ہیں انہی کی ہیں یا نہیں۔ توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لکھی ہوئی نہیں۔ اس میں ضمیر متکلم کے بجائے غائب کی ضمیر ہے۔ اکثر جگہ لکھا ہے کہ موسیٰ نے کہا۔ خدا نے موسیٰ سے یوں اور اس طرح کہا مثلاً "موسیٰ اپنے سسر سے تیرد کے جو مدیان کا کاہن تھا گلے کی نگہبانی کرتا تھا" (خروج ب ۳ آ ۱) "موسیٰ نے خدا کو کہا میں کون ہوں" (خروج ب ۳ آ ۱۱) "خدا نے موسیٰ سے کہا میں وہ ہوں جو میں ہوں" (خروج ب ۳ آ ۱۴) "تب خداوند نے موسیٰ سے کہا اپنا ہاتھ بڑھا اور اس کی دُم پکڑ لے اس نے ہاتھ بڑھایا اور اسے پکڑ لیا وہ اس کے ہاتھ میں عصا ہوگیا" (خروج ب ۴ آ ۴)

توریت کی پانچ کتابوں میں بعض ایسے نام اور حالات آتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بہت دنوں بعد واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً حبرون ایک گاؤں تھا۔ جب بنی اسرائیل نے فلسطین فتح کیا تب حبرون اس گاؤں کا نام رکھا۔ اگلے زمانہ میں اس کا نام قریہ اربع تھا مگر تورات میں ہے کہ "ابرام نے اپنا ڈیرہ اُٹھایا اور ممرے کے بلوطوں میں جو حبرون میں ہیں جا رہا" (پیدایش ب ۱۳ - ۱۸) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب فلسطین فتح ہونے کے بعد لکھی گئی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوئی۔ عیدر اس منارہ کا نام ہے جو اورشلیم کے دروازہ پر تھا "پھر اسرائیل نے کوچ کیا اور اپنا خیمہ مجدل عدر کی اس طرف کھڑا کیا" (پیدایش ب ۳۵ - ۲۱) اس سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب بعد تعمیر اورشلیم لکھی گئی اور اورشلیم کی تعمیر حضرت موسیٰ کے زمانہ کے بعد ہوئی اور "بنی اسرائیل چالیس برس تک جب تک وہ بستی میں آئے من کھاتے رہے جب تک وہ زمین کنعان کی نواحی میں آئے من کھاتے رہے اور ایک اومر ایفہ کا دسواں حصہ ہے" (خروج ب ۱۶ آ ۳۵، ۳۶) یہ باتیں حضرت موسیٰ کے زمانہ میں نہیں ہوئیں بلکہ بنی اسرائیل کے کنعان کے پہونچنے کے بعد کے واقعات ہیں چنانچہ لکھا ہے "اور جب انھوں نے اس زمین کا دانہ کھایا تو اسی دن سے من موقوف ہوگیا اور آگے پھر بنی اسرائیل کو من نہ ملا۔ اور انھوں نے اسی سال کنعان کی سرزمین کا حاصل کھایا" (یشوع ب ۵ - ۱۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جبکہ بنی اسرائیل کنعان میں پہونچ چکے تھے۔ "خداوند نے اسرائیل کی آواز سنی اور کنعانیوں کو گرفتار کر دیا اور انھوں نے انہوں کے سبھوں کو حرم کر دیا اور اس نے اس مقام کا نام حرمہ رکھا" (گنتی ب ۲۱ - ۳) حالانکہ یہ واقعات حضرت موسیٰؑ کے بہت زمانہ بعد ہوئے چنانچہ کتاب قاضیون میں لکھا ہے کہ "تب موسیٰ کے سسرے قینی کی اولاد کھجوروں کے شہر سے بنی یہوداہ اپنے بھائی شمعون کے ساتھ گیا۔ اور انھوں نے ان کنعانیوں کو جو صفت میں رہتے تھے جا مارا اور شہر کو حرم کر دیا اور اس شہر کا نام حرمہ کہلایا" (قاضیوں ب ۱۶، ۱۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب گنتی اس وقت کی تصنیف ہے جب کنعانی جنگی ہو چکے تھے۔ توریت کی پانچویں کتاب استثنا میں لکھا ہے کہ:

"پس خداوند کے بندہ موسیٰ نے خداوند کے کہے کے موافق وہیں مواب کے ملک میں وفات پائی اور اس نے اسے

مواب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل دفن کیا۔ پر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں اور موسیٰ اپنی وفات کے وقت ایک سو بیس برس کا تھا (ب ۳۴ - ۵ - ۷)

اگر یہ آیتیں الہامی ہیں تو کس پر اُتریں جبکہ حضرت موسیٰؑ زندہ نہ تھے۔ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ الحاقی ہیں اس کتاب کو حضرت موسیٰؑ نے نہیں لکھا بلکہ کسی اور نے ان کے بہت دنوں بعد لکھا ہے۔ بائبل کے مفسر پادری ڈملو صاحب نے ایک جلد میں بائبل کی مکمل تفسیر انگریزی میں لکھی ہے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ موسیٰ کی کتابیں حضرت موسیٰ کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اصل تحریروں میں کمی بیشی کرکے یہ بنائی گئی ہیں۔ لکھتے ہیں :

> "مگر غور سے تحقیق کرنے پر ماننا پڑتا ہے کہ کتب خمسہ میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اس پُرانے خیال سے کہ موجودہ صورت میں یہ موسیٰ کی کتابیں ہیں مطابقت نہیں کھاتیں مثلاً یہ اطمینان سے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ استثنا باب ۳۴ میں موسیٰ نے اپنی موت کا حال خود نہیں لکھا۔ استثنا باب ۱ میں یہ بیان کردہ باتیں ہیں جو موسیٰ نے یردن کے اس پار بیابان کے میدان میں ...... اسرائیل کو کہیں کسی ایسے شخص کے نقطۂ خیال سے لکھا گیا ہے جو کنعان میں رہتا تھا۔ مگر موسیٰ کبھی کنعان میں نہیں گئے"

اس قسم کی بہت سی مثالیں دے کر پادری صاحب کئی وجوہات اس بیان کی تائید میں دیتے ہیں کہ "موسیٰ کی پانچ کتابیں اصل میں ایک شخص کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ پہلی تحریروں کی بنا پر تالیف کی گئی ہیں"

بنی اسرائیل کی الہامی کتب کے معدوم ہونے کا سب سے بڑا سبب وہ ہولناک حوادث ہیں جو حضرت سلیمانؑ کے بعد پے در پے واقع ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ خود حضرت موسیٰؑ نے توریت کو اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا اور اپنے وصال کے قریب قبضۃ العلماء میں تابوت سکینہ میں رکھا تھا۔ جس کا ثبوت توریت سے ملتا ہے :

> "جب موسیٰ اس شریعت کی باتوں کو کتاب میں لکھ چکا اور وہ تمام ہوئیں تو موسیٰ نے لاویوں کو جو خداوند کے عہد کے صندوق کو اٹھاتے تھے فرمایا کہ اس شریعت کی کتاب کو لے کے خداوند اپنے خدا کے عہد کے صندوق کو اٹھاتے تھے فرمایا کہ اس شریعت کی کتاب کو لے کے خداوند اپنے خدا کے عہد کے صندوق کی ایک بغل میں رکھو تاکہ وہ تمہارے برخلاف گواہ رہے"
>
> (استثنا ب ۳۱ - ۲۴ - ۲۶)

جب بنی اسرائیل کنعان میں آباد ہوئے اور حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس تعمیر کیا جس کو یروشلم کہا جاتا ہے تو وہ کتاب تمام تبرکات اور تابوت سکینہ کے ساتھ وہاں رکھی گئی۔ ۵۸۶ ق م میں بخت نصر نے بیت المقدس کو جہاں حضرت سلیمانؑ نے الواح توریت کو محفوظ رکھا تھا جلا دیا اور جس قدر بنی اسرائیل قتل سے بچے ان کو گرفتار کرکے بابل لے گیا۔ لیکن جب شاہ ایران خورس نے بابل فتح کرکے یہود کو آزاد کیا اور تعمیر بیت المقدس کی اجازت دی تو کچھ عرصہ بعد عذرا اور نحمیاہ کی کوششوں سے بیت المقدس کی تعمیر کی تکمیل ہوگئی اور عذرا نے توریت کو از سر نو جمع کرکے۔ واقعات کو مورخانہ حیثیت سے ترتیب دیا (نحمیاہ ب ۸) پھر نحمیاہ نے

نبیم یعنی بائبل کی سلسلہ دوم کی کتابوں کو زبور داؤد کے ساتھ جمع کیا۔

۱۶۸ ق۔م میں انطاکیہ کے یونانی بادشاہ انطوخیس نے یہودیوں کی بہاؤ توریت کو مٹانے کے لئے بیت المقدس میں یونانی دیوتا زئیس کا مندر بنایا مقدس صحیفوں کو جلا دیا اور توریت کی تلاوت قطعاً بند کر دی۔ بہت جلد یہود امقابی نے اس فتنہ کو فرو کیا۔ بیت المقدس کو ناپاکیوں سے پاک کیا گیا اور مقدس صحیفے جمع کر کے محفوظ کئے گئے اور سلسلہ سوم یعنی کتیم کا بھی اضافہ کر دیا۔ ٹائٹس رومی نے ۸ ستمبر ۷۰ء بیت المقدس فتح کر کے شہر کے ساتھ ہیکل سلیمانی کو بھی برباد کر دیا اور مقدس صحیفوں کو روما کے محل میں بطور یادگار رفتح لے گیا۔ یہود جلا وطن کر دئے گئے اور یروشلم کے اطراف غیر یہود کی آبادیاں قائم کر دی گئیں ۱۳۲ء میں قیصر سے یہودیوں نے جان توڑ مقابلہ کیا۔ شکست ہوئی۔ حکومت روما نے یروشلم کے ویران کھنڈروں میں بھی یہود کے داخلہ کی ممانعت کر دی۔ صرف ایک دن جو سلطنت رومائی فتحیابی کی یادگار تھا آنے کی اجازت دی۔ مذکورہ حوادث کے سبب اگرچہ اصل صحف انبیاء ضائع ہو گئے لیکن ان کی تعلیمات کا سلسلہ روایات بالمعنی کے طور پر جاری رہا بابل کی اسیری کے زمانہ میں علماء یہود سبت کے دن لوگوں کو جمع کر کے توریت کی آیات سے مجلس وعظ کو گرم کر کے شکستہ دلوں کو تسلی دیتے تھے یہ رسم بابل سے واپس آکر بیت المقدس کے دوبارہ تعمیر ہونے کے بعد بھی جاری رہی اور جا بجا کنیسہ تعمیر کئے گئے جہاں اس قسم کی مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ طریق عبادت یہ تھا کہ احبار چند آیات جو قدیم عبرانی زبان میں ہوتی تھیں پڑھتے تھے۔ پھر اسکی تفسیر ارامی زبان میں جو بابل کی اسیری کے بعد سے یہود کی مادری زبان ہو گئی تھی (نحمیاہ ب ۱۳- ۲۳- ۲۵) لوگوں کو سمجھانے کے واسطے بیان کرتے تھے۔ یہود امقابی نے جب آزادی حاصل کی تو توریت کی تلاوت پھر جاری ہوئی لیکن اس وقت یہود میں دو فریق ہو گئے تھے (۱) صدوقی۔ جنھوں نے توریت کی پانچ کتابوں پر اکتفا کیا اور باقی صحف کو خارج کر دیا (جوئش انسائیکلوپیڈیا جلد دہم ص۶۳) (۲) فریسی، جنھوں نے صحف انبیاء یعنی سلسلہ اول و دوم (نبیم۔ کتیم) کی کتابوں کو بھی اصول دین میں شامل کر لیا۔ ان میں یہ روایت مشہور تھی کہ حضرت موسٰی پر دو قسم کی وحی نازل ہوئی (۱) وحی مکتوبی (۲) وحی لسانی جو حضرت ہارون سے سینہ بسینہ عذرا کاتب تک پہونچی۔ عذرا کنیسۂ عظمٰی کے ممبروں کو لکھایا۔ پھر ڈھائی سو برس تک یہ وحی جاری رہی۔ کنیسۂ عظمٰی کے ممبروں سے کاتبان وحی اور ان سے علماء اور اس گروہ سے احبار و ربیئین نے اور اس طور سے یہ سلسلہ قائم رہا (دیکھو تالمود بابلی ص۱۸ مترجمہ پادری اسٹرین) عذرا کاتب کی نسبت مشہور تھا کہ بابل کی اسیری سے واپس ہو کر جب اس نے توریت کو از سر نو ترتیب دیا اور لکھا تو ستر مخفی ملفوظات بھی قلمبند کئے جو اگرچہ عام طور پر رائج نہ تھے لیکن خواص کو انکی پوشیدہ تعلیم ہوتی تھی (کتاب عذرا ۲ ب۱۴ ۴۶) ان کتب کو ان کی اصطلاح میں سفریم جنوزیم کہتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ صدوقیوں فریسیوں اور دیگر فرقوں کے درمیان مناظرے و مجادلے ہوتے تھے۔ لوگوں نے اپنے مفید مطلب کتابیں تصنیف کیں اور انکو انبیاء ماسبق کے نام سے منسوب کرنے لگے۔ یہ سلسلہ دو سو برس قبل مسیح۔ سو برس بعد مسیح تک زور شور سے جاری رہا۔ عام طور سے ان کتابوں کا چرچا ہو گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اختلاف بھی بڑھتا گیا۔ کسی نے کسی کتاب کو معتبر قرار دیا اور دوسرے

نے اس کو جعلی ٹھہرایا جن کو اپوکریفہ کہتے ہیں۔ اس ردّ و قبول سے جس کی بنا نفسانیت اور جہل پر تھی اصلیت پر پردہ پڑ گیا —
بیت المقدس کی آخری تباہی کے بعد جب یہودیت کا شیرازہ بکھر گیا تو احبار نے دوسری صدی عیسوی میں (۲۴) مروجہ کتابوں کو جو عہد عتیق کے نام سے مشہور ہوئیں ترتیب دے کر یکجا لکھنا شروع کیا ان قدیم تحریرات کے متعلق ریورنڈ ھارن لکھتے ہیں کہ:

"عہد عتیق کی کتابیں دراصل عبرانی زبان میں ہیں اور وہ دو ناموں سے پکاری جاتی ہیں (۱) آٹوگرافس وہ کتابیں جن کو خود الہامی لکھنے والوں نے لکھا تھا ان میں کے سب نسخے ناپید ہو گئے کوئی بھی موجود نہیں (۲) ایپوگرافس۔ وہ نسخے جو اصل نسخوں سے نقل ہوئے تھے اور ہو بکر اور سر کر نقل ہوتے ہوتے کثرت سے کہیں گئے تھے یہ پچھلے نسخے بھی مدت سے معدوم ہو گئے ہیں (۲) نئے جو سرکاری کتب خانوں میں یا لوگوں کے پاس موجود ہیں اور یہ بھی دو قسم کے ہیں (۱) اولڈ یعنی وہ قلمی صحیفے جو معابد میں کام آتے ہیں (۲) اس کو پرمینوسکرپٹس یعنی وہ قلمی نسخے جو بے تقطیع پر لکھے ہیں اور عام لوگوں کے کام آتے ہیں"۔ (دیباچہ علوم بائبل جلد ۲ حصہ اول باب ۲ فصل اول)

عہد عتیق کی کتابیں اگرچہ دوسری صدی عیسوی میں مرتب ہو گئیں مگر اس وقت تک کسی خاص متن پر اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ان وجوہ کے علاوہ احبار نے توریت کے ان متعدد مقامات کو بدل دیا کہ جہاں ان کے مروجہ عقائد کے خلاف کوئی بات پائی گئی، چنانچہ ریورنڈ ٹامسن لکھتے ہیں کہ:

"احبار نے اٹھارہ مقامات متن توراۃ کو بدل دیا جو اب تصحیحات احبار کے نام سے مشہور ہیں" (ہسٹری آف دی انگلش بائبل ص۱۷۱)

"کتاب قاضیان باب ۱۸-۳۰ میں قصداً تحریف ہوئی" (ہسٹری آف دی انگلش بائبل ص۳۴)

ویریورم بائبل کے صفحہ ۲۸۵ کتاب قاضیان کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ:

"جملہ نقادفن بالاتفاق اس تحریف کے قائل ہیں"

عہد عتیق کا ترجمہ سب سے پہلے یونانی زبان میں ہوا جس کو سپٹوایجنٹ (نسخۂ سبعینہ) کہتے ہیں۔ یہ ترجمہ شاہ مصر بطلیموس فلادلفیوس (عہد حکومت ۲۸۴ سے ۲۴۶ ق-م) نے اپنے کتب خانہ اسکندریہ کے لئے کروایا (کتاب انیٹی کوریس (بلاد سلف) باب ۱۲ از مشہور مورخ یہود جوسیفس) یونانی بولنے والے یہودیوں میں یہ ترجمہ بہت مقبول رہا اور صدہا سال تک معابد میں عبرانی عہد عتیق کے بجائے اس کی تلاوت جاری رہی۔ حضرت مسیحؑ کے حواری جب غیر اقوام میں اشاعت کو نکلے تو انھوں نے اسی سے استشہاد کیا۔ اناجیل میں جہاں توریت کا حوالہ دیا جاتا ہے تو وہاں یہی ترجمہ نقل ہے۔ مشرقی کلیسا میں اب تک یہی ترجمہ گرجاؤں میں پڑھا جاتا ہے۔ لیکن مروجہ عبرانی متن سے یہ ترجمہ مختلف ہے اور اس میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو اپوکریفل (جعلی کتابیں) کے نام سے موسوم ہیں اور جن کو یہود اور نصاریٰ نے مروجہ عہد عتیق سے خارج کر دیا ہے۔ دوسری صدی عیسوی تک یہ ترجمہ بہت مقبول رہا تیسری صدی میں جب عیسائیت سلطنت روما کی شاہی مذہب ہو گئی تو پاپائے روم نے ۳۸۲ء میں سینٹ جیروم کو مقرر کیا کہ توریت اور اناجیل کا ایک مستند ترجمہ رومی زبان میں کرے۔ جیروم نے مذکورہ بالا یونانی ترجمہ کو ناقص

سمجھ کر مختلف عبرانی نسخوں اور احبار یہود کی اعانت سے سنہ ۳۹۴ء میں اپنا مشہور رومی ترجمہ جو ولگیٹ کے نام سے موسوم ہے تیار کیا پندرھویں صدی عیسوی تک اسی ترجمہ پر مدار تھا۔ کلیسائے روم نے اسی ترجمہ کو قبولیت کی سند عطا کی تھی۔ لیکن پادری ٹامسن لکھتے ہیں کہ:

"مختلف اوقات میں جیروم کے ترجمہ کی نظرثانی ہوئی لیکن اس کا ترجمہ ناقص ہی رہا۔ زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ جیروم کو اگرچہ پرانے صحیفے دستیاب ہوئے۔ لیکن پھر بھی پوری صحت نہ ہو سکی" (تاریخ بائبل)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد دوم میں بائبل پر جو محققانہ اور مبسوط مضمون لکھا گیا ہے اس میں اس کا اعتراف کیا گیا ہے کہ:

"عرصہ دراز تک کتب مقدسہ کا مطالعہ جرح و تعدیل کے مستند اصولوں سے محروم رہا۔ یہود محض اس عبرانی ترجمہ کی پیروی کرتے تھے جن کی نسبت یہ مشہور تھا کہ انھیں غالباً دوسری صدی عیسوی میں مرتب کیا گیا اور بعد از آں احتیاط سے رکھا گیا لیکن اس نسخہ میں چند تحریفیں تو ایسی ہیں جو اب صاف نظر آتی ہیں اور غالباً ایک کافی تعداد میں ایسی تحریفیں اور بھی موجود ہیں جن کی شاید اب یا کبھی پورے طور سے قلعی نہ کھل سکے۔ عیسائی علماء کی حالت تو اس سے بھی بدتر تھی کیونکہ پانچویں صدی عیسوی تک شاذ و نادر استثنا کے ساتھ اور پانچویں صدی سے پندرھویں صدی تک بلا استثنا ان بزرگوں نے تمامتر ترجموں پر اکتفا کیا ہے۔"

توریت میں تحریف کا ثبوت خود بائبل سے ملتا ہے، لکھا ہے کہ:

"ان لوگوں نے شریعتوں کو عدول کیا۔ قانون کو بدلا" (یسعیاہ باب ۲۴-۵)

"تم کیونکر کہتے ہو کہ ہم دانشمند ہیں اور خداوند کی شریعت ہمارے پاس ہے لیکن دیکھ لکھنے والوں کے باطل قلم نے بطالت پیدا کی" (یرمیاہ باب ۸-۱۰)

تحریف انجیل وہ چار کتابیں جو عیسائیوں کی اصطلاح میں اناجیل کہلاتی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح پر نازل شدہ کتاب نہیں۔ بلکہ وہ چاروں الگ، الگ اشخاص کی تصنیف ہیں۔ ایک متی کی ایک لوقا کی ایک مرقس کی۔ ایک یوحنا کی۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ متی کی انجیل کے سوا سب اناجیل یونانی زبان میں لکھی گئیں۔ اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں وہ کلام الٰہی جو حضرت مسیح پر آپ کی مادری زبان میں نازل ہوا تھا، بجنسہٖ محفوظ نہ رہا بلکہ روایت بالمعنی اور ترجمہ کے طور پر باقی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے اناجیل میں اختلاف ہو گیا۔ پہلی صدی عیسوی کے آخر تک عیسائیوں میں تصنیف و تالیف کا مطلق رواج نہ تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں فرقہ بندیاں عمل میں آنے لگیں تو ہر فرقے نے اپنی اپنی انجیلیں مرتب کر لیں۔ نیقیہ کی مشہور کونسل کے بعد سے صرف چار انجیلیں حواریوں کے اعمال۔ پال کے خطوط مع دیگر نامہ جات اور مکاشفہ یوحنا کو صحیح تسلیم کر لیا گیا۔ باقی سب انجیلیں اور خطوط جعلی تصور کرلئے گئے پوپ کلامنس (سنہ ۱۵۹۲ء) نے ان کو سند صداقت و قبولیت عطا کی اور یہ عام طور پر رائج ہو گئے لیکن اس کے باوجود علمائے مسیحی بالاتفاق

تسلیم کرتے ہیں کہ اصلی نسخے سب معدوم ہیں۔ البتہ ان کی نقلیں جو مختلف زبانوں میں ہوئیں اب تک موجود ہیں۔ بائبل کے مفسر پادری ڈیلو صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اناجیل کے لکھنے والے یسوع مسیح کے اقوال کو یونانی میں لکھتے ہیں حالانکہ وہ اغلباً اکثر ارمی زبان میں گفتگو کرتا تھا نہ ہی یہ اغلب ہے کہ ان کاتبوں کا یہ خیال تھا کہ ان کی تحریریں ابتدائی کلیساؤں سے آگے جائیں گی جن سے وہ خود آشنا تھے۔ یہی حال پولوس کی تحریروں کا ہے۔ اس کے خطوط جن کی اب اس قدر عزت کی جاتی ہے وہ اصل میں صرف ان ہی کلیساؤں کے لئے لکھے گئے تھے جن کے نام وہ تھے جنھوں نے ان کو پہلے نقل کیا۔ وہ ہرگز ان کو ان معنوں میں پاک نوشتے نہ سمجھتے تھے جن معنوں میں ہم سمجھتے ہیں۔"

اس سے بھی صاف الفاظ میں وہی مفسر لکھتے ہیں کہ:

"پچھلی صدیوں میں ہم مقدس الفاظ کی حفاظت میں وہ احتیاط کا خیال نہیں پاتے جو عہد نامہ قدیم کے پہونچانے میں پایا جاتا ہے۔ ایک نسخہ کا نقل کرنے والا بعض وقت وہ الفاظ درج نہ کرتا تھا جو اصل عبارت میں موجود ہوتے تھے بلکہ وہ درج کر دیتا جو اس کے خیال میں درج ہونے چاہئے تھے۔ وہ ایک ناقابل اعتبار حافظہ پر بھروسہ کرتا۔ یا بعض وقت اصل عبارت کو بدل کر اس فرقہ کے خیال کے مطابق کر دیتا جس میں وہ خود ہوتا ابتدائی عیسائی بزرگوں کی عبارتوں اور حوالوں کے علاوہ قریباً چالیس ہزار نئے عہد نامہ کے یونانی نسخے موجود ہیں نتیجہ یہ کہ اختلاف عبارت بہت زیادہ ہے" (تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر بائبل انگریزی پادری ڈملو صاحب)

انجیل متی کے متعلق مسیحی علماء متاخرین کا یہ خیال ہے کہ یہ یونانی اور عبرانی دونوں زبانوں میں لکھی گئی تھی (تفسیر ہنری واسکاٹ مطبوعہ ۱۸۵۲ء جلد ۵ صـ۱) لیکن علماء متقدمین کا یہ قول تھا کہ یہ انجیل دراصل عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی جواب موجود نہیں (تفسیر لارڈنر مطبوعہ ۱۸۲۹ء جلد ۲ ہارن صاحب کی کتاب مطبوعہ ۱۸۲۵ء جلد ۴ تفسیر لارڈنر مطبوعہ ۱۸۲۹ء جلد ۲)

اور بقول بین ٹی سن "متی کا عبرانی نسخہ جسے جیروم نے نقل کیا سوریا میں موجود تھا" (تفسیر لارڈنر مطبوعہ ۱۸۲۹ء جلد ۲ صفحہ ۴۳۹) ۔ اس انجیل کا نسخہ جو اصل کہا جائے سوائے یونانی نسخے کے اب موجود نہیں اس بات کی تحقیق کرنا کہ وہ اصلی عبرانی نسخہ کب جاتا رہا نہایت ہی مشکل امر ہے بعض علماء مسیحی کا خیال ہے وہ بعد تباہی یروشلم جاتا رہا۔

نہ صرف یہی بلکہ یہ چار مروجہ اناجیل ان لوگوں کی لکھی ہوئی ثابت نہیں ہوتیں جن کے ناموں سے وہ منسوب ہیں بلکہ ان کے لکھنے والے کوئی اور ہیں فاسٹس جو اخیر چوتھی صدی عیسوی میں کہتا ہے کہ "یہ انجیل جو متی کی طرف منسوب ہے انکی تصنیف نہیں"۔ پروفیسر بائر جرمنی۔ شوزا اور سلش کا بھی یہی خیال تھا

پادری ڈملو صاحب متی کی انجیل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"جو کچھ اوپر بیان ہوا اس سے ظاہر ہے کہ اس انجیل کا براہ راست متی کی تصنیف ہونا غیر اغلب ہے" (تفسیر بائبل بزبان انگریزی صـ۶۲۵)

اور آگے چلکر ثبوت دیا ہے کہ متی نے کوئی کلمات وغیرہ مسیح کے جمع کئے ہوں گے جس کو اس مصنف نے استعمال کیا ہے اور اس کی تصنیف کا زمانہ جو خود پادری صاحبان بتاتے ہیں سنہ [illegible]ء ہے مگر واقعات سے سنہ ۱۵۰ء سے پیشتر مروجہ چار انجیلوں میں سے کسی انجیل کا کتاب کی صورت میں ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ لوقا اور مرقس کی انجیلوں کو عموماً ان مصنفوں کی سمجھا گیا ہے، مگر نئی تحقیقات سے ان کا ان انجیلوں کے مصنف ہونے پر شبہ کیا گیا ہے اور یہی حال انجیل یوحنا کا ہے جو پہلی صدی عیسوی کے آخر کی لکھی ہوئی سمجھی جاتی ہے۔

بہت سی مثالیں موجودہ اناجیل سے دیکھا سکتی ہیں جہاں علامت طور پر معنوی اور لفظی تحریف تسلیم کی گئی ہے اور نئے ترجموں میں اس کا اعتراف کیا گیا ہے مگر یہ تفصیلات ہیں جانے کا مقام نہیں (متی باب [illegible]) "مگر اس طرح کے دیو بغیر دعا اور روزے کے نہیں نکالے جاتے" ترمیم شدہ ترجموں میں سے نکال دی گئی ہے۔ اسی انجیل کے باب [illegible] میں جہاں کوئی شخص مسیح کو نیک استاد کہتا ہے تو آپ جواب دیتے ہیں "تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے"۔ ترمیم شدہ ترجموں میں یہ لفظ ہیں "تو مجھ سے نیکی کی بات کیوں پوچھتا ہے" (متی باب ۱۹- ۱۷) اس پر پادری ڈملو مرقس (ب [illegible]) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یا تو مصنف نے یا پہلے کسی کاتب نے عبارت میں تھوڑی سی تحریف کر دی تاکہ پڑھنے والا یہ خیال نہ کرے کہ مسیح اپنے نیک ہونے سے انکار کرتا ہے" مرقس کے آخری باب کی آیات (۹ تا ۲۰) کے متعلق اسی مفسر کو یہ اعتراف ہے کہ یہ بعد میں بڑھائی گئیں۔ مرقس کا نسخہ ایک زمانہ کے بعد جب تلاش کیا گیا تو نامکمل ملا۔ اس لئے ضرورت پورا کرنے کے لئے اس قدر آیات بعد میں بڑھا دی گئیں۔ غرض تحریف بائبل اب ایک اظہر من الشمس صداقت ہے اور خود محقق عیسائی اس بات کے معترف ہیں کہ توریت اور انجیل میں تحریف ہوئی۔

یہ ہے وہ بائبل جس کے بعض قصوں سے قرآن کریم کے بیان کردہ تاریخی حقایق کو مطابق نہ پاکر ڈاکٹر ٹسڈل نہ صرف غلط ٹھیراتے ہیں بلکہ مشکوک الصحت کتب بنی اسرائیل و اناجیل سے ماخوذ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ خود بائبل ایک مشکوک الصحت و تحریف شدہ کتاب ہے۔ (باقی)

ابو الفدا محمد عبد القادر مبلغ اسلام

(نگار) فاضل مضمون نگار چونکہ پیشہ ور مبلغ اسلام ہیں اس لئے انھوں نے اس بحث میں بھی وہی انداز اختیار کیا ہے جس کا مقصود زوایہ میں الجھا کر اصل مدعا سے روگردانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میں ان کے مقالہ کے اس حصہ کو بالکل غیر ضروری اور اصل بحث سے غیر متعلق ہے، شایع نہ کرتا، لیکن صرف اس خیال سے کہ انھیں کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملا، میں نے یہ جبر گوارا کیا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ اناجیل وغیرہ کو محرف ظاہر کرکے قرآن کے بیانات کو بیان دقرین عقل ثابت نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ بات کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ بہر حال ابو الفدا صاحب کا یہ مقالہ تو شایع ہو رہا ہے لیکن گفتگو کو مختصر کرنے کے لئے آیندہ اشاعت میں مثال دیکر بتاؤں گا کہ جواب کس بات کا اور کس انداز میں ہونا چاہئے۔

(نیاز)

پنجابی زبان کی ایک شاعرہ

امرت پریتم

پنجابی زبان کا مسکن صوبہ امبالہ سے ۱۰۰ میل شمال کی طرف ہے اور لاہور و امرتسر کا علاقہ اس لحاظ سے مرکزی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ لودھیانہ کے قریب سے ہندوستانی (کھڑی بولی) کے اثرات اس پر پڑنے لگتے ہیں۔

پنجابی بولی ہر جگہ ایک سی نہیں ہے۔ چنانچہ میانوالی (دریائے سندھ کے قریب) یا ملتان میں جو بولی بولی جاتی ہے اسے ایک لاہور نژاد پنجابی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا، لیکن کاروبار تصنیف و تالیف اور تبادلۂ خیال کے لئے صوبہ بھر میں لاہور ہی کی زبان استعمال کی جاتی ہے، جسے صوبۂ پنجاب کے ہر حصہ کے لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لاہور ہمیشہ حکومت کا صدر مقام رہا ہے اور تجارتی حیثیت سے بھی لاہور و امرتسر کے حصہ کو مرکزیت حاصل رہی ہے، اسی لئے تمام ادیب و شعراء یہیں کھنچ کھنچ کر پہونچے اور لٹریری حیثیت سے یہیں کی زبان نے اہمیت حاصل کی۔

پنجابی بولی ایک مخلوط زبان ہے جس میں فارسی اور سنسکرت کے الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ فارسی کے الفاظ زیادہ تر روز کی کاروباری و ادبی زبان میں اور سنسکرت کے الفاظ مذہبی اور فلسفیانہ لٹریچر میں۔

پنجابی زبان کے دو رسم خط ہیں ایک اردو نستعلیق اور دوسرا گورمکھی۔ گورمکھی رسم خط سنسکرت رسم خط کی کچھ تبدیل شدہ صورت ہے جسے پانچویں گرو نے ایجاد کیا تھا۔ سکھوں کی تمام مذہبی کتابیں گورمکھی رسم خط میں پائی جاتی ہیں، اور اسی رسم خط کے پنجابی لٹریچر کا ذکر اس جگہ مقصود ہے۔

جب سنہ ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے پنجاب فتح کیا، تو ان کے ساتھ بہت سے غیر پنجابی کلرک اور معلم بھی آئے جو انتظامی امور سے واقف تھے، چنانچہ محکمۂ تعلیم بنگالیوں اور یوپی کے رہنے والوں سے بھر گیا اور کچھ صوبۂ سرحد کے لوگوں سے اور اردو چونکہ یہاں کی عدالتی زبان تھی اس لئے یہاں کی تمام ذہنی پیداوار اسی زبان میں ہونے لگی اور اس سے جو جگہ بچی وہ انگریزی نے لے لی، نتیجہ یہ ہوا کہ پنجابی بولی کس مپرسی کی حالت میں پڑ گئی۔

اس کے بعد جب ملک میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو اسی کے ساتھ سکھوں نے اپنی اصلی زبان کی طرف بھی توجہ کی اور خالصہ کالج اور سکھوں کی تعلیمی کمیٹی کی بنیاد پڑی۔ اس تحریک میں سر سندر سنگھ، سردار جواہر سنگھ اور پٹیالہ کے گیانی دت سنگھ

نے خاص حصہ لیا پنجابی زبان کا ایک اخبار بھی جاری کیا گیا اور اسی زمانہ میں ایک شخص بھائی ویر سنگھ پیدا ہوا (۱۸۷۲ء) جس نے اپنی ادبی تصانیف سے پنجابی لٹریچر کو از سر نو زندہ کرنا چاہا۔

یہ نثر و نظم دونوں لکھتے تھے اور انھوں نے ہزاروں نئے لفظ پنجابی زبان میں رائج کئے۔ ان کا ڈرامہ "رانا سورت سنگھ" سکھ گھرانوں میں بڑے احترام کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور ان کی بعض دوسری تصانیف بھی پنجاب کے سکھوں میں بہت مقبول ہیں۔

بھائی ویر سنگھ کے بعد دھنی رام چترک نے شہرت حاصل کی، یہ ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ پنجابی زبان میں ان کی عاشقانہ شاعری کی بعض نظمیں کافی مقبول ہوئیں اور ان کا مجموعہ کلام چندن واری بہت مشہور ہے۔

یہ دونوں شاعر چوتھائی صدی سے زیادہ پنجابی شاعری پر حکومت کر چکے تھے کہ اس صدی کی ابتدا میں ایک نوجوان شاعر موہن سنگھ ابھرا۔ اور اس کا پہلا مجموعہ سوے پتر جو ۱۹۳۶ء میں شایع ہوا تھا بہت مقبول ہوا، چنانچہ اسکے سات اڈیشن نکل چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ ایک نوجوان شاعرہ امرت پریتم رونما ہوئی، موہن سنگھ اور امرت پریتم کی پنجابی شاعری چونکہ زمانۂ حال کی پیداوار ہے، اس لئے اس میں آزاد خیالی اور زندگی کی نمایندگی زیادہ نظر آتی ہے۔

وہ ایک نظم میں لکھتی ہے کہ: — "شاعری نام ہے غیر مشکل جذبات کے الفاظ میں منتقل ہو جانے کا۔ شاعری اور بچّہ دونوں پر دنیا کی بنیاد قایم ہے اور ان دونوں کی پیدائش کے وقت درد تکلیف ہونا ضروری ہے"۔

ایک اور جگہ وہ یہ خیال ظاہر کرتی ہے:

"محبت، اس غیر محدود ہستی کی طرح ایک دائمی صداقت ہے، شاعر وہی ہے جو فطرت سے قریب تر ہو اور فطرت نام ہے صداقت کا۔ جب شاعر کے کان قدرت کے دل کی دھڑکن سننے لگتے ہیں تو اس پر محبت و صداقت کے راز منکشف ہوتے ہیں"

ایک اور نظم میں کتنا پاکیزہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:

"دوسروں کو روشنی دینے کے لئے شمع و شاعر دونوں اپنے آپ کو پھونک دیتے ہیں"

امرت کور کا پہلا مجموعہ نظم امرت لہرن اپنے اندر کوئی خاص بات نہیں رکھتا۔ اس میں اس کی شاعری زیادہ تر رسمی ہے خیال اور ٹکنک دونوں حیثیتوں سے۔

اس مجموعہ میں اس نے کائنات، آفتاب، ماہتاب، ستارے، روشنی، تاریکی، موت و زندگی وغیرہ مختلف مظاہر قدرت کا ذکر کیا ہے، لیکن خیالات میں کوئی گہرائی یا جدت نہیں ہے، امرت پریتم مذہبی خیال کی لڑکی ہے اسی لئے اس کی بعض نظمیں بالکل گرنتھ صاحب کا چربہ ہیں، جن میں صرف خشک اخلاقی مباحث پائے جاتے ہیں، لیکن اس رنگ سے ہٹ کر اس نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں نہایت عمیق جذبات محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔

ایک جگہ وہ لکھتی ہے :

"میں رانجھا کی محبوبہ ہوں، مجھے ہیر نہ کہو، "رانجھینی" کہو۔"

دوسری جگہ وہ اپنے احساس نارسائی کو ان الفاظ میں ظاہر کرتی ہے :

"میرا ہر مسام تیری محبت سے لبریز ہے، لیکن پھر بھی میں تجھ سے کس قدر دور ہوں"

امرت پریتم، اپنے دوسرے مجموعۂ نظم جیونڈا جیون میں زیادہ بلند سطح پر نظر آتی ہے ۔

اس تالیف سے اس کا مقصد (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے) نئی نسل کو نئی زندگی کا درس دینا اور اسکے دل کو عزم و ارادہ سے لبریز کر دینا ہے ۔

چنانچہ وہ ایک جگہ اپنے آپ سے خطاب کرتی ہوئی کہتی ہے کہ :

"اے بلبل، دبی ہوئی حسرتوں سے پیدا ہونے والی قوت کو کام میں لا اور دوسروں کے دل مضبوط بنا۔ تیرے خون کا ہر قطرہ دشمن کے لئے بڑا خطرہ ہے۔"

ایک جگہ وہ اسی خیال کو ان الفاظ میں ظاہر کرتی ہے :

"اپنی گہری اور بلند محبت، اپنے لبریز جذبات نغموں اور اپنے دل کی سچی آواز سے دنیا کو جگا دے"

اس قسم کی نظموں میں اس نے صرف امید کا پیام نہیں دیا ہے بلکہ عمل کی طرف بھی مایل کیا ہے ۔ چنانچہ ایک جگہ وہ نوجوانوں سے خطاب کرتی ہوئی کہتی ہے :

"تم آپ اپنی دنیا ہو، اے نوجوانو، مقدر پر الزام نہ رکھو، اٹھو اور اپنی قسمت خود بناؤ"

وہ ملک کے نوجوانوں میں نئی روح پھونکنا چاہتی ہے اور ان کی نبض حیات میں گرم خون دوڑانا چاہتی ہے ۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتی ہے :

"وہ دیکھو امید کی شعاعیں سامنے ہیں ۔ وہ زندگی کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا ۔

وہ سامنے کا خوبصورت پہاڑ، اس میں شک نہیں، بہت بلند ہے اور اس پر چڑھنا مشکل ۔ لیکن جن کے دل مضبوط ہیں، وہ ہر زیادہ بلندی کو دیکھ کر زیادہ قوت سے آگے بڑھتے ہیں"

امرت پریتم کی تیسری کتاب "دھوتے پھول" دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی روح کو اس میں پالیا ہے اور اب اسکے دل سے بڑا بوجھ اٹھ گیا ہے ۔ اس مجموعہ میں وہ مغموم نظر نہیں آتی، بلکہ مسکراتی اور ہنستی دکھائی دیتی ہے ۔

اس میں وہ اپنے بچپن، اپنے گاؤں اپنے صوبہ اور اپنی قوم کا ذکر بہت پر لطف الفاظ میں کرتی ہے اور طرز ادا میں گفتگو کا سا انداز پیدا ہے ۔

اس کی نظموں میں خاص ترنم پایا جاتا ہے، چنانچہ "رقص حیات" کے عنوان سے جو نظم اس نے لکھی ہے اسکی ابتداہی

تان کے الفاظ سے کی ہے ۔

اس کے بعد امرت پریتم کی تین کتابیں اور شایع ہوئیں : "ودیگیان دا ... " ... ... "... پنجرہ نی لالی" ان میں اس کے جذبات زیادہ گہرے ، خیالات زیادہ عمیق اور تصورات جدت آمیز نظر آتے ہیں ... اس کی آخری کتاب کے متعلق نقادوں کا خیال ہے کہ وہ پنجابی لٹریچر میں بڑا قیمتی اضافہ ہے ۔

ایک جگہ وہ لکھتی ہے :

"زمانہ کی دیواریں شیشہ کی دیواریں ہیں کہ تم چیزوں کو اس پار دیکھ تو سکتے ہو لیکن ان تک پہونچ نہیں سکتے"

"امرت پریتم" صرف شاعری ہی کی حد تک وطن پرست نہیں ہے بلکہ اس نے عملی حیثیت سے بھی زندگی کی تلخیوں کا مطالعہ کیا ہے ، اور اسی لئے اس کی بعض نظموں سے اس کے عمیق مطالعہ کا پتہ چلتا ہے ۔ وہ مزدوروں کی زندگی کا خاکہ کھینچتی ہوئی ایک جگہ لکھتی ہے :

"جب کام ختم ہونے کے بعد تو اپنے چٹان ایسے سینے اور فولاد ایسے اعصاب کو تھکا کر شام کو گھر واپس آتا ہے تو تیرے جسم پر سوائے کوئلہ کی خاک کے اور کچھ نظر نہیں آتا اور تیری سانس کا دھواں بالکل چمنی کی دھوئیں کی طرح بلند ہوتا ہے"

اب امرت پریتم نے مختصر افسانے لکھنے بھی شروع کئے ہیں اور ان میں بھی وہی سب کچھ ہے جو اس کی شاعری میں پایا جاتا ہے --- اس کے دس افسانوں کا ایک مجموعہ "۲۶ سال بعد" کے نام سے حال ہی میں شایع ہوا ہے ---　　مدن گوپال (بمبئی کرانیکل)

روح علمی نقطۂ نظر سے

بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا، زندگی کی ان منزلوں سے ہر ایک کو گزرنا ہے، یعنی نہ محض فرداً فرداً بلکہ خاندان، گروہ، قومیں اور بنی نوع انسان بحیثیت مجموعی سب کو یہ منزلیں پیش آتی ہیں۔

نوع انسان کا بچپن وہ تھا جب اس نے بول چال کی ابتدا کی اور اسی دور طفولیت میں جب کہ اس کا سبق "کیوں، کیا، کیسے" ہی تک پہونچا تھا، عقاید کی ابتدا ہوگئی۔ میں کیا ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ مرنے کے بعد کہاں جاؤں گا؟ میرے گرد و پیش کے حالات و واقعات، دن رات، آندھی، ژالہ باری، دھوپ، بارش، پیدایش اور موت وغیرہ کا ذمہ دار کون ہے؟ وغیرہ وغیرہ سوالات قایم کرکے ان کے جوابات ڈھونڈھ نکالنے کی سعی کا نتیجہ، اس کمسنی اور کم فہمی کے عالم میں، سوائے چند در چند غیر مدلل عقاید قایم ہو جانے کے کچھ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ فطرت اسی کی متقاضی تھی۔ ۲۱

انہی ابتدائی عقاید میں سے ایک روح اور اس کی بقا کا عقیدہ ہے "میرا دل نہیں چاہتا کہ اتنی تھوڑی سی زندگی کے بعد میں ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاؤں، میرا جی زندگی سے بھرا نہیں ہے۔ آخر یہ خواب میں مردہ لوگ چلتے پھرتے، ہنستے بولتے کیوں نظر آتے ہیں؟ ضرور یہ لوگ ظاہری موت کے باوجود زندہ ہیں، میں بھی انہی لوگوں کی طرح ظاہری موت کے بعد ضرور زندہ رہونگا موت کے بعد جسم بھی یقیناً موجود رہتا ہے، اور گو زندگی کی رونق باقی نہیں رہتی اور مرنے والا ہنستا، بولتا، چلتا، پھرتا نہیں مگر ضرور اس میں کوئی چیز رواں دواں تھی جو اب نہیں ہے، ہو نہ ہو یہ روح تھی جو مرتے وقت جسد خاکی سے جدا ہو کر بھی باقی ہے اور زندگی بعد از موت کے مدارج طے کر رہی ہے"۔ کتنا خوشگوار اور تسلی بخش خیال ہے! خیال کا حسب منشا ہونا ہی اسکے قابل قبول ہونے کی دلیل تھا، یہی وجہ ہے کہ روح کا تخیل دنیا کے گوشے گوشے میں، وحشی سے وحشی لوگوں تک میں موجود ہے بعض لوگوں کے نزدیک ہر جسم میں روحیں دو ہوتی ہیں ایک ہر وقت جان کے ساتھ جسم میں موجود رہتی ہے اور ایک جب انسان سوتا ہے تو سیر و سیاحت کو نکل جاتی ہے۔ چینی کہتے ہیں کہ جسم میں تین روحیں ہوتی ہیں۔ ایک روح مرنے کے بعد دوسرے عالم کو چلی جاتی ہے دوسری مُردے کے ساتھ قبر میں اُتر کر ہڈیوں کی نگرانی کرتی ہے اور تیسری طرح طرح سے فضائے بسیط میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ جاپانی دیہاتی ابتک روح کو ایک چھوٹی سی گول اور سیاہ رنگ کی چیز سمجھتے ہیں۔ بحر الکاہل کے بعض جزیروں کے باشندے یقین کرتے ہیں کہ روح ایک رقیق شے ہے جو جسم کے ہر ہر حصے میں پھیلی ہوئی ہے۔ جزیرہ نما ملایا میں روح سُرخ رنگ کی اور مکئی کے دانے کے برابر ہوتی ہے، بعض کے نزدیک وہ ابخراتی چیز ہے جھلی دار اور

ہاتھ کے انگوٹھے کی برابر۔ قدیم ہندوؤں کے نزدیک بھی روح سکشم شریر یعنی شفاف جسم رکھتی اور انگوٹھے کی برابر ہوتی ہے۔

جیسے جیسے انسان کے قوائے ذہنی میں ترقی ہوتی گئی اور جوں جوں تلفظی بول چال کا پھیلاؤ بڑھتا گیا دوسرے خود ساختہ عقاید کے ساتھ ساتھ روح کے عقیدے پر بھی حاشیہ آرائی ہوتی گئی۔ اسی کے وجود نے سزا جزا، دوزخ و بہشت کی تعمیر کرائی۔ یہ عرض کرنا فضول ہوگا کہ ان سوالات کو استدلال اور تجربے سے کوئی لگاؤ نہیں۔ عقیدہ کہتے ہی اُسے ہیں جسے استدلال، تجربہ اور عقل کو دخل دئے بغیر بے چون وچرا، مان لیا جائے

لیکن اب کہ بنی نوع انسان واہمہ پرستی سے گزر کر تفتیش حقایق تک پہونچ گئی ہے اور عقیدوں کو عقل کے معیار سے پرکھنے کی جسارت کی جارہی ہے، صورت حال بالکل بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔

ممکن ہے کہ موجودہ تفتیش و تجسس، استدلال و تجربہ سے برآمد شدہ نتائج کے سمجھنے میں غلطی ہو جائے اور آگے چلکر تجربہ انھیں، دوسرے سائنسی مسائل کی طرح کسی حد تک مسترد کر دے مگر اب اس بات کا امکان باقی نہیں رہا کہ وہ لوٹ کر پھر سے عقاید تمندی کا سہارا لینے پر آمادہ ہو جائے گا۔

روح کے متعلق سائنس نے سوالات پیش کئے ہیں کہ وہ کیا اور کیسی شے ہے؟ کہاں سے آتی ہے، کب آتی ہے اور کس طرح آتی ہے؟ وہ یہ نہیں پوچھتا کہ کہاں جاتی ہے اس لئے کہ سائنس کے نزدیک جب تک اس کا وجود باقی نہ ہو اس قسم کے سوالات پیدا ہی نہیں ہوتے۔ اس کا آخری اور شاید زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ آخر روح کا مصرف کیا ہے؟

علم پیدایش کے محققین نے دریافت کیا ہے کہ ماں کے جسم میں جاندار بیضے ہوتے ہیں، جن میں ایک لجلجی چیز انڈے کی سفیدی جیسی بھری ہوتی ہے اور باپ کے مادۂ تولید کا ہر قطرہ بہت سے جاندار ننھے ننھے، مینڈک کے بچوں کی شکل کے کلیھڑ رکھنے والے دُمدار ریشوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب باپ کے مادے کا ایک ریشہ مادر کے کسی بیضے میں داخل ہو جاتا ہے تو یہ شادابی ہو جاتا ہے یعنی بیضہ اور ریشہ ملکر ایک نیا قطرہ گوشت دخون کا بنجاتا ہے جو ماں کے خون اور دیگر رطوبات سے پرورش پاکر بچے یا انسان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ شکلوں کی تبدیلی تدریجی ہوتی ہے اس لئے ان کے وقت کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔

جب یہ دو جاندار چیزیں (بیضہ اور ریشہ) دو مختلف جسموں سے آتی ہیں تو روح ان میں کس وقت حلول کرتی ہے؟ کیا وہ اُن جاندار بیضوں اور ریشوں میں موجود نہ تھی؟ اگر تھی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر مرد اور ہر عورت میں لاتعداد روحیں موجود رہتی ہیں جن میں سے صرف آدھی آدھی روح دونوں فریق سے لیکر ایک انسان طیار ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں روح کا تخیل ہی غلط ہو جاتا ہے اور اگر ان ریشوں اور بیضوں میں روح نہیں ہوتی اور وہ بعد کو پہونچتی ہے تو اس کا اور جان کا چولی دامن والا ساتھ باقی نہیں رہتا۔ ایسی روح کی آمد کا ذریعہ اور وقت عقیدہ تو قایم کر سکتا ہے مگر

سائنس کے بس کی بات نہیں، اس کے ہاں تو ہر دعوے کا ثبوت استدلالی بلکہ تجرباتی ہونا چاہئے۔

دوسرا اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ روح کا فعل کیا ہے، وہ انسان کے کن کن افعال و جذبات کی ذمہ دار ہے؟ اس کا مصرف کیا ہے اور کیوں اس کے وجود کا ماننا ضروری ہے؟

علم الابدان کی جدید معلومات واضح کرتی ہیں کہ انسان کھاتا، پیتا اس لئے ہے کہ خوراک سے خون بنکر جسم میں دوڑتا اور اسے برقرار رکھتا ہے، اسی خوراک کا فضلہ قضائے حاجت کا سبب ہوتا ہے۔ سوتا اس لئے ہے کہ قوائے جسمانی کی کام کرنے کی قوت محدود ہے، سونے سے انھیں آرام پہونچتا ہے اور وہ پھر کام کرنے کے لئے تازہ ہو جاتے ہیں۔ لیٹتا، بیٹھتا، اُٹھتا، چلتا اس لئے ہے کہ قوائے جسمانی کو تندرست رکھنے کے لئے ان کی ورزش ضروری ہے ——— سوچتا اس لئے ہے کہ اس کے دماغ کی ساخت میں چند غدود ایسے ہیں جو حافظہ اور سوچنے کی قوت قائم رکھتے ہیں یا یوں کہئے کہ دماغ پر دیکھنے، سننے، پڑھنے اور محسوس کرنے سے جو عکس پڑتے ہیں انھیں برقرار رکھتے ہیں۔ دوا دیکر ان غدودوں کے عمل کو بڑھایا جا سکتا ہے، ساتھ ہی ان کے عمل کو گھٹایا یا ختم بھی کیا جا سکتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مریض اچھا خاصا آدمی ہوتے ہوئے بھی خفیف الحرکات یا فاتر العقل ہو جائے۔ کچھ غدود ورقی جن میں ایک رقیق مادہ بھرا ہوتا ہے انسان کے خوف و ہراس کے ذمہ دار ہیں۔ اگر دوسرے جانور کے انہی غدودوں سے مادہ لیکر کسی انسان کے غدودوں میں انجکشن دیدیا جائے تو بہادر سے بہادر انسان پر بے بات کا خوف و ہراس طاری ہوا کرے گا۔ کچھ غدود جوانی کی اُمنگوں کے ذمہ دار ہیں۔ اگر کسی بوڑھے کے ان غدودوں کو کسی جوان انسان یا جوان بندر کے غدودوں سے تبدیل کر دیا جائے تو جوانی پھر سے بڑے میاں کو گُدگُدانے لگتی ہے۔

یہ استدلالی گواہیاں نہیں تجرباتی مشاہدات ہیں جو اس امر کو بدرجۂ اتم ثابت کر دیتے ہیں کہ جس طرح انسان کی ہر جسمانی خواہش، ضرورت یا حرکت کا محرک اسی کے جسم میں موجود ہے ٹھیک اسی طرح اس کی نفسیاتی اور جذباتی حرکتوں کے محرکات بھی اسی جسم میں ہوتے ہیں۔

یہ بھی پایۂ ثبوت کو پہونچ چکا ہے کہ انسانی محرکات سب کے سب، دیگر حیوانات، بلی، کتا، بندر وغیرہ وغیرہ میں بھی موجود ہیں۔ یہی نہیں بعض جانوروں کے بعض غدود انسان سے تبدیل کئے جا سکتے ہیں ——— پھر کیوں تسلیم کر لیا جائے کہ ان محرکات کے ہوتے ہوئے انسان اور صرف انسان کے جسم میں ایک خواہ مخواہ کی فاضل شئے روح نامی بھی ہے جو اس کے مرنے کے بعد بھی مراحل زندگی طے کیا کرتی ہے؟۔ اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے اور وہ یہ کہ تصویر انسان کی بنائی ہوئی ہے۔

مصطفیٰ سرسوی

مکتوبات نیاز

گرامی عزیز - معاف فرمائیے، آپ کے خط کا جواب غیر معمولی تاخیر سے جا رہا ہے، آپ جانتے ہیں میں
ہ اس موسم میں میرا کیا حال ہوتا ہے - دُنیا فصلِ بہار میں دیوانہ ہوتی ہے اور میں خزاں میں -!
آپ نے غالب کے باب میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے بالکل متفق ہوں، اُردو فارسی دونوں میں اس کی
نفرادیت عدیم المثال ہے، لیکن اگر میں اس کے اُردو کلام کا انتخاب کرتا تو یقیناً دیوان کے بعض موجودہ
شعار حذف کر دیتا اور چھٹے ہوئے اشعار میں سے بعض شامل کر دیتا
ناسخ کا ایہام اور مبالغہ اس میں شک نہیں ایک وبا تھی جس میں لکھنؤ سے لیکر دہلی تک ہر شاعر کسی نہ کسی
حد تک مبتلا ہوا - شاہ نصیر نے تو خیر اسی کی بدولت اپنی شاعری تباہ کی، لیکن حیرت تو غالب پر ہے کہ وہ بھی
ن چوچلے میں گرفتار ہو گیا -
میں نے ایک بار غالب کے ایسے اشعار کا انتخاب شروع بھی کیا تھا جو ایہام و ناگوار مبالغہ کی وجہ
سے نظری ہونے کے قابل ہیں، اور ارادہ تھا کہ ایک مقالہ کے ساتھ انھیں پیش کر دوں گا، لیکن یہ خیال
پ تک پورا نہ ہو سکا - اب آپ اس کے لئے آمادہ ہیں تو میں یہ انتخاب آپ کے پاس بھیج دوں گا، اگر مل گیا،
ا لاّ چند اشعار اس قسم کے اسی وقت سن لیجئے:

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

م سے مراد یہاں تلوار کی باڑھ ہے لیکن چونکہ سانس کو بھی دم کہتے ہیں، اس لئے اس کی رعایت سے
سینۂ شمشیر" بھی پیدا کیا گیا اور دم کا باہر آنا بھی - ورنہ دراصل پہلے مصرعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں
ر نہ "جذبۂ بے اختیار شوق"، کا یہ کوئی ثبوت ہے -

بیاں کیا کیجئے بیداد کاوشہائے مژگاں کا کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

ا شعر میں ایہام تو نہیں، لیکن محض کاوش کی رعایت سے دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہو گیا، ورنہ ظاہر ہے کہ
طرۂ خوں" میں کاوشِ مژگاں سے سوراخ ہو جانا اور اس کا رشتۂ تسبیح میں پروئے ہوئے دانۂ مرجاں کی صورت

اختیار کرلینا کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

اسی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو   لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشۂ نیستاں کا،

فارسی کا محاورہ ہے "خس بدنداں گرفتن" اور اس کا مفہوم ہے اظہار عجز کرنا۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "اظہار عجز کے لئے جب میں نے تنکا دانتوں میں لیا تو وہ بھی ریشۂ نیستاں ہوگیا۔ اور سطوت قاتل بھی مجھے نالہ کرنے سے باز نہ رکھ سکی۔ چونکہ نَے، نیستاں ہی میں پیدا ہوتی ہے اور نَے کی فریاد مشہور چیز ہے، اس لئے محض تنکے کی رعایت سے یہ طومار باندھ دیا۔

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا   شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

اس شعر میں ایہام تو نہیں لیکن رعایت لفظی اور مبالغہ کا اہمال یقینی ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ "رات میرے برقِ سوزِ دل کا یہ عالم تھا کہ ابر کا پتہ بھی پانی ہوگیا اور اس پانی میں جو بھنور پڑتا تھا وہ شعلۂ جوالہ نظر آتا تھا"

محض اس لئے کہ سوزِ دل کو برق کہا گیا، ابر، گرداب اور شعلۂ جوالہ لائے گئے ورنہ ان کے استعمال کا کوئی موقعہ نہ تھا۔

ناگوار مبالغہ کی ایک مثال اسی غزل کا یہ مصرعہ بھی ہے:

گریہ سے یاں پنبۂ بالش، کفِ سیلاب تھا

اتنا روناکہ تکیہ کی روئی سیلاب کا کف بن جائے، حد درجہ لایعنی بات ہے

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے   خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

سیلاب کے آنے سے دل اتنا خوش ہے گویا خانۂ عاشق جلترنگ (باجا) ہوگیا ہے۔

سیلاب کی وجہ سے "نشاط آہنگی کا ثبوت دینے کے لئے، شاعر نے گھر کو جلترنگ کہدیا، ورنہ ظاہر ہے کہ جلترنگ سے ایک سیلاب زدہ گھر کو کیا واسطہ!

ایک اور غزل کے یہ دو شعر بھی بالکل اسی قسم کے ہیں:

گرنہ اندوہِ شب فرقت بیاں ہو جائے گا   بے تکلف داغ مہ، مُہر دہاں ہو جائے گا

زہرہ گر ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب   پرتو مہتاب سیل خانماں ہو جائے گا،

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا   خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا،

مدعا یہ کہ شراب کا قطرہ فرطِ حیرت سے منجمد ہوگیا اور پیالہ کا خط ایسا نظر آنے لگا جیسے تاگے میں موتی پروئے گئے ہوں۔

اول تو حیرت کا کوئی سبب ظاہر نہیں کیا گیا دوسرے یہ کہ "خطِ جام" بھی ایک فرضی چیز ہے، اور پھر یوں بھی شراب کی بوندوں کا جم جانا اور خطِ جام کا موتیوں کے ہار کی طرح نظر آنا کس قدر غیر پسندیدہ مبالغہ ہے۔

علاوہ مبالغہ و ایہام کے غالب نے بعض اشعار میں استعارے و کنائے بھی اس قدر ضعیف اور بعید الفہم استعمال کئے ہیں کہ کوئی لطف ان سے پیدا نہیں ہوتا، مثلاً:

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا، یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ باغ کا کوئی حصہ بیکار نہیں۔ یہاں تک کہ باغ کی روش (جادہ) پر بھی لالہ ہی لالہ پھولا ہوا ہے۔

جادہ، چونکہ فی الجملہ فتیلہ سے مشابہت رکھتا ہے اور داغ، چراغ سے اس لئے غالب کی دشوار پسند طبیعت نے یہ استعارۂ بعید ڈھونڈھ نکالا۔

اسی غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا،

اس شعر کا پہلا مصرعہ باوجود دقیق فارسی ترکیب کے نہایت اچھا ہے، لیکن دوسرے مصرعہ میں نہایت بعید الفہم تعبیر سے کام لیا گیا ہے۔ مقصود یہ کہنا ہے کہ شراب پئے بغیر عالم ہوش کے جھگڑوں سے نجات ممکن نہیں، لیکن ہماری پست حوصلگی نے جامِ شراب میں بھی ایک خط کھینچ دیا ہے کہ اس سے زیادہ پینے پلانے کی کوئی صورت نہیں

یہ غزل پوری کی پوری اسی رنگ کی ہے۔

اس کے بعد کی غزل "پنہاں سمجھا" بھی سوائے مقطع کے بالکل اسی رنگ کی ہے۔ علاوہ ان کے، ناموس تھا، لیلیٰ آشنا، رخسارِ دوست، بیاباں پر، گردن پر وغیرہ متعدد غزلیں اس قابل ہیں کہ ان کو دیوان سے نکال دینا چاہئے، اس طرح ایک چوتھائی حصہ تو کم ہو جائے گا، لیکن اس کے بعد جو کچھ رہ جائیگا وہ ایسی چیز ہوگی، جس کا جواب نہ ہوگا۔

غالب کی وہ خصوصیت جو کسی اور کے کلام میں نظر نہیں آتی، اس کا اچھوتا پن ہے، وہ معمولی سی بات کو بھی ایسے عجیب و غریب زاویہ سے پیش کرتا ہے کہ سنکر اچنبھا سا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس کی یہی خصوصیت دشوار گوئی کے سلسلہ میں تو ذوق پر بار ہو جاتی ہے، لیکن اس کی سہل و آسان اشعار میں معجزہ نظر آنے لگتی ہے۔

شعراء کا دستور ہے کہ قافیہ کو سامنے رکھ کر مضمون کی جستجو کرتے ہیں، پھر بعض قوافی تو ایسے ہوتے ہیں کہ پورے شعر کا مفہوم اپنے ساتھ لاتے ہیں اور بعض کے لئے مضمون کی جستجو کرنا پڑتی ہے اور ایک شاعر کا کمال یہی ہے کہ اگر کوئی مضمون پامال بھی سامنے آئے تو اندازِ بیان سے اس میں جدت و شگفتگی پیدا کردے اور یہی وہ خصوصیت غالب کی ہے جس میں اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

اس کی ایک غزل ہے، مرد تھا، فرد تھا۔ اس میں اس نے قافیہ درد کا بھی نظم کیا ہے، لیکن نہایت بدیع انداز سے ۔ "درد تھا" پر غور کرنے کے بعد ایک شاعر کی نگاہ سب سے پہلے یقیناً دل ہی کی طرف جاتی ہے اور سامنے کی یہی بات ذہن میں آتی ہے کہ "دل میں قیامت کا درد تھا" یا اسی مفہوم کا کوئی اور فقرہ، لیکن غالب نے جس زاویہ سے اس قافیہ کو پیش کیا ہے وہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک پہلا مصرعہ اس کے ذہن میں نہ ہوتا اور "دل کا درد" "دل جانے کے درد" کے مفہوم میں کہنا ہر شاعر کا کام نہ تھا۔

رازداں اپنا، آستاں اپنا والی پوری غزل اسی قسم کی ندرت و جدت سے معمور ہے۔ پاسباں اپنا کہکر کوئی شاعر، ان دونوں لفظوں کے ربط کو ایک دوسرے سے جدا کرکے یہ مصرعہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ:

بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں، اپنا

اور پھر اس پر جو پہلا مصرعہ لگایا ہے اسے غالب ہی کہہ سکتا تھا۔

ایک شاعر "ان کے پاسباں کو اپنا آشنا" کہکر پہلے مصرعہ میں زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکتا تھا کہ "اب ہم اپنے نکالے جانے کی طرف سے مطمئن ہوگئے ہیں" لیکن یہ کہنا کہ:

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے

غالب کے سوا کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔

جذباتی غزلوں میں یہ التزام بہت مشکل ہے، لیکن غالب کی جدت پسند طبیعت یہاں بھی اپنا کام کر جاتی ہے اس کی ایک بڑی مشہور غزل ہے۔ "چراغاں کئے ہوئے" اور اس میں شک نہیں کہ جذبات تغزل کے لحاظ سے بڑی معیاری چیز ہے، لیکن اس میں ہر قافیہ کا صرف بالکل نئے پہلو سے ہوا ہے۔ پریشاں، جاناں، عنواں، نمکداں، درباں، طوفاں بالکل سامنے کے قافیے ہیں اور گو ردیف کی دشواری نے ان کے صرف کو مشکل بنا دیا تھا، پھر بھی پیش پا افتادہ بہت سے مضمون موجود تھے، لیکن ان قافیوں کو غالب نے جس ندرت و تازگی کے ساتھ استعمال کیا ہے میں اسے شاعری کا معجزہ کہتا ہوں۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس	زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت، کہ رات دن	بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے
پھر پُرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے
غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے — بیٹھے ہیں ہم، تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

آنسو کو موتی سے زیادہ آبرو کی چیز سمجھنا، بہت پیش پا اُفتادہ مضمون ہے۔ لیکن دیکھئے غالبؔ نے کس لطف و نادر انداز سے اس مفہوم کو پیش کیا ہے:

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

"تردامنی" معصیت کے معنی میں آتا ہے اور سبھی نے اس کا استعمال کیا ہے۔ لیکن غالبؔ کی ندرت پسندی ملاحظہ ہو:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اس مفہوم کو بالکل نئے پہلو سے ایک اور شعر میں یوں ظاہر کرتا ہے:

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

غالبؔ کی نگاہ اس درجہ غایر تھی کہ وہ معمولی باتوں میں بھی ایک خاص عظمت و جلالت پیدا کر دیتا ہے۔

بیاباں کا تصور بہت عام ہے اور شاعر و غیر شاعر سبھی اس سے واقف ہیں، لیکن شاید غالبؔ ہی پہلا شخص تھا جس کا تصور اس حقیقت کی طرف گیا کہ:

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

مشکل زمینوں میں شگفتہ اشعار نکالنا، مصحفیؔ کا حصہ تھا اور اس باب میں کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہیں، لیکن غالبؔ کے یہاں بھی ہم کو اس کی بڑی پاکیزہ مثالیں ملتی ہیں۔ "خوں وہ بھی۔ جنوں وہ بھی" اس کی بڑی مشہور غزل ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ "وہ بھی" بڑی ٹیڑھی ردیف ہے۔ لیکن غالبؔ کے تمام اشعار سانچہ میں ڈھلے ہوئے ہیں اور جس تیور کے ساتھ اس نے یہ غزل لکھی ہے، اس کی مثال اردو شاعری میں مل نہیں سکتی۔ اور خصوصیت کے ساتھ مقطع تو اس بلا کا لکھ گیا ہے کہ اس کو سنکر ہم ساکت تو رہ سکتے ہیں، لیکن کچھ کہہ نہیں سکتے۔

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جب اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

باوجود دشوار پسندی اور دقیقہ سنجی کے غالبؔ کے یہاں سوز و گداز اتنا ہے کہ وہ کتنی ہی مشکل زبان کیوں نہ

استعمال کیجئے دل پر اثر ضرور ہوتا ہے - یہ غالباً اس وقت کے ماحول کا نتیجہ تھا، سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ اسکے سامنے گل ہوا، امراؤ شرفاء پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں وہ خود اس نے اپنی آنکھ سے دیکھیں، اس لئے اسکا دل بہت دُکھا ہوا تھا اور عیش و نشاط کا ذکر بھی وہ بغیر آہ اور کراہ کے نہیں کرسکتا تھا چنانچہ دیوان غالب میں اگر جستجو کی جائے تو خدا جانے کتنے اشعار ایسے ملیں گے جو "شہر آشوب" اور "مرثیہ" کا رنگ رکھتے ہیں - ایک مشکل زمین کے چند شعر سنئے :

گلشن میں بند وبست بہ رنگ دگر ہے آج ۔۔۔ قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ ۔۔۔ تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج،
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل ۔۔۔ سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

کیا اس سے زیادہ دردناک الفاظ میں بہادر شاہ ظفر کی معزولی و گرفتاری کا مرثیہ کہا جا سکتا ہے ؟

سلطنت مغلیہ کی مٹتی ہوئی عظمت کا بیان انھوں نے اکثر جگہ مختلف انداز سے کیا ہے اور کہیں کہیں تو پوری غزل اس کے لئے وقف کر دی ہے - ملاحظہ ہو :

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے ۔۔۔ ایک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے
اے تازہ واردانِ بساط ہوائے دل، ۔۔۔ زنہار اگر تمھیں ہوس نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو، ۔۔۔ میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط ۔۔۔ دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں، ۔۔۔ نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی، ۔۔۔ اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

کہاں تک کہوں، غالب کا جواب نہ ہوا ہے، نہ ہوگا، زمانہ جتنی ترقی کرتا جائے گا، غالب کی شاعرانہ حقیقت اتنی ہی زیادہ نمایاں ہوتی جائے گی، اور اس کا یہ شعر قطعاً الہامی ہے :

کوکبم را در عدم اوج قبولے کردہ است ۔۔۔ شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

چند نہایت ضروری باتیں

۱- اپنا نمبر خریداری جو ہر مہینے پتہ کی چٹ پر بائیں طرف درج ہوتا ہے، اسے نوٹ کر لیجئے اور خط و کتابت میں اس کا حوالہ ضرور دیجئے
۲- اگر پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع ۲۰ تک ہمیں نہ ملی تو پھر پرچہ کسی طرح نہیں مل سکتا -
۳- جواب کے لئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجئے ورنہ جواب کی توقع نہ رکھئے -

باب الانتقاد

سید سلیمان ندوی کی "حیات شبلی"

علامہ سید سلیمان ندوی کا تازہ ترین کارنامۂ ادب، مولانا شبلی مرحوم کی سوانح عمری ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ موصوف کی شبلی شناسی اور کاغذ کی اس نایابی کے زمانہ میں تقریباً ہزار صفحات کی اس ضخیم کتاب "حیات شبلی" کی طبع و اشاعت پر ہم تحسین و آفرین کا غلغلہ بلند کرتے مگر اس کو کیا کیجئے کہ یہاں مطلع ہی میں سخن گسترانہ بات آپڑی ہے اور اپنی حق پسند اور حق شناس طبیعت جادۂ صداقت سے تجاوز پر آمادہ نہیں ہوتی۔

یوں تو غلام آباد ہند میں مفلسان علم کی چیرہ دستیوں سے دولت علم ہمیشہ سے غیر مامون رہی ہے۔ مگر اس سلسلہ کی وہ کڑی جس کا ذکر ہم آج کرنا چاہتے ہیں ان سب سے بالاتر، ان سب سے عجیب تر، ان سب سے حیرت انگیز ہے۔

ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا ایک دو فقرہ اپنی تحریر میں پیوند کرلیا یا دوسرے کی تراوش فکر کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر منظر عام پر لاسئے۔ لیکن وہ جس کے نام کے آگے علامہ لکھا جاتا ہو۔ جس کا شمار ملک کے ممتاز ارباب قلم میں ہو۔ جسکو حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی سے شرف بیعت حاصل ہو، اس کی ذات سے ایسے رشحہ قلم کی امید ہرگز نہیں کی جاسکتی تھی جو اردو ادب کے دامن کو داغدار بنائے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

اول اول جب یہ حقیقت میرے سامنے آئی تو بڑی دیر تک اس کو اپنے نقص فہم اور قصور دید کا نتیجہ سمجھتا رہا۔ لیکن بار بار کے مطالعہ اور پیہم غور و فکر کے اصرار پر بالآخر یہ تسلیم کرنا پڑا کہ حیات شبلی بڑی حد تک انھیں مکمل سلسلۂ مضامین کا اعادہ ہے جو مولانا اقبال احمد سہیل کے قلم اور "سیرت شبلی" کے عنوان سے "الاصلاح" (سرائے میر۔ اعظم گڈھ) کے مختلف نمبروں میں ۱۹۳۶ء سنہ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں بالاقساط شایع ہوئے تھے۔ البتہ بھان متی کی طرح "کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا" جوڑنے پر ضرور عمل کیا گیا ہے اور سلسلۂ کلام کو نظرانداز کرکے بہت کچھ کتر بیونت کی گئی ہے۔

اپنی اس عمارت کی طیاری میں جناب مولف نے وہ تمام مسالے استعمال کئے ہیں جو اس کی بنا کو کم سے کم تھوڑی دیر کے لئے مستحکم بنانے میں بکار آمد ہوسکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ناسپاسی اور کتمان حق کی وادی میں پڑجانے کا خوف بھی ان کے دل سے جاتا رہا ہے۔ جس کی ایک بین مثال موصوف کی تحریر کے وہ دونوں ٹکڑے ہیں جو "حیات شبلی کی ترتیب کا آغاز و انجام" اور "معاونوں کا شکریہ" کے زیر عنوان کتاب کے دیباچہ میں صفحہ ۔ اور ۸ میں درج ہیں۔ مولانا سہیل کے مضمون کی نسبت ارشاد ہوتا ہے: "الاصلاح سرائے میر ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے چند نمبروں میں مسلسل نکلتا رہا" اگر "مسلسل" کی مناط بیانی کو نظرانداز

بھی کر دیجئے تو پیندرہ نمبروں میں نکلنے کی حقیقت کو کیا کیجئے گا۔ ممکن ہے آپ فرمائیں کہ ان کی نظر سے چھ ہی نمبر گزرے ہوں گے مگر مولانا کا ذوق انتخاب آپ کو اس کا موقع ہی کب دینے لگا، جو حیات شبلی کے صفحات میں اس کے خلاف شہادت دے رہا ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ   شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس سے بڑھ کر لطیفہ یہ کہ جس سودہ کو "گھٹا بڑھا کر" مولانا سہیل اپنا مقالہ طیار کرتے ہیں مولوی عبدالسلام صاحب کے وہی "مجموعۂ اوراق" سید صاحب کے لئے محض "مکاتیب کی ورق گردانی اور مسودات کی تلاش کی مصیبت" سے نجات دینے کا باعث بنتے ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

مگر جس کا اُصول "نمی رویم بہ راہے کہ کارواں رفت است" ہو اس کے بارہ میں اس طرح کا تعجب کیوں کیجئے یہ الگ بات ہے کہ وہ سعدی کے اس مقولہ پر عمل کرتے ہوں :

برعکس نہند نام زنگی کا فور

اس مختصر تمہید کے بعد آیئے اس سرقۂ مقدس کی چند مثالیں بھی سُن لیجئے۔ ذیل میں دونوں صاحبوں کی تحریریں ہم بالمقابل نقل کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ناظرین خود فیصلہ کر لیں کہ ہمارے اس بیان میں صداقت کا پہلو کہاں تک ہے۔

حیات شبلی صفحہ ۶۰ - ۶۸

"بیٹوں میں سب سے بڑے علامہ مرحوم تھے انسے چھوٹے مسٹر مہدی حسن مرحوم تھے۔ ان کی غیر معمولی ذہانت وطباعی اور خردانہ اطاعت وپاس ادب کا اعتراف مولانا کو ہمیشہ رہا اور مولانا کو بھی ان سے مخصوص محبت تھی چنانچہ جب اپریل ۱۸۹۵ء میں وہ انگلینڈ کو روانہ ہوئے اور شیخ صاحب مرحوم نے اس تقریب میں ایک جلسہ منعقد کیا تو مولانا مرحوم نے ایک نہایت لطیف نظم لکھی جس کا خاتمہ اس مشہور دعائیہ مصرع پر تھا: "بسلامت روی و باز آئی"۔ اس نظم کے دو شعر اقبال سہیل صاحب کو یاد رہ گئے :

خار در دیدۂ عدو شکنی   حاسداں را جگر گداز آئی
ما بہ نادیدہ در رہت باشیم   کہ تو ناگہ ز در فراز آئی

مسٹر مہدی حسن مرحوم نے بی، اے تک ولایت ہی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیرسٹری پاس کی۔ اس نواح میں چونکہ یہ نیا واقعہ تھا اور شیخ صاحب مرحوم نے بڑے اُمنگ اور حوصلہ مندی سے ان کی تعلیم دلائی تھی۔ اس لئے ۸ اکتوبر

سیرت شبلی مندرجہ الاصلاح نومبر ۱۹۳۶ء صفحہ ۵۴ - ۵۵

"سب سے بڑے علامہ مرحوم تھے۔ ان سے چھوٹے مسٹر مہدی حسن مرحوم تھے۔ ان کی غیر معمولی ذہانت وطباعی اور خردانہ اطاعت وپاس ادب کا اعتراف مولانا کو ہمیشہ رہا۔ اور مولانا کو بھی ان سے مخصوص محبت تھی چنانچہ جب وہ انگلینڈ کو روانہ ہوئے اور شیخ صاحب مرحوم نے اس تقریب میں ایک جلسہ منعقد کیا تو مولانا مرحوم نے ایک نہایت لطیف نظم لکھی جس کا خاتمہ اس مشہور دعائیہ مصرع پر تھا:

"بسلامت روی و باز آئی" اس نظم کے دو شعر اس وقت یاد آگئے :

خار در دیدۂ عدو شکنی   حاسداں را جگر گداز آئی
ما بہ نادیدہ در رہت باشیم   کہ تو ناگہ ز در فراز آئی

مسٹر مہدی حسن مرحوم نے بی، اے تک ولایت ہی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیرسٹری پاس کی۔ ہمارے نواح میں چونکہ یہ نیا واقعہ تھا۔ اور شیخ صاحب مرحوم نے بڑے اُمنگ اور حوصلہ مندی سے ان کی تعلیم دلائی تھی اس لئے ان کی

۱۸۸۸ء کو ان کی واپسی پر بڑی دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا گیا تھا۔ اور اس تقریب میں ایسا عظیم الشان جشن منایا گیا کہ سات روز تک مسلسل اہل شہر کی دعوت کیگئی جو اعظم گڈھ کی تاریخ میں پہلا اور غالباً آخری واقعہ تھا۔ افسوس کہ یہ ہنگامۂ سرور زمانہ کی نظر بد سے بچ نہ سکا اور جو توقعات مسٹر مہدی حسن کی غیر معمولی قابلیت سے وابستہ تھیں پوری نہ ہوسکیں ولایت ہی میں ان کی صحت خراب ہوچلی تھی جو مراجعت کے بعد بھی سنبھل نہ سکی۔ مجبوراً اپنی حیثیت سے اُتر کر ۱۸۹۲ء میں ان کو منصفی قبول کرنی پڑی اور چند سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۹۶ء میں اعزہ کو داغ مفارقت دے گئے۔ مرحوم کی یادگار ایک صاحبزادی تھیں جو مولانا کے ماموں زاد بھائی حاجی شیخ محمد صاحب سے بیاہی تھیں، وہ بھی ۱۹۲۷ء میں مکہ معظمہ میں لاولد فوت ہوئیں۔

مولانا کے منجھلے بھائی مولوی شیخ محمد اسحاق مرحوم الہ آباد ہائیکورٹ کے ایک کامیاب وکیل تھے اور قابلیت قانونی کے علاوہ اپنی پختہ مغزی اور وسعت خلق کی بنا پر نہایت ممدوح رہے۔ مگر انھوں نے بھی جوانی میں اگست ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ مرحوم نے ایک بیٹا عزیزی محمد فاروق سلمہ اور دو صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں۔ بڑی صاحبزادی آنریبل جسٹس اقبال احمد سے اور چھوٹی مولانا حمید الدین صاحب کے چھوٹے صاحبزادے محمد عباد سے بیاہی تھیں۔ چھوٹی نے چند سال ہوئے اور بڑی نے اسی سال ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

مولوی محمد اسحاق مرحوم کی جواں مرگی کا حادثہ مولانا مرحوم کے لئے ناقابل برداشت تھا جس کا شاہد حال انکے مرثیہ کا ایک ایک شعر ہے اور آخر یہ کانٹا ان کی جان لیکر نکلا

مولانا کے سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد جنید نعمانی مرحوم جو تقریباً مولانا کے صاحبزادے حاجی محمد حامد صاحب کے

واپسی پر بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا گیا۔ اور اس تقریب مسرت میں ایسا عظیم الشان جشن منایا گیا۔ جو اعظم گڈھ کی تاریخ میں پہلا اور غالباً آخری واقعہ تھا۔ افسوس کہ یہ ہنگامہ سرور زمانہ کی نظر بد سے بچ نہ سکا اور جو توقعات مسٹر مہدی حسن کی غیر معمولی قابلیت سے وابستہ تھیں پوری نہ ہوسکیں۔ ولایت ہی میں ان کی صحت خراب ہوچلی تھی جو مراجعت کے بعد بھی سنبھل نہ سکی۔ مجبوراً اپنی حیثیت سے اُتر کر ان کو منصفی قبول کرنا پڑی اور چند سال کی ملازمت کے بعد اعزہ کو داغ مفارقت دے گئے۔ مرحوم کی یادگار ایک صاحبزادی تھیں جو مولانا کے ماموں زاد بھائی حاجی شیخ محمد صاحب سے بیاہی تھیں وہ بھی مکہ معظمہ میں لاولد فوت ہوئیں۔

مولانا کے منجھلے بھائی مولوی شیخ محمد اسحاق مرحوم الہ آباد ہائیکورٹ کے ایک کامیاب وکیل تھے اور قابلیت قانونی کے علاوہ اپنی پختہ مغزی اور وسعت خلق کی بنا پر نہایت ممدوح رہے۔ مگر انھوں نے بھی جوانی میں وفات پائی۔ مرحوم نے ایک بیٹا عزیزی محمد فاروق سلمہ اور دو صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں۔ بڑی صاحبزادی آنریبل جسٹس اقبال احمد سے بیاہی تھیں۔ چھوٹی صاحبزادی نے حال ہی میں وفات پائی ہے۔

مولوی اسحاق مرحوم کی جواں مرگی کا حادثہ مولانا مرحوم کے لئے ناقابل برداشت تھا اور آخر کار یہ کانٹا جان لیکر نکلا۔

مولانا کے سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد جنید نعمانی مرحوم جو تقریباً مولانا کے صاحبزادے حاجی محمد حامد صاحب کے ہم عمر تھے کچھ دنوں اعظم گڈھ وکالت کرنے کے بعد منصفی پر چلے گئے اور تقریباً پچپن برس کی عمر میں جبکہ وہ بمقام کانپور سب جج تھے وفات پائی۔

ہم عمر تھے کچھ دنوں اعظم گڈھ وکالت کرنے کے بعد منصفی پر چلے گئے اور تقریباً پچپن برس کی عمر میں جبکہ وہ بمقام کان پور سب جج تھے۔ دہلی میں جہاں وہ بہ غرض علاج گئے تھے ۱۹۳۲ء میں وفات پائی۔

مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ مرحوم نے ایک اور شادی غیر کفو میں کی تھی۔ جن سے ایک صاحبزادے محمد مرحوم تھے۔ یہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح قابل اور ہونہار تھے اور گریجویٹ ہوچکے تھے مگر جس روز ڈپٹی کلکٹری میں ان کے انتخاب کی اطلاع آئی اسی دن چند گھنٹے پہلے دو دن کی علالت میں وفات پاچکے تھے۔ مہدی مرحوم کی وفات کے بعد شیخ صاحب کو اپنی اولاد کا یہ دوسرا داغ بھی دیکھنا مقدر تھا۔ ایسے سعادتمند اور کامیاب بیٹے کی مرگ ناگہاں وہ بھی عین عنفوان شباب میں انتہائی جانگاہ حادثہ تھا۔

مرحوم نے ایک بچہ "مظفر حسین" اپنی یادگار چھوڑا۔ اس حادثہ کے بعد سے قدرتی طور پر شیخ صاحب مرحوم کی تمام دلبستگی اور بزرگانہ محبت کا مرکز یہی بچہ تھا ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے اور ہر طرح کی ناز برداریاں کرتے۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے اپنے پدر بزرگوار کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں بھی اسکی جانب اشارہ ہے:-

میپسندا ینکہ بیکس و بے خانماں شود
ہاں ایں قد بہاں کہ مظفر جواں شود

مولانا کے والد مولوی شیخ حبیب اللہ مرحوم نے ایک اور شادی غیر کفو میں کی تھی۔ جن سے ایک صاحبزادے محمد مرحوم تھے یہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح قابل اور ہونہار تھے اور گریجویٹ ہو چکے تھے۔ مگر جس روز ڈپٹی کلکٹری میں انکے انتخاب کی اطلاع آئی اسی دن چند گھنٹے پہلے دو دن کی علالت میں وفات پاچکے تھے مہدی مرحوم کی وفات کے بعد شیخ صاحب کو اپنی اولاد کا یہ دوسرا داغ بھی دیکھنا مقدر تھا۔ ایسے سعادت مند اور کامیاب بیٹے کی مرگ ناگہاں وہ بھی عین عنفوان شباب میں انتہائی جانگاہ حادثہ تھا۔۔۔۔۔۔

مرحوم نے ایک بچہ "مظفر حسین" اپنی یادگار چھوڑا تھا۔ اس حادثہ کے بعد سے قدرتی طور پر شیخ صاحب مرحوم کی تمام دلبستگی اور بزرگانہ محبت کا مرکز یہی بچہ تھا۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے اور ہر طرح کی ناز برداریاں کرتے۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے اپنے پدر بزرگوار کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں بھی اسکی جانب اشارہ ہے:

میپسندا ینکہ بے کس و بے خانماں شود
ہاں ایں قد بہاں کہ مظفر جواں شود

"سیرت شبلی" مندرجہ الاصلاح

دیکھا آپ نے۔ لفظ بلفظ وہی عبارت جو در اصل مولانا اقبال احمد سہیل کے جولانی قلم کی مرہون منت ہے تمام و کمال نقل کردی گئی ہے۔ البتہ جا بجا اپنی مورخانہ تحقیقات کی رنگ آمیزی بھی ضرور ہے۔ مگر ہم کو حیرت تو اس بات پر ہے کہ کہاں ایک طرف تو سید صاحب کے ذوق تصرف کا یہ عالم ہے کہ اس سے ذرا پہلے صفحہ ۷۰ میں "سیرت شبلی" کی ایک مقتبس عبارت میں جس کا حوالہ سید صاحب نے خود بھی دیا ہے متعدد الفاظ اور بعض جگہ تو پورے پورے فقرے بدل دئے ہیں۔ اور کہاں یہ حال کہ:

ہر چہ آید در دلم غیر تو نیست

(۲)

حیات شبلی صفحہ ۷۶-۷۸-۷۹-۸۱-۸۲

"مولانا شبلی جیسا طباع تلمیذ اور مولانا فاروق کا سا متبحر اُستاد فیض تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا چند ہی دنوں میں یہ جوہر قابل ایسا چمکا کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں ور یہ ہونہار شاگرد۔ اُستاد کے لئے مایۂ ناز بن گیا۔ چنانچہ مولانا فاروق صاحب اسی زمانہ میں اکثر فخریہ فرمایا تھے "انا اسد وانت شبلی"

(۳) علامہ مرحوم نے درسیات کی تکمیل اگرچہ مولنا فاروق ہی سے کر لی تھی، لیکن ان کے ذوق علمی نے ان کو دوسرے خرمنوں کی خوشہ چینی پر آمادہ کیا ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ادب۔ فقہ اور حدیث کے جو اساتذہ اپنے اپنے فن میں یگانۂ عصر سمجھے جاتے تھے ان سے بھی استفادہ کرنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ مولانا کے والد مرحوم اس کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ علاوہ بریں وہ بلا ضرورت شدید اپنے نور دیدہ کو آنکھ سے اوجھل کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ مگر مولانا کی والدہ نے جو بہت باہمت خاتون تھیں مولانا کی بیتابی شوق کو ناکام دیکھنا گوارا نہ کیا۔ ان ہی کی ہمت افزائی کا اثر تھا کہ بالآخر مولانا نے طلب علم کے شوق میں دیار وطن کی دلچسپیوں کو خیرباد کہا۔

اس زمانہ میں مدارس کا رواج کم تھا زیادہ تر مشاہیر علماء اپنی اپنی جگہ پر مسند درس و افادہ کو زینت دے رہے تھے۔ یہی آستانے اس عہد کی یونیورسٹیاں تھیں لکھنؤ میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم کے دم سے بہار علم تازہ تھی۔ سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث اور دیوبند میں مولانا محمد قاسم کی بدولت خاتم المحدثین مولانا شاہ عبدالعزیز مرحوم کا سلسلۂ فیض جاری تھا۔ رامپور خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کی جوہر شناسیوں نے ہر فن کے ارباب کمال یکجا کر دئے

الاصلاح دسمبر ۱۹۳۶ء صفحہ ۵۱-۵۲-۵۴-۵۵

"مولانا شبلی جیسا طباع تلمیذ اور مولانا فاروق کا سا متبحر اُستاذ۔ فیض تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا چند ہی دنوں میں یہ جوہر قابل ایسا چمکا کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ اور یہ ہونہار شاگرد اُستاذ کے لئے مایۂ ناز بن گیا چنانچہ مولانا فاروق اسی زمانہ میں اکثر فخریہ فرمایا کرتے "انا اسد وانت شبلی"

علامہ مرحوم نے درسیات کی تکمیل اگرچہ مولانا فاروق ہی سے کر لی تھی اور باعتبار استعداد علمی اپنا حریف نہ رکھتے تھے مگر اس کو کیا کیجئے کہ علم کی پیاس بجھتی نہیں۔ یہ بادہ کہن تو جتنا پئے جائیے اتنی ہی پیاس بڑھتی ہے اور خود اس تشنگی میں وہ مزا آتا ہے کہ ہزار سیرابیاں اس پر نثار۔ ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ادب۔ فقہ اور حدیث کے جو اساتذہ اپنے اپنے فن میں یگانۂ عصر سمجھے جاتے تھے ان سے بھی استفادہ کرنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ مولانا کے والد مرحوم اسکو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ علاوہ بریں وہ بلا ضرورت شدید اپنے نور دیدہ کو آنکھ سے اوجھل کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ مگر مولانا کی والدہ جو بہت روشن خیال بزرگ تھیں مولانا کی بیتابی شوق کو ناکام دیکھنا کب پسند کرتیں۔ انھیں کی ہمت افزائی کا اثر تھا کہ بالآخر مولانا نے طلب علم کے شوق میں دیار وطن کی دلچسپیوں کو خیرباد کہا۔

اس زمانہ میں مدارس کا رواج کم تھا زیادہ تر مشاہیر علماء اپنی اپنی جگہ پر مسند درس و افادہ کو زینت دے رہے تھے یہی آستانے اس عہد کی یونیورسٹیاں تھیں لکھنؤ میں مولانا عبدالحی مرحوم کے دم سے بہار علم تازہ تھی سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث اور دیوبند میں مولانا محمد قاسم کی بدولت خاتم المحدثین مولانا شاہ عبدالعزیز مرحوم کا سلسلۂ فیض جاری تھا

راقم نے خود استاذ مرحوم کی زبانی سنا ہے کہ اول اول ان کو مولانا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم کی شہرت کمال لکھنؤ لے گئی۔ مگر علامہ مرحوم کچھ تو فطری جودت طبع اور کچھ فیض فاروقی کی بدولت نقد و اجتہاد کے خوگر تھے اور جہاں جاتے ان کی نظر پہلے اسی جوہر کی تلاش کرتی اس لئے زانوئے ادب تہ کرنے سے پہلے ہی لکھنؤ سے قدم اُٹھ گئے اور رامپور کا رُخ کیا۔ یہاں اس وقت دو باکمال اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ معقولات میں سلسلہ خیرآبادی کے خاتم مولانا عبدالحق خیرآبادی اور فقہ میں مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی۔ ابتداءً مولانا کی خواہش تھی کہ دونوں سے استفادہ کریں ان بزرگواروں میں معاصرانہ چشمک اس حد تک تھی کہ ایک کا شاگرد دوسرے کے حلقہ درس میں باریاب نہ ہو سکتا تھا مجبوراً مولانا کو انتخاب کرنا پڑا۔

معقولات میں مولانا فاروقی کے فیض سے خود علامہ مرحوم کی بصیرت اتنی کافی ہو چکی تھی کہ جس پر کسی مزید اضافہ کی توقع محض امید موہوم تھی اس لئے صرف مولانا ارشاد حسین کے شرف تلمذ پر اکتفا کی۔ علامہ مرحوم کو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کی وسعت نظر، اصابت رائے اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا اور اکثر بہ سبیل تذکرہ ان کے کمال فہم و ادراک اور قوت تفقہ کے واقعات بیان فرماتے۔"

(۴) " اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلب علم کی راہ میں دلدادگان کمال کو کیا کیا صعوبتیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ اسی سلسلہ میں طریق درس کی داستان بھی سننے کے قابل ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے بزرگوں میں علمی شغف کتنا تھا۔ موجودہ دور کے آرام طلب طالب علم اور عیش پسند اُستاذ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

مولانا فیض الحسن مرحوم کالج میں ملازم تھے۔ اس لئے

بھوپال میں رئیس العلما، نواب صدیق حسن خاں مرحوم اور رامپور میں خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کی جوہر شناسیوں نے ہر فن کے ارباب کمال یکجا کر دئے تھے۔ راقم نے خود اُستاذ مرحوم کی زبانی سُنا ہے کہ اول اول ان کو مولانا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم کی شہرت کمال لکھنؤ لے گئی، مگر علامہ مرحوم کچھ تو فطری جودت طبع اور کچھ فیض فاروقی کی بدولت نقد و اجتہاد کے خوگر تھے اور جہاں جاتے ان کی نظر پہلے اسی جوہر کی تلاش کرتی۔ اس لئے زانوئے ادب تہ کرنے سے پہلے ہی لکھنؤ سے قدم اُٹھ گئے اور رامپور کا رخ کیا۔ یہاں اسوقت دو باکمال اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ معقولات میں مولانا عبدالحی خیرآبادی اور فقہ میں مولانا ارشاد حسین۔ ابتداءً مولانا کی خواہش ہوئی کہ دونوں سے استفادہ کریں۔ مگر ان بزرگواروں میں معاصرانہ چشمک اس حد تک تھی کہ ایک کا شاگرد دوسرے کے حلقۂ درس میں باریاب نہ ہو سکتا تھا مجبوراً مولانا کو انتخاب کرنا پڑا۔

معقولات میں مولانا فاروقی کے فیض سے خود علامہ مرحوم کی بصیرت اتنی کافی ہو چکی تھی کہ جس پر کسی مزید اضافہ کی توقع محض امید موہوم تھی اس لئے "یک در گیر و محکم گیر" کے اُصول پر صرف مولانا ارشاد حسین کے شرف تلمذ پر اکتفا کی۔ علامہ مرحوم کو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کی وسعت نظر، اصابت رائے اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا۔ اور اکثر بہ سبیل تذکرہ انکے کمال فہم و ادراک اور قوت تفقہ کے واقعات بیان فرماتے۔"

" اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلب علم کی راہ میں دلدادگان کمال کو کیا کیا صعوبتیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ اسی سلسلہ میں طریق درس کی داستان بھی سننے کے قابل ہے جس سے معلوم ہوگا کہ ہمارے اسلاف کا علمی شغف موجودہ دور کے لئے کس حد تک قابل رشک تھا۔

مولانا فیض الحسن مرحوم کالج میں ملازم تھے۔ اس لئے زیادہ وقت وہیں صرف ہو جاتا۔ بقیہ وقت بھی خالی نہ تھا

زیادہ وقت وہیں صرف ہو جاتا۔ بقیہ وقت بھی خالی نہ تھا کیونکہ متعدد ایسے اشخاص اس وقت استفادہ کر رہے تھے جن کا کالج سے کوئی تعلق نہ تھا اور ہر ایک کے اوقات مقرر تھے۔ اس ماحول میں اگر کوئی اور اُستاد ہوتا تو مولانا شبلی جیسے فارغ التحصیل طالب علم کو درس دینے سے یقیناً انکار کرتا اور مولانا کے بجائے کوئی دوسرا طالب علم اسی استعداد کا ہوتا جس کو انھیں دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تو ہرگز غریب الوطنی کی زحمت برداشت کرنے کے لئے طیار نہ ہوتا۔ مگر ایک طرف تو مولانا شبلی کا عزم راسخ بے نیل و مرام واپس آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ دوسری جانب مولانا فیض الحسن کا ذوق افاضہ ایسے مشتاق و مستعد طالب علم کو محروم دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا آخر کار یہ طے ہوا کہ مکان سے کالج تک کی مسافت طے کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس میں مولانا ادبیات کا درس لیا کریں۔ یعنی آتے جاتے میں معلم یا متعلم کا جو قدم بھی اُٹھے وہ افادہ و استفادہ علم سے خالی نہ ہو۔

ہیچ گہ ذوق طلب از جستجو بازم نداشت
دانہ می چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

حیات شبلی صفحہ ۹۲، ۹۳

کیونکہ متعدد ایسے اشخاص اسوقت استفادہ کر رہے تھے جن کا کالج سے کوئی تعلق نہ تھا اور ہر ایک کے اوقات مقرر تھے اس ماحول میں اگر کوئی دوسرا استاد ہوتا تو مولانا شبلی جیسے فارغ التحصیل طالب علم کو درس دینے سے یقیناً انکار کرتا اور مولانا کے بجائے کوئی دوسرا طالب علم اسی استعداد کا ہوتا جس کو انھیں دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تو ہرگز غریب الوطنی کی زحمت برداشت کرنے کے لئے طیار نہ ہوتا۔ مگر ایک طرف تو مولانا شبلی کا عزم راسخ بے نیل و مرام واپس آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ دوسری جانب مولانا فیض الحسن کا ذوق افاضہ ایسے مشتاق و مستعد طالب العلم کو محروم دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا آخر کار یہ طے ہوا کہ مکان سے کالج تک کی مسافت طے کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس میں مولانا ادبیات کا درس لیا کریں اور آیا جایا کریں۔ معلم یا متعلم کا جو قدم بھی اُٹھے وہ افادہ و استفادہ علم سے خالی نہ ہو۔

ہیچ گہ ذوق طلب از جستجو بازم نداشت
دانہ می چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

(۵) الاصلاح جنوری ۳۳ء ۔ ۴۳ء ۔ ۴۴ء

"اس سفر حج کے بعض عجیب اثر انگیز واقعات سنایا کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ایک صاحب حال ہندی حاجی کے والہانہ شوق کا یہ عالم تھا کہ برہنہ پا کوئے یار کی منزلیں طے ہو رہی تھیں تلوے کانٹوں سے چھلنی ہو رہے تھے وہ چلتے چلتے تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے تھے اور مونچنے سے کانٹے نکال رہے تھے مولانا بھی جا کر سامنے کھڑے ہو گئے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور نہایت پرسوز لہجے میں یہ شعر پڑھا:

آبلے روتے ہیں خوں رنج بڑا ہوتا ہے
کوئی کانٹا جو کفِ پا سے جدا ہوتا ہے

"اس سفر حج کے بعض عجیب اثر انگیز واقعات سنایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ایک صاحب حال ہندی حاجی کے والہانہ شوق کا یہ عالم تھا کہ برہنہ پا کوئے یار کی منزلیں طے ہو رہی تھیں تلوے کانٹوں سے چھلنی ہو رہے تھے۔ تھک کر ایک جگہ بیٹھ گیا تھا اور موچنے سے کانٹے نکال رہا تھا۔ مولانا بھی جا کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور نہایت پرسوز لہجہ میں یہ شعر پڑھا:

آبلے روتے ہیں خوں رنج بڑا ہوتا ہے
کوئی کانٹا جو کفِ پا سے جدا ہوتا ہے

اس سفر میں اہلِ عرب کی فیاضی۔ سادگی۔ غیرتمندی اور شریفانہ اخلاق کا بھی ان پر گہرا اثر پڑا تھا چنانچہ مثال کے طور پر یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی اپنے شتربان کو کھانے کی کوئی چیز دیتا تو وہ ہرگز تنہا نہ کھاتا اور چلاّ کر کہ آس پاس کے اور بدوؤں کو جمع کرلیتا اور سب کو تقسیم کرلینے کے بعد خود کھاتا۔ امتحاناً ایک مرتبہ اس کو صرف ایک بوٹی دی گئی جو کسی طرح قابلِ تقسیم نہ تھی مگر شتربان نے اب بھی دوسرے ساتھیوں کو بلاکر ایک ایک ریشہ تقسیم کیا تو مولانا نے اس سے پوچھا کہ آخر اس سے کیا نتیجہ ہوا تمھیں کو مزا ملا نہ تمھارے کسی ساتھی کو شتربان نے اس کا جو جواب دیا اس سے عرب کی شرافت قومی کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے کہا:

"یا شبلی ہذا عار علینا ان ناکل وحدانا" مردانہ عزت و خودداری اور شریفانہ عفو و درگزر کی مثال میں یہ واقعہ بیان فرماتے کہ ایک بار کسی منزل میں مولانا کے ساتھیوں نے ہانڈی چڑھا رکھی تھی۔ ایک بڈھا بدو بار بار ادھر سے گزرتا اور اس سے گرد اڑتی تھی جو ہانڈی میں پڑتی تھی، مولانا کے ایک رفیق سفر نے بار بار منع کیا مگر وہ نہ مانا — عاجز آکر انھوں نے اس بدو کو ایک تھپڑ کھینچ مارا۔ بدو کے لئے یہ توہین ناقابل برداشت تھی۔ غصہ میں جو اسنے ایک آواز دی تو آس پاس کے تمام بدو جمع ہوگئے ۔۔ یہ بڈھا بدو جوشِ انتقام میں بیتاب تھا۔ زمین سے تھوڑی سی خاک لیکر کفِ دست پر رکھتا اور پھونک مار کر اڑاتا۔ کہ اس طرح تم کو برباد کردوں گا، مولانا نے اس سے بہت لجاجت سے معافی مانگی تو معاف کیا۔ بہت ممکن ہے علامہ مرحوم کے مندرجہ ذیل شعر کی مصوری اسی واقعہ سے ماخوذ ہو:

یارمی پرسید شبلی راکہ چوں برباد رفت
مشت خاکے در ہوا پیشش پریشاں کردہ ام

اس سفر میں اہلِ عرب کی فیاضی۔ سادگی۔ غیرتمندی اور شریفانہ اخلاق کا بھی ان پر گہرا اثر پڑا تھا چنانچہ مثال کے طور پر یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی اپنے شتربان کو کھانے کی کوئی چیز دیتے تو وہ ہرگز تنہا نہ کھاتا اور چلاّ کر کہ آس پاس کے اور بدوؤں کو جمع کرلیتا اور سب کو تقسیم کرلینے کے بعد خود کھاتا۔ امتحاناً ایک مرتبہ اس کو صرف ایک بوٹی دی گئی جو کسی طرح قابلِ تقسیم نہ تھی۔ مگر شتربان نے اب بھی دوسرے ساتھیوں کو بلاکر ایک ایک ریشہ تقسیم کیا تو مولانا نے اس سے پوچھا کہ آخر اس سے کیا نتیجہ ہوا نہ تو تمھارے کسی ساتھی کو کوئی مزا ملا نہ تمھیں نے کوئی فایدہ اٹھایا۔ اس سوال کا جواب جو اس شتربان نے دیا اس سے عرب کی شرافت قومی کا پتہ چلتا ہے کہتا ہے: "یا شبلی ہذا عارٌ علینا ان ناکل شیئًا وحدانا" مردانہ غیرت و خودداری اور شریفانہ عفو و درگزر کی مثال میں یہ واقعہ بیان فرماتے کہ ایک بار کسی منزل میں مولانا کے ساتھیوں نے ہانڈی چڑھا رکھی تھی ایک بڈھا بدو بار بار ادھر سے گزرتا اور گرد اڑاتا چلتا جو ہانڈی میں پڑتی تھی - مولانا کے ایک رفیق سفر نے بار بار منع کیا مگر اس نے نہ مانا۔ عاجز آکر انھوں نے اس بدو کو ایک پتھر کھینچ مارا۔ بدو کے لئے یہ توہین ناقابل برداشت تھی۔ غصہ میں جو اس نے ایک آواز دی تو آس پاس کے تمام بدو جمع ہوگئے۔ یہ بڈھا بدو جوش انتقام میں بیتاب ہوا جاتا تھا اور غول بکتا تھا۔ زمین سے تھوڑی سی خاک لیکر کف دست پر رکھتا اور پھونک مار کر اڑاتا۔ اس حرکت سے یہ بتانا مقصود تھا کہ اگر وہ چاہے تو اس قافلہ کو اسی آسانی سے برباد کرسکتا ہے ..... مگر اس وحشی بدو سے جب بہ لجاجت معافی مانگی گئی تو باینہمہ غیظ و غضب اس نے نہایت سیرچشمی سے معاف کردیا۔ بہت ممکن ہے علامہ مرحوم کے مندرجہ ذیل شعر کی مصوری اسی واقعہ سے ماخوذ ہو:

یارمی پرسید شبلی راکہ چوں برباد رفت
مشت خاکے در ہوا پیشش پریشاں کردہ ایم

حیات شبلی صفحہ ۱۰۵

"قسطنطنیہ کے سفر میں جو چیز انھوں نے سب سے زیادہ محسوس کی وہ محکوم اور حاکم ملکوں کا تفاوت اور غلام اور آزاد قوموں کی ذہنیتوں کا فرق ہے۔ وہ خود ایک غلام ملک کے باشندے تھے اور اپنے ہم وطن مسلمانوں کی پست حوصلگی، بزدلی، خود غرضی اور تملق پیشگی کے مناظر دیکھ چکے تھے۔ ایک آزاد سرزمین پر قدم رکھتے ہی دنیا بالکل بدلی ہوئی نظر آئی اور اپنی زبوں حالی کا احساس اور قوی ہو گیا۔ تاہم جس اسلامی جاہ و جلال اور عظمت و جبروت کی داستانیں کتابوں میں پڑھیں تھیں اس کے بچے کھچے آثار کو بچشم خود دیکھ کر روح مضطرب کو جو سرمایہ نشاط حاصل ہوتا اور دل بیتاب سے جوش سرور کی جو موجیں اٹھتیں اس کا اظہار لفظوں کی قدرت سے باہر ہے۔ ہر جمعہ کو رسم سلاملق کا دلفروز سماں اور عید کے موقع پر موکب سلطانی کا پرشکوہ منظر اس درجہ روح پرور تھا کہ مولانا پر تھوڑی دیر کے لئے ایک بیخودی سی چھا جاتی۔ مولانا نے ایک مختصر سی مثنوی میں موکب سلطانی کے دلکش نظارے کی مصوری کی ہے۔ جس کا ہر لفظ خوشی و مسرت کا ایک چھلکتا ساغر ہے۔ اپنے کیف و وارفتگی کو ان دو شعروں میں ادا کیا ہے"

الاصلاح جون ۳۶ء صفحہ ...

"قسطنطنیہ کے قیام میں جو چیز انھوں نے سب سے زیادہ محسوس کی وہ محکوم اور حاکم ملکوں کا تفاوت اور غلام و آزاد اقوام کی ذہنیت کا فرق تھا۔ وہ خود ایک غلام ملک کے باشندے تھے اور اپنے ہم وطن مسلمانوں کی پست حوصلگی، بزدلی، خود غرضی اور تملق پیشگی کے مناظر دیکھ چکے تھے۔ ایک آزاد سرزمین پر قدم رکھتے ہی دنیا بالکل بدلی ہوئی نظر آئی اور اپنی زبوں حالی کا احساس اور قوی ہو گیا۔ تاہم جس اسلامی جاہ و جلال اور عظمت و جبروت کی داستانیں کتابوں میں پڑھی تھیں اس کے بچے کھچے آثار کو بچشم خود دیکھ کر روح مضطرب کو جو سرمایہ نشاط حاصل ہوتا اور دل بیتاب سے جوش سرور کی جو موجیں اٹھتیں اس کا اظہار لفظوں کی قدرت سے باہر ہے۔ ہر جمعہ کو رسم سلاملق کا دلفروز سماں اور عید کے موقع پر موکب سلطانی کا پرشکوہ منظر اس درجہ حیات آفریں تھا کہ مولانا پر تھوڑی دیر کے لئے ایک بیخودی سی چھا جاتی۔ مولانا نے ایک مختصر سی مثنوی میں موکب سلطانی کے دلکش نظارے کی مصوری کی ہے جس کا ہر لفظ صہبائے سرور کا ایک چھلکتا ہوا ساغر ہے اپنے کیف و وارفتگی کو ان دو شعروں میں ادا کیا ہے"

صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا اور تاب ضبط باقی نہ رہی کہ سید صاحب کے تصرفات بیجا کو دیکھیں اور چپ ہو رہیں۔ بالخصوص اس آخری فقرہ کی ایجاد بندہ کہ وہ نہ صرف حیرت خیز ہے بلکہ اشتعال انگیز بھی ہے۔ اگر شکوہ بیان اور عبارت کی روانی کو نظر انداز بھی کر دیجئے تو معنوی اعتبار سے "صہبائے سرور"، کی جگہ "خوشی و مسرت" اس درجہ بداہتہً غلط ہے کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس کو گرفت کر سکتا ہے۔

یہ تو سید صاحب کے لغزش پا کے ان بیشمار نشانات میں سے صرف چند تھے، جہاں موصوف سے مولانا سہیل کے نقش قدم پر چل کر جادہ غیر کی پیروی کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ان کا استقصا کیا جائے تو "حیات شبلی" جیسی ضخیم نہ سہی، پھر بھی ایک اچھی خاصی دوسری کتاب طیار ہو سکتی ہے۔

مثال کے طور پر چند حوالے ہم یہاں نقل کرتے ہیں :

حیات شبلی صفحہ ۵۰
" " ۶۰ - ۶۱
" " ۲۹۱ - ۲۹۲
" " ۲۱۰ - ۲۱۱
" " ۱۱۱ - ۱۲۶
" " ۲۱۱ - ۲۱۹
" " ۲۳۸
" " ۳۱۹
" " ۱۹۱ - ۱۹۲
" " ۳۵۵ - ۳۵۶

سیرت شبلی (الاصلاح سنہ ۱۹۳۶ء) صفحہ ۴۵
" " ۵۱ - ۵۳
" الاصلاح سنہ ۳۸ء - ۵۵۳
" " سنہ ۳۸ء - ۲۵۰
" " " ۴۵ - ۵۶
" " سنہ ۳۸ء - ۵۳۲ - ۵۵۳
" " " ۳۶۱
" " " ۶۹۱
" " " ۳۵۳ - ۳۵۴
" " سنہ ۳۹ء - ۳۳ - ۳۴

عبدالوحید خاں اعظمی

روسی اثرات رومانیا میں

اس وقت یورپ کے بہت سے حصے ایسے ہیں جو اپنی اصلی حکومتوں کے ہاتھ سے نکل کر برطانیہ، امریکہ اور روسی فوجوں کے قبضہ میں آگئے ہیں ——— اور ہر چند یہ قبضہ بالکل عارضی ہے، ورنہیں کہا جا سکتا کہ ان ملکوں کی قسمت کا آیندہ فیصلہ کیا ہوگا، لیکن ان ملکوں میں جہاں برطانوی وامریکن تسلط قائم ہے، سیاسی بے چینی زیادہ پائی جاتی ہے اور جہاں روس کا قبضہ ہے وہاں یہ بے چینی بہت کم یا بالکل نہیں پائی جاتی۔

"لندن ریویو" میں ایک بیان اس موضوع پر شائع ہوا ہے، جو غالباً دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ اس میں لکھا ہے کہ

"رومانیا کی راجدھانی بخارسٹ، جو ممالک یوروپ کی راجدھانیوں میں سب سے زیادہ نشاط انگیز شہر سمجھا جاتا تھا، روزانہ رات کو ۹ بجے ایک زبردست انقلاب سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن یہ انقلاب سیاسی نہیں، بلکہ معاشرتی ہوتا ہے۔ یعنی کرفیو آرڈر کے تعمیل میں ۹ بجے رات سے صبح ۹ بجے تک کے لئے سارا شہر سنسان ہو جاتا ہے، تمام چہل پہل بارہ گھنٹوں کے لئے یک لخت موقوف ہو جاتی ہے اور زندہ انسانوں کے اس قبرستان میں سوائے روسی محافظ سپاہیوں کے قدموں کے اور کوئی آواز سننے میں نہیں آتی۔ لیکن کرفیو کا وقت ختم ہونے کے بعد وہاں پھر لطف ومسرت کی زندگی عود کر آتی ہے اور زندگی کے تمام وہی کاروبار شروع ہو جاتے ہیں جو کسی وقت حالت امن میں پائے جاتے تھے۔

باوجود اس کے کہ یہاں مسلسل آمرانہ حکومتوں کا اقتدار رہا ہے اور چار سال کی جنگ میں پانچ لاکھ رومانی نوجوانوں کی قربانی ہو چکی ہے۔ بخارسٹ کی رنگ رلیوں کا وہی حال ہے اور ہوٹلوں کی نفیس اور لذیذ غذاؤں سے لیکر قحبہ گاہوں کی نازنینان عشوہ طراز تک یہاں کسی چیز کا فقدان نہیں۔ قہوہ خانوں، سڑکوں، گلیوں، کلبوں اور تفریح گاہوں میں اب بھی خوش وضع وخوش پوشاک مردوں اور عورتوں کے ہجوم کا وہی عالم ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شاید نازیوں اور روسی فوجوں کا قبضہ کبھی ہوا ہی نہ تھا

مچھلی، سرخ رنگ اچار، اور فرانس کی شہری شامپین کی یہاں اب بھی کمی نہیں اور دوکانوں میں ہر قسم کا سامان بھرا پڑا ہوا ہے۔ اگر کہیں کہیں بموں کے گرنے کے گڑھے نظر آئیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ بخارسٹ ۱۹۴۲ء کا ہے۔

چونکہ نقل وحمل کے ذرایع زیادہ تر فوجی ضرورتوں کے لئے مخصوص ہیں اس لئے اب وہاں کی سڑکوں پر موٹریں اور بس گاڑیاں تو کم نظر آتی ہیں، لیکن ان کی جگہ سائکلوں نے لے لی ہے اور تمام گزرگاہیں انھیں سے بھری نظر آتی ہیں۔

تمام رسٹراں، سویلین آبادی سے بھرے رہتے ہیں جن میں کہیں کہیں برطانوی اور امریکی وردیاں بھی نظر آجاتی ہیں لیکن روسی عنصر یہاں آپ بالکل نہ پائیں گے۔

اس وقت بخارسٹ کو دیکھنے کے بعد سب سے پہلا احساس ذہنی آزادی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ کامل چار سال کی زباں بندی کے بعد جواب لب کشائی کی اجازت ملی ہے تو قہوہ خانوں، ہوٹلوں، سڑکوں اور چوراہوں پر ہر جگہ پوری آزادی کے ساتھ ہر سیاسی موضوع پر لوگ گفتگو کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں اور کوئی بازپرس اُن سے نہیں ہوتی۔ علاوہ پرانے اخباروں کے بعض نئے اخبار بھی وہاں جاری ہو گئے ہیں جو سوشلسٹ، کمیونسٹ، لبرل، ڈیماکریٹک، اور انڈپنڈنٹ مختلف جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں میں ایک اخبار "نئی دنیا" روسی فوج کا بھی شامل ہے۔

یہاں کی موجودہ سیاسی زندگی مدوجزر کی حالت میں ہے اور چاہیئے یہ تھا کہ بالشویک حکومت یہاں اپنے تسلط کے بعد اپنے ہی نقطۂ نظر پر زیادہ زور دیتی، لیکن صورت حال یہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے خلاف یہاں کی روسی کمان نے ہر قسم کے سیاسی اظہار خیال کی پوری آزادی دیدی ہے اور جب تک انھیں اپنے عسکری تحفظ کی طرف سے اندیشہ پیدا نہ ہو وہ مطلق دخل نہیں دیتے۔

اس میں شک نہیں کہ رومانیا پر جو شرائط صلح روس نے عاید کئے ہیں وہ کافی سخت ہیں اور اہل رومانیا اس حقیقت کو جانتے ہوئے کہ اس لڑائی میں رومانیا نے روس کو کافی نقصان پہونچایا ہے، شرائط صلح کی سختی کو حق بجانب سمجھتے ہیں، لیکن عملاً روس نے یہاں مطلق کوئی سختی نہیں کی، یہاں تک کہ بخارسٹ اور تمام بڑے بڑے شہروں میں روسی سپاہیوں کو جانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں، ایک یہ کہ روسی یہاں کی آبادی میں یہ خیال پیدا کرنا نہیں چاہتے کہ وہ رومانیا پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ بالشیوک حکومت کسی طرح پسند نہیں کر سکتی کہ روسی سپاہ یہاں کی عیاشانہ زندگی سے متاثر ہو۔

اس وقت وہاں تین مسئلے بہت اہم ہیں۔ ایک تعمیر جدید، دوسرے سامان غذا کی پیداوار اور تیسرے فاسستی عنصر کا اخراج۔ ہر چند بخارسٹ میں فی الحال غذا کی کمی نہیں، لیکن ماہرین فکرمند ضرور ہیں کیونکہ بیج اور مزدوروں کی کمی سے فوجوں کی نقل و حرکت اور چوڑی پٹری کی ریل جاری ہو جانے کی وجہ سے دیہات کاشت میں کافی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ علاوہ اس کے ٹریکٹروں کے چلانے کے لئے ایندھن اور گاڑیوں کی کمی نے اس مسئلہ کو دقت طلب بنا دیا ہے۔ فاسستی عناصر کی علحدگی کی جو شرط عاید کی گئی تھی اس پر اول اول تو زیادہ توجہ نہیں کی گئی، لیکن اب جدید روسی افسران کی آمد کے بعد اس پر زیادہ کامیابی سے عملدرآمد ہو رہا ہے۔

شاہ میکائیل کی ہر دلعزیزی بڑھتی جا رہی ہے، کیونکہ اس نے پیشرو بادشاہوں کی طرح اشتراکیت کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

بہرحال روسی اثرات رومانیا میں بہت قوی ہوتے جا رہے ہیں اور اہل رومانیا کا میلان اشتراکیت کی طرف برابر بڑھتا جا رہا ہے"۔

یہ ہے بیان "لندن ریویو" کے ایک نامہ نگار کا جس نے خود رومانیا میں وہاں کے حالات کا مطالعہ کیا ہے اور جس سے اس حقیقت پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ بلقان میں روسی اثرات کے وسیع ہونے کا کیا سبب ہے اور اشتراکیت کا رجحان مغرب میں کیوں قوی ہوتا جا رہا ہے۔

جنگ کے نئے ہتھیار

ہر لڑائی ایک نیا ہتھیار یا ایک نیا آلۂ ہلاکت اپنے ساتھ لاتی ہے - جنوبی افریقہ کی لڑائی اپنے ساتھ رائفل لائی، منچوریا کی جنگ مشین گن لائی، سنہ ۱۹۱۶ء کی جنگ کا تحفہ ٹینک تھا، اور جب موجودہ لڑائی شروع ہوئی تو ہٹلر نے پہلے ہی سے اعلان کر دیا کہ وہ اپنے نئے خفیہ ہتھیاروں سے سارے یورپ کو تباہ کر کے رکھ دیگا - لوگوں نے پہلے تو اس کو گپ سمجھا لیکن جب اس نے انگلستان پر بموں کی بارش شروع کی، تو ان کی آنکھیں کھلیں۔ ہوائی جہازوں سے بم پھینکنا تو خیر کوئی ایسی بات نہ تھی، لیکن پرے کے پرے جہازوں کے آنا اور مینہ کی طرح مختلف قسم کے بموں کی بارش کرنا، واقعی بالکل نیا خطرہ اور نیا انداز جنگ تھا - اس طریق جنگ نے سنہ ۴۰ء میں تمام دنیا کو حیران کر دیا اور انگلستان کو بھی سب سے پہلے اسی نے چونکایا۔

اس کے بعد جرمنی کا دوسرا خفیہ طریق جنگ چھتری باز فوج کا استعمال تھا - انگلستان اور اس کے ساتھی ابتک یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ کسی ملک پر حملہ کرنے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں، خشکی کی راہ سے یا سمندر کے راستے اور اسی لئے سرحدوں اور ساحلوں کی حفاظت انھوں نے کافی سمجھی تھی، لیکن جب جرمن سپاہیوں نے فضا سے اترنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ ایک راستہ عالم بالا کا بھی ہے، جسے وہ بھولے ہوئے تھے۔

تیسری چیز "مقناطیسی سرنگیں" تھیں جو سب سے پہلے جرمنی ہی نے اس جنگ میں استعمال کیں - سمندروں میں سرنگیں بچھانے کا رواج پہلے بھی تھا، لیکن مقناطیسی یا برقی سرنگیں بالکل نئی چیز تھیں جو بہت مہلک ثابت ہوئیں۔ چوتھی چیز وہ ہے جسے پانچواں کالم کہتے ہیں، اس سے مراد جاسوسوں یا غداروں کی وہ جماعت ہے، جو اتحادیوں کے ملکوں میں رہکر خبر رسانی وغیرہ کی خدمت انجام دیتی ہے - لیکن شاید سب سے زیادہ عجیب چیز وہ ہے جسے "۱-V" کہتے ہیں اور جو جنگ کے آخری سال (سنہ ۴۴ء) میں استعمال کیا گیا - انگلستان میں اس کے ٹوٹے اور بکھرے ہوئے اجزاء کو اکٹھا کر کے دیکھا گیا تو اس کے انجن کو دیکھ کر حیرت ہوگئی، کیونکہ سادگی اور کم خرچ ہونے کے لحاظ سے وہ نہایت عجیب چیز ہے۔

اس کا ایک بڑا فایدہ تو یہ ہے کہ اس کے چلانے کے لئے کسی آدمی کی ضرورت نہیں ہوتی اور ہوا بازوں کی تعلیم کے لئے جو طویل زمانہ اور کثیر روپیہ درکار ہوتا ہے وہ بچ رہتا ہے دوسرے یہ کہ اس کے استعمال کے لئے نہ موسم دیکھنے کی ضرورت ہے نہ وقت کی - لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ ایجاد ابھی پوری طرح تکمیل کو نہیں پہونچی، کیونکہ اس کی پرواز یا جست فی الحال ۲۵۰ میل سے زیادہ نہیں ہے - تاہم بنیادی طور پر اس نے یہ بات ضرور

ثابت کر دی ہے کہ فضائی پرواز کے فن میں آیندہ بڑا انقلاب ہونے والا ہے اور آیندہ جنگ میں فضائی لڑائی انھیں "خود پرواز" بموں سے ہوگی۔

اسی کے ساتھ جرمنی نے ایک اور آلۂ حرب سے کام لیا جسے "۲ - ۷" کہتے ہیں۔ یہ در اصل ایک اُڑنے والا بم ہے جس کا وزن تقریباً دس ٹن ہوتا ہے۔ اس کے متعلق فی الحال اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہو سکا کہ اسکی رفتار آواز سے زیادہ سریع ہے اور ہوائی کی طرح نہایت بلندی سے دفعتاً زمین پر آکر گرتا ہے۔ جب وہ نیچے آکر گرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیلی گراف کے ستون نیچے آرہے ہیں۔ ان سے کوئی آواز بھی نہیں پیدا ہوتی جو بڑے خطرہ کی بات ہے۔

فکاہات

ایک غلطی کا انجام

دنیا میں اتفاقات کے تماشے کبھی گاہ گاہ بہت عجیب دیکھنے میں آتے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی کاروباری شخص نے پتلون غلط رنگ کا پہن لیا یعنی کوٹ کے رنگ کے لحاظ سے وہ ناموزوں تھا۔ اس کا علم انھیں دفتر پہونچکر ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ اِدھر اُدھر چل پھر نہ سکتے تھے، اپنے پتلون کو چھپائے ہوئے دفتر کی کرسی ہی پر بیٹھے رہے اور وہیں سب کو بلا بلا کر پوچھتے گچھتے رہے جب دن ختم ہوا تو انھیں پتہ چلا کہ اس طرح صرف ایک دن میں اتنا کام ہوا جتنا پورے ایک ہفتہ میں ہوتا تھا۔

اس کے بعد انھوں نے یہی وتیرہ اختیار کر لیا اور چند دن میں وہ بہت بڑے آدمی ہوگئے۔

تعمیلِ حکم

پچھلے سال گرمیوں میں نیویارک کے ایک کارخانے والے نے عمال کی قوتِ عمل میں تیزی پیدا کرنے کے لئے جا بجا بورڈ پر یہ ہدایت لکھ کر آویزاں کرا دی کہ:

"جو کچھ کرنا ہے ابھی کرو"

اس کے چند دن بعد اس کے کسی دوست نے پوچھا کہ تمھاری اس نصیحت کا اثر کام کرنے والوں پر کیا ہوا، تو اس نے بگڑ کر کہا کہ "اب اس کا ذکر نہ کرو"۔ دوست نے پوچھا "کیوں" تو اسنے جواب دیا کہ "اس نصیحت کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزانچی چار ہزار ڈالر چرا کر بھاگ گیا، محاسب میری ایک بہترین خاتون سکریٹری کو لیکر فرار ہوگیا، تین ٹائپ کرنے والوں نے اضافہ تنخواہ کی درخواست دی، مزدوروں نے ہڑتال کی نوٹس دیدی اور دفتر کا چپراسی بحری فوج میں بھرتی ہوگیا۔

یہ کیا ہو رہا ہے ؟

زیرِ نظر مضمون میں ان رجحانات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہمارے نوجوان طبقہ میں پیدا ہو رہے ہیں۔ موجودہ ماحول تیزی کے ساتھ مفردات سے مرکبات طیار کرنے کے عمل میں مصروف ہے۔ اُلجھے ہوئے حالات عجیب و غریب خصوصیات پیدا کر رہے ہیں۔ دنیا بدل رہی ہے۔ لیکن غالباً یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ ہر تبدیلی لازمی طور پر کسی بہبودی کی تمہید ہے۔

یونانیوں میں ایک دور آیا تھا جب نفسیات کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اور ہر شخص کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے لیا جاتا تھا۔ ایسا ہی لیکن اس سے بہت مختلف دور ہندوستان میں بھی پیدا ہو رہا ہے۔ سب سے پہلی چیز جس کی طرف بیسویں صدی کے نوجوان کا ذہن رجوع کرتا ہے علم النفس ہے۔ اپنی خوشی، دوسرے کا غم، یونیورسٹی سے بے تعلقی، آئینہ میں انہماک غرضکہ کوئی چیز ہو اُس پر نفسیاتی حیثیت سے غور کیا جاتا ہے۔ کوئی معمولی طالب علم طلبا ہے اس کے پہلے ہی جملہ میں طبعی اور نفسی اصطلاحات سننے میں آئیں گی مثلاً "یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ ہم دنیا کی آئے دن کی کلفتوں سے عاجز آکر سینما میں غم غلط کرنے جاتے ہیں" "یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ ہم موجودہ نظامِ تعلیم سے گھبراتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے طبائع کے خلاف ہے"۔ یہ ایسے جملے ہیں جو سب بولتے ہیں درانحالیکہ مشکل سے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی پانچ فیصدی لوگ ایسے نکلیں گے جنھوں نے کوئی معتدبہ کوشش اس علم کے حاصل کرنے کی کی ہو۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا جہل جس میں اس علم سے استدلال کیا جائے جس کے ابتدائی اصولوں سے بھی واقفیت نہیں ہوتی، ہمیں کیونکر کسی صحیح نتیجہ پر پہونچا سکتا ہے۔ پھر اس بات کو بغیر شرط مرتبہ پر مان لینے کے بعد بھی کہ جن جن چیزوں کو وہ نفسیاتی ردعمل کی زد میں لاتے ہیں وہ دراصل نفسیاتی ردعمل کا ہی نتیجہ ہیں بحث ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ایک نئی تنقیح یہ پیدا ہوتی ہے کہ آیا ان تمام جذبات کا جو اس طرح پیدا ہوں قبول کر لینا لازم ہے۔ چند اصحاب جو انتہا کو پہونچ چکے ہیں، بیشک بول اُٹھیں گے "یقیناً"، لیکن نہ صرف یہی بلکہ ہر سنجیدہ مزاج شخص اس کا جواب دینے سے قبل سوچے گا اور تھوڑے سے غور کے بعد اسے معلوم ہوگا کہ ہمارے لئے ہر ذہنی کیفیت سے مغلوب ہو جانا ضروری نہیں ہے۔ اگر آدمی میں مناسب اور غیر مناسب کا احساس پیدا نہ ہوتا تو شاید اسے اپنے جذبات سے جنگ کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن یہ بھی -

یقینی ہے کہ اس حالت میں اسے کوئی حق اس غرور تفوق کو اپنے دل میں جگہ دینے کا نہ ہوتا جو تمام موجودات عالم پر اسے حاصل ہے۔

نیچرل سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک بات جو ہم نے پھیلا دی ہے وہ معیاری اور اثباتی علوم کی تفریق ہے۔ طبیعیات اور اس کے ساتھ ساتھ نفسیات ایسی چیزیں ہیں جو صرف اشیاء کی حقیقت کی تلاش اور اس کے بیان سے کام رکھتی ہیں۔ لیکن ان کے برخلاف منطق اور علم الاخلاق ایسے شعبے ہیں جو چیزوں پر مقررہ معیار کے ماتحت پابندیاں عاید کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کسی شے کا ایک خاص طرح پر ہونا اس کا ضامن نہیں کہ اسے یونہی ہونا بھی چاہئے۔ یہ "ہے" اور "چاہئے" کی بحث یوں تو بہت طویل ہے لیکن اگر آپ ذرا بھی سوچیں تو آپ کو فوراً پتہ چل جائیگا کہ دنیا میں سیکڑوں باتیں ایسی ہیں کہ ایک خاص طرح واقع ہوتی ضرور ہیں لیکن انہیں ہونا نہ چاہئے تھا یا اب باقی نہ رہنا چاہئے۔ کیمیا کی تحقیقات ہے کہ سنکھیا نظام جسمانی میں داخل ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا بدن اینٹھنے لگتا ہے۔ رنگ نیلا پڑ جاتا ہے اور بالآخر موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ تحقیقات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے لیکن اس سے سنکھیا کھلانے یا کھانے کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ علم الاعضاء کے اصول کے مطابق غدودوں کا فعل ہے کہ لذیذ غذا کے سامنے آتے ہی منہ میں رطوبت پیدا ہونے لگتی ہے۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس رطوبت کا اعلان بھی ضروری ہے بلکہ اثرات اور نتائج سے آگاہی کے بعد آپ زہر سے اور بھی دور بھاگتے ہیں اور پانی کو فوراً پی جاتے ہیں۔ یہ وہ پابندیاں ہیں جو حفاظت نفس اور خوش سلیقگی کے مجلسی جذبہ نے عاید کی ہیں۔ یہاں آپ اس رکاوٹ کو تسلیم کر لیتے ہیں لیکن سیکڑوں دوسرے مقامات پر (حالانکہ واقعات بہت کچھ یکساں ہوتے ہیں) اسے برطرف کر دیتے ہیں۔

نفسیات کے تحت جنسیات کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ ایک قسم کی حقیقت نگاری کے پردے میں اتنا کچھ سامان دلبستگی فراہم کیا جاتا ہے کہ پوری آزادی کے ساتھ اور کسی طرح ممکن نہ تھا۔ علمی لہجہ اور دوران مباحثہ میں ان چھپی ہوئی تمناؤں کے اظہار کا موقعہ ملتا ہے جو اس بے راہ روی کے زمانہ میں بھی کامیاب نہیں ہو پاتی ہیں۔ مرد و زن کے تعلقات کے ہزاروں نئے نظرئے تشکیل ہو رہے ہیں اور خدا جانے کتنی زندگیاں انہی تجربوں کی نذر ہوتی جاتی ہیں۔ ایک بڑا طبقہ شادی کے نظام کے خلاف ہے اور اس سلسلہ میں مکمل آزادی کا خواہاں ہے۔ غرضیکہ ایک عجیب طوفان برپا ہے اور مجھے تو کوئی امید معلوم نہیں ہوتی کہ اس ہیولیٰ سے کوئی اچھی شکل پیدا ہو سکے۔

پچھلے صفحات میں مجمل طور پر ان متعدد مباحث کا ذکر آ گیا ہے جو نفسیاتی روشنی میں دیکھے جاتے ہیں اور ضمناً اس طرف بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ کیسے خراب نتیجے اس طرز عمل سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اب ہم سیاسیات کو لیں گے۔

برسات کے تیز رو دریا میں داخل ہونے والے نومشق تیراک کی طرح میدان سیاست کے نئے کھلاڑیوں کو حد درجہ احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ خصوصاً ایک غلام ملک کی سیاست جہاں قوم حکومت پرستوں اور انقلاب پسندوں

کے دو گروہوں میں منقسم ہو جاتی ہے اور باہمی مخالفت کے سبب سے ہر گروہ انتہا کو پہونچ جاتا ہے۔ لازمی طور پر وہ نوخیز اصحاب جو تھوڑے ہی دن پہلے تک بے فکری کی دلچسپیوں میں محو رہے ہوں، جب امورِ ملکی کی مدروت، بتلائے کشاکش اور فرقہ بندی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو اس کا اندیشہ بہت قوی ہو جاتا ہے کہ ناتجربہ کاری اور صحیح طریق کار کے فقدان کے سبب اس جماعت کی طرف جو زیادہ پرجوش اور للچانے والے نعرے لگا رہی ہو چل پڑیں۔

میں نے "ناتجربہ کاری" اور "صحیح طریق کار کے فقدان" کے دو فقرے ایسے استعمال کئے ہیں جو بعض اصحاب کو برہم کرنے کے لئے کافی ہو سکتے ہیں لیکن حقیقتاً یہی برہمی ان کی کم فہمی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ کیونکہ اس طبقہ میں حریف کو صحیح جواب دینے اور ذاتی عزت و ذلت کے جذبات سے ہٹ کر فیصلہ کرنے کی نوبت ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ مقابلہ کے میدان میں اس طرح کا جوشیلاپن جو ضرورت سے زیادہ دور پیجا کر دھوکہ میں ڈالنے والا ہو، ایک کمزوری سمجھا جاتا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ صحیح طریق عمل کا معیار کیا ہے۔ یہ سوال واقعی اہم ہے اور بہت کچھ اس مفہوم پر منحصر ہے جو ہم اس کا قرار دیں۔

بیسویں صدی کے ہر لمحہ بدلتے ہوئے تصورات اور ہر گھڑی تبدیل ہونے والے عقاید کی دنیا میں "صحیح" کا کوئی درست مفہوم پیش کرنا دشوار ضرور ہے لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کوئی بھی طریق کار جو سہل العمل ہو، جس کے برتنے میں ضمیر اختلاف نہ کرتا ہو اور جس کا انجام خوشگوار ہو یا کم از کم انجام کے خوشگوار ہونے کے قوی امکانات ہوں، درست طریقہ کہلائے جانے کا اہل ہے۔

ہندوستان کے مختلف المذاق رہنماؤں نے جس بھول بھلیاں میں قوم کو ڈال رکھا ہے اور جس میں ملک اندھے پن کے ساتھ دوڑتا ہوا چلا جا رہا ہے، اس کا انجام بہت تاریک نظر آتا ہے بلکہ سچ یوں ہے کہ اس کا کچھ انجام نظر ہی نہیں آتا ہے۔ بغیر تفصیلات میں پڑے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ملک کو اس کے لیڈروں نے خراب کر رکھا ہے۔ جو مناقشے سب سے زیادہ مہلک ہیں ان میں مذہبی اور تمدنی عصبیت کی بڑھتی ہوئی لہر بھی ہے۔ ہندو اور مسلمان کے جھگڑے، ویدک اور اسلامی کلچر کا اختلاف، ہندی اور اردو کا قضیہ یہ وہ شرمناک نتیجے ہیں جو صرف ہندوستان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ پھر جب ہم دیکھتے ہیں کہ عوام نے کسی مشترکہ الہام کے ذریعہ اپنے مذہب کو خطرہ میں محسوس نہیں کر لیا ہے بلکہ ان تمام سانحوں کی ابتدا کسی معزز رہنما کے قلم یا زبان سے ہوئی ہے تو ملک کی قسمت پر افسوس آتا ہے، اس پر قہر یہ ہے کہ ہندوستان کی پوری نئی نسل جس سے تمام اُمیدیں وابستہ ہو سکتی ہیں اپنے آپ کو انہی ناقابل اعتماد ہاتھوں میں دئے بیٹھی ہے جو ان کی تقدیر کا فیصلہ کرانے کے بہانے اسے عمیق تعطل میں ڈالے ہوئے ہیں، لیکن اس کے بعد بھی ہر کمیونسٹ، انارکسٹ، اعتدال پسند یا ناکارہ و بیکار یہ سمجھ کر مطمئن ہے کہ ہمارے یہ نمایندے تاج برطانیہ سے ہندوستان کی آزادی لے ہی لیں گے اور یقین کر چکا ہے کہ اسے سوا جھنڈے نکالنے یا کسی لیڈر کے جلوس کے لئے چندہ جمع کرنے کے اور کوئی دوسرا کام ملک کی آزادی

کے لئے کرنا باقی نہیں رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر اگر وہ کچھ کرتا ہے تو سوشلسٹ اپنے کو اچھا اور گاندھی کو بُرا بتاتا ہے اور گاندھی کا مقلد سب کو قوم کے لئے خطرناک۔ اس کے علاوہ نہ ریشمی قمیص اور کھدر کی اچکن پہننے والا سوشلسٹ جو گلے کی پوری قوت سے چیختا ہے کچھ کر سکتا ہے اور نہ مقدس ٹوپی والا پُرامن نیشنلسٹ ہی کچھ کرنے پر آمادہ معلوم ہوتا ہے۔

ایک اور غار جس کی طرف ہمارے نوجوان بہت تیزی سے جا رہے ہیں وہ روز افزوں نسائیت ہے جو بڑے اور چھوٹے سب میں یکساں سرایت کرتی جاتی ہے، فیشن، اعلیٰ معیار زندگی، تہذیب اور خوش مذاقی سب اسی کے بدلے ہوئے نام ہیں اور سب کو اگر ذوقی نمائیوں سے عریاں کر کے دیکھا جائے تو سوائے جسمانی آسائش بلکہ تعیش کے اور کچھ نہ نکلیں گے لباس غذا، تفریحات غرضکہ ہر چیز میں ایک بڑھتا ہوا زنانہ پن اور نزاکت نمایاں ہے جو کسی حوصلہ مند کارکن اور با اقبال قوم کے افراد میں نہیں پایا جاتا۔ ہمارے یونیورسٹی کے طالبعلم، سیاسی والنیٹر، اخبار نویس اور دستکار سب اسی رو میں بہہ رہے ہیں اور کوئی نہیں دیکھتا کہ شوق اور تقلید کی ناؤ کہاں جا رہی ہے۔ حقیقتاً متذکرۂ بالا تمام چیزیں انسان کے قوائے عمل کو سست، اس کے ذہن اور رفتار ترقی کو ماند اور جذبۂ برداشت و استقلال کو کم کرنے والی ہیں۔ لیکن تباہ ہونے والوں کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ تباہی کا احساس ان میں باقی نہیں رہتا بلکہ اس دریا کا شور جس کے ساحلی نظاروں میں محو ہو کر وہ بہتے جاتے ہیں، موت کی راگنی کی طرح ان کے کانوں کو مسحور کر لیتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اگر وہ اپنے سامنے موت کو دیکھ لیں تو شاید اس سے بچ جائیں مگر ان کو تو مرنا ہے

مولوی الحاج۔ ایس۔ بی۔ احمد۔ مہر سعادت خاں مطبع ... دہلی

مسولینی

مشتعل تاج وکمر، بجھتی ہوئی شام وسحر ڈوبتی نبضیں دھڑکتے دل، سلگتے بام ودر
زلزلے بارود ساماں، آندھیاں خوننابہ بار بے کفن لاشوں کی فصلیں، ہڈیوں کے کشت زار
دے رہی تھی غسل دنیا کو مری تیغوں کی آگ لوٹنے اُٹھا تھا اک بیمار دنیا کا سہاگ
میری شمعِ قہرمانی میں شبابوں کے لہو میری راتوں کی رگوں میں آفتابوں کے لہو،
تھے ہزاروں کاسہ ہائے سر مرے جام وسبو میرے میخانوں سے آتی تھی جلی لاشوں کی بو،
آفتابوں سے سیہ راتوں کو ٹکراتا تھا میں ساحلوں کو آئینے طوفاں کے دکھلاتا تھا میں
حکمتِ اقوام پر ہنستا رہا میرا جنوں میرے کرگس پی چکے تھے کتنے شاہینوں کے خوں
قسمتِ ایام تھی میرے کفِ جبروت میں کتنی کیلیں جڑ چکا تھا وقت کے تابوت میں
دے چکی تھی خود پرستی اپنے یزداں کو طلاق اُڑ رہا تھا آدم و حوّا کی عظمت کا مذاق
کتنے سینوں میں دھڑک تھی آہ میرے نام سے قہقہے کتنے چرائے تھے لبِ ایام سے
ڈال دی آخر سفینے پر تلاطم نے کمند زندگی کے لاکھ آنسو موت کا اک زہر خند!
آندھیو اُٹھ کر مرے خونیں چراغوں کو بجھاؤ زلزلو ایوانِ فاشیت کی بنیادیں ہلاؤ!

خونِ آدم سے کھنچا تھا میرا خطِ رہگزر
حشر تک تھوکے گی دنیا آہ میری لاش پر!

پروفیسر شور (علیگ)

غزل مثلث : پروفیسر جمیل مظہری، ایم-اے

سُن مرے دل کی دھڑکنیں اے میری خودی کے رازداں	میرا مذاق شاعری ہے مرے روح کی فغاں
دامِ تخیلات میں طائرِ عرش پرفشاں

گم نہ ہوا کسی طرح نشۂ جاوداں مرا	آتش و آب و خاک و باد لے چکے امتحاں مرا
تھک گئی گردشِ نجوم تھک گیا دورِ آسماں

اس کا جواب آشکار، اس کا سوال آشکار	جلوہ ہو یا نگاہ ہو، دونوں کا حال آشکار
یہ بھی حجاب درمیاں وہ بھی حجاب درمیاں

عشق نے کچھ کیا نہیں حسن نے کچھ دیا نہیں	یعنی مزاجِ دہر نے کوئی اثر لیا نہیں
تیرا فسوں بھی رائیگاں میرا جنوں بھی رائیگاں

شوق کو ناصبور کر یہ ہی عاشقی کی شان	اس کے غرور کو نہ چھیڑ ضبط میں ہے خودی کی شان
کس سے مقابلہ ہے یہ اے دلِ زار و ناتواں

رسم و رواج دو جہاں مجھ کو نہ مجھ سے لے سکے	ناز و نیازِ دلبراں مجھ کو نہ مجھ سے لے سکے
ہائے رے تو ہی اب مجھے لطفِ نگاہِ دوستاں

میرا نیاز بے محل میرا گداز بے طلب	پوچھ نہ میری زندگی جیسے ہو بعد نصف شب
جیسے دیر کا چراغ حاصلِ سوز رائیگاں

شب ابھی نالۂ جرس نغمۂ ساربان ہے دور	عالمِ نو ہے منتظر جس کا وہ کارواں ہے دور
سامنے دیکھتا ہے تو ہے وہ غبارِ کارواں

پیرِ مغاں سے جا کے مانگ ساغرِ جم میں زندگی	ڈھونڈ رہا ہے کیوں عبث دیر و حرم میں زندگی
ان کی خودی بھی نیم جاں ان کا خدا بھی نیم جاں

عشق پہ اپنی بزدلی گرچہ جتا دی حسن سے	ذوقِ نظر کی تشنگی گرچہ بڑھا دی حسن نے
اٹھ نہ سکا جمیل سے پھر بھی حجاب درمیاں

انسانِ کامل

شیطاں جو ہوا اپنے مریدوں سے مخاطب — اک غرقِ عقیدت نے یہ کی عرض کہ اُستاد
جاری ہے ابھی آپ کا فرمان تباہی — کیا تشنۂ تکمیل ہے انساں کی اُفتاد
ہم نے تو سنا تھا کہ تہِ دامِ عناصر — ہے صیدِ ہوس طائرِ تفکیر کا صیاد
تھی اس کے تخیل کی عناصر پہ حکومت — لیکن اب اسے اپنے مراتب نہ رہے یاد
ہے اتنی شدید اس کے تصور کی غلامی — تشکیل سے توفیقِ پرستش نہیں آزاد
انساں کا یہ حال ہے اور حضرتِ اقدس — اس دشمنِ دیرینہ کی غفلت سے نہیں شاد
زد پر ہو عدو جب تو تردد نہیں کرتے — ہو ترکشِ نفرت میں اگر ناوکِ بیداد
ہم منتظرِ راحتِ اُستادِ گرامی — ایما ہو تو کر دیں ابھی مجہول کو برباد
شیطاں نے کہا مجھ سے یہ معصوم عقیدت — ممکن ہے کہ تو خود تجھ کو بنا دے کبھی اُستاد
لیکن ہے ابھی تجھ میں بڑی خام نگاہی — ہیں فتنۂ باطل کی ترقی سے نہیں شاد
ہوں فطرتِ انساں کے مراتب کا شکاری — اور دام میں آتے نہیں یہ طائرِ آزاد
میں آتشِ سوزاں ہوں مگر اس کے چمن میں — انوارِ سرِ طور نشیمن کی ہیں بنیاد
یہ تو بھی سمجھتا ہے کہ قبضے میں ہمارے — ہر راحت [illegible] سوال ہے ہر فتنۂ اولاد
ہر عہد میں انساں کی عقیدت کو خریدا — ہر دور میں ایماں کے ذخیرے کئے برباد
تسلیم تھا ہر چیز کو انساں کا تصرف — ہر سمت تھی محکومیِ انساں کی [illegible]
ہاں میں نے نہ کی فطرتِ انساں کی غلامی — ہاں میری خودی ذوقِ جراحت سے ہے آزاد
فولاد سے آئینہ بنایا تھا ازل میں — اور میں نے بنایا ہے ہر آئینہ کو فولاد
انساں کو فطرت نے عطا کی تھی خلافت — میں نے کبھی [illegible] بنایا کبھی [illegible]
لیکن بہمہ قدرت گمراہیِ انساں — اک [illegible] نہیں یاد
انساں کے مراتب کا ہے اک نقطۂ آخر — فطرت سے جب اس نقطہ پہ [illegible]
اس نقطۂ آخر پہ وہ ایقان ملے گا، — شاگرد یہی پھر اس سے مخاطب [illegible]
مکّہ سے ہے انساں کی تکمیل کا خطرہ — ہمت ہو تو اس شہر کو کر دے کوئی برباد
مرکز مری کوشش کا یہی شہر رہا ہے — ہر فتنۂ باطل کو [illegible] ہیں [illegible]
کھاتا ہوں اسی شہر میں ہر گام پہ ٹھوکر — ایسی کہ نکل جاتی ہے منہ سے مرے فریاد
اس شہر میں اک گھر سے وہی نور ہے ساطع — ہے [illegible] سب کے لئے مرکز [illegible] جس نور کی بنیاد

پیشکش

میں ترے حسن کی تعریف ہی کرتا رہتا
تیری تعریف کے الفاظ اگر مل سکتے!

اُف رہی بے مائیگیٔ دامنِ گلزارِ خیال
ایک دو پھول ہی مطلب کے مگر مل سکتے

لالہ و گل ہوں کہ نرگس ہو کہ سرو و شمشاد
میں کسی سے بھی کوئی کام نہیں لے سکتا

تیرے رخسار و لب و چشم و قد و قامت کو
میں کسی چیز سے تشبیہ نہیں دے سکتا

جانے کب تک تجھے اللہ نے شاعر بن کر
شعرِ نازک کی طرح ذہن میں سوچا ہوگا

جب کہیں دہر کے ایوانِ مصوّر میں تجھے
گنگناتے ہوئے گاتے ہوئے لکھا ہوگا

سلیمان اریب

کلام آمد بھوپالی

فضائے شام اسیری میں رنگ بھرنا ہے
قفس میں لا کے جلانا ہے آشیاں مجھ کو

یہ کس مقام پہ پہونچا دیا محبّت نے
جہاں وصال بھی ہونے لگا گراں مجھ کو

پناہ اور تمھاری محبتوں کی پناہ
ملوں تو ڈھونڈ لے اب دورِ آسماں مجھ کو

ملا ہے برق کی شعلہ فشانیوں کے ساتھ
جنونِ ہمتِ تعمیرِ آشیاں مجھ کو

اک نقشِ سجدہ لے کے ترے آستاں سے ہم
آزاد ہو گئے ہیں زمان و مکاں سے ہم

حیراں ہیں اب کہ وسعتِ کونین کیا ہوئی،
اُٹھنے کو اُٹھ تو آئے ترے آستاں سے ہم

تیرا جمال تیرا تصور تیرا خیال،،
بزمِ جہاں میں دور ہیں بزمِ جہاں سے ہم

توہمات پہ جب رنگِ اعتبار آیا
تو ہر خیال بشکلِ خیالِ یار آیا

حریمِ حسن میں اب آفتاب لیجاؤ
کہ آئینہ تو بری طرح شرمسار آیا

حریمِ حسن کے آداب ارے معاذ اللہ
نہ ہوشیار گیا میں نہ ہوشیار آیا

کلام شعلہ آسیونی :

بارہا تنہائیوں میں یادِ دوست　　آئی اور آکر غزل خواں ہوگئی
خوب رویا آج میں دل کھول کر　　ایک بستی اور ویراں ہوگئی
ایک تنہائی تھی شعلہ غمگسار　　وہ بھی صرفِ یادِ جاناں ہوگئی

شبِ فراق تری یاد اس طرح آئی　　کہ جیسے دل میں کوئی پھانس سی چبھو جائے
تجھے مرقعِ عبرت بنا نہ دے شعلہ　　وہ بیکسی جو تری آستیں بھگو جائے

جو نفس جاتا ہے لیجاتا ہے وہ میرا سلام　　جو نفس آتا ہے وہ پیغام اُن کا لائے ہے
اک طرف میں ہوں کہ غم میں ہنس رہا ہوں دمبدم　　اک طرف پیمانۂ دل ہے کہ چھلکا جائے ہے

غزل : دل شاہجہاں پوری

وہی صحرا وہی جذبات ہیں دیوانوں کے　　زندگی رنگ بدلتی ہے تو ایوانوں کے
ایسی رونق سے تو ہر بزم میں ظلمت اچھی　　گل کرو شمع کہ خطرے ہیں بہت جانوں کے
تیرے زنداں کی ... تنگی صحرا بھی نہیں　　کیا یہ عالم ہے کہ منھ زرد ہیں دیوانوں کے
میری روداد سنو پھر جو سنی ہے اب تک　　کچھ ورق اور بڑھا دو انھیں افسانوں کے
چھپ کے جو پاسئے ہر ... سے نکلتے ہی نہیں　　میری نظروں میں وہ کاسے ہیں بیابانوں کے
یہ بھی ہے بندۂ پندار کی نظروں میں گناہ　　لبِ مینوش سے لب مل گئے پیمانوں کے

آنکھ اپنی نہ جھپکنا تھی نہ جھپکی اے دل
راز داں رنگ بدلتے رہے افسانوں کے

غزل : حسرت ترمذی

غم سے اب ہم کو وہ راحت ہے کہ ہم جانتے ہیں
اس قدر تیری عنایت ہے کہ ہم جانتے ہیں

تو نے اک دن کوئی پیغام دیا تھا ہم کو
آج تک دل کی وہ حالت ہے کہ ہم جانتے ہیں

اک ترے پاس نہ ہونے سے ارے روحِ نشاط
دل کو ہر شے سے وہ نفرت ہے کہ ہم جانتے ہیں

اب ہمیں سے یہ شکایت کہ وفادار نہیں
اتنی معصوم شکایت ہے کہ ہم جانتے ہیں

اے حقیقت کو حقیقت نہ سمجھنے والے،
غم وہ سرمایۂ راحت ہے کہ ہم جانتے ہیں

دل ہے جس دن سے پرستار کسی کا حسرت
ہر تمنا وہ عبادت ہے کہ ہم جانتے ہیں

غزل : رعنا نکسوی

آج پھر تجھکو پکاریں گے حریم دل سے ہم
کیا کریں واقف نہیں ہیں دوسری منزل سے ہم

چھیڑ دیں نغمات ضبط و رشک سازِ دل سے ہم
اتنے بیگانہ نہیں رسم و رہِ محفل سے ہم

پھول توڑا ہے کسی نے یا کہیں شیشہ گرا
کیا سمجھتے اور آوازِ شکست دل سے ہم

کاٹتے ہیں کس طرح لمحاتِ تنہائی نہ پوچھ
کانپ جاتے ہیں خیال قربتِ محفل سے ہم

دل نہیں تو اہتمام جلوۂ دیدار کیا،
طور تو لاکھوں، بنا سکتے ہیں خاکِ دل سے ہم

سجدہ کیا، سر پھوڑ لے رعنا حریم ناز سے
باز آئے امتحانِ جذبۂ کامل سے ہم

غزل : سید علی سجاد قہر اکبر آبادی

یہ تیری یاد کا عالم - یہ دل کی کیفیت
نہ جانے سامنا ہوتا ترا تو کیا ہوتا

مرے جنوں نے مرا پردہ رکھ لیا ورنہ
شکستِ ضبط نے رسوا ہی کر دیا ہوتا

جنوں کی خیر ہو اس نے بچا لیا ورنہ
فریبِ دیر و حرم کب کا کھا چکا ہوتا

سنا کیا ہوں بڑے شوق سے فسانۂ زیست
سنا نہ جاتا - سمجھ میں جو آگیا ہوتا

مطبوعات موصولہ

نیا ادب میری نظر میں اس وقت نئے اور پرانے ادب کے درمیان جو کشاکش جاری ہے وہ میرے نزدیک بالکل بے معنی ہے، کیونکہ زندگی کے نئے حالات کے ساتھ ادب میں بھی تبدیلی پیدا ہونا ضروری ہے اور اُسے کوئی نہیں روک سکتا، اور پرانے ادب نے جو خدمات کی ہیں انھیں نیا ادب بھی فراموش نہیں کرسکتا۔

اسی موضوع پر تیرہ مشہور اہلِ قلم حضرات کی رائیں آغا سرخوش قزلباش دہلوی نے یکجا کردی ہیں، اور ان کے مطالعہ کے بعد یقیناً ایک درمیانی راہ ہمیں ایسی ملجاتی ہے، جس پر قدیم و جدید ادب دونوں دوش بہ دوش چل سکتے ہیں آغا سرخوش کی یہ کوشش بہت برمحل ہے اور ہمارے ادیبوں کو اس سے استفادہ کرنا چاہئے۔

قیمت دو روپیہ ۔ ملنے کا پتہ ہندوستانی پبلشرز ۔ دلی ۔

قد بڑھانے کی ورزشیں راہنما بک ڈپو گجرات نے یہ کتاب شایع کی ہے اور آغا سکندر بخت اس کے مصنف ہیں ان کا بیان ہے کہ اس کتاب میں جو ورزشیں انھوں نے تحریر کی ہیں وہ ان کے سالہا سال کے مطالعہ و تجربہ کا نتیجہ ہیں۔

کتاب کے عنوانات اور اس کے مباحث علمی حیثیت بھی رکھتے ہیں اور عملی بھی۔ زبان صاف و شگفتہ ہے اور نقوش و تصاویر نے مفہوم کو اور زیادہ قریب الفہم بنا دیا ہے۔

ضرورت ہے کہ اس کتاب کو مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے تاکہ ہماری نسل کو ابتدا ہی سے صحیح و توانا بننے کا شوق پیدا ہو ۔ قیمت سوا روپیہ ۔

زینت کربلا سوانح میں جناب زینب دختر علی مرتضیٰ کے، جنھیں پروفیسر سید آغا شہر لکھنوی نے قلمبند فرمایا ہے ابتدا میں چند مشہور شیعی اہل قلم کی رائیں بھی شامل کی گئی ہیں اور بلا استثنا سب نے اس کتاب کی تعریف کی ہے ۔ ضرورت تھی کہ کسی سنّی عالم کی رائے بھی شامل کی جاتی، لیکن شاید یہ جرأت اس لئے نہیں کی گئی کہ یہ شیعی نقطۂ نظر ہے۔ اس کتاب میں ایک بات بھی قابل اعتنا نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ احادیث و روایات کے پرکھنے کے لئے حضرات شیعہ کے یہاں بھی اصول درایت قایم ہیں اور ہو سکتا ہے کہ سب و شتم کے جواز میں ان اصول سے کام لیا جاتا ہو لیکن مناقب کے باب میں ان کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے

فضایل حضرت زینب کے اظہار میں جن احادیث سے کام لیا گیا ہے وہ تمامتر لغو ہیں اور نتیجہ ہیں محض اس بڑھی ہوئی ناروا عقیدت کا جس نے سُنّی و شیعہ دونوں طبقوں میں اس قسم کی حدیثوں کا انبار لگا دیا تھا۔

فاضل مولف نے سرورق پر ظاہر کیا ہے کہ یہ کتاب خواتین اسلام کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور غالباً اسی لئے انھوں نے زیادہ ضعیف روایات سے کام لیا ہے، کیونکہ عورتیں ناقص العقل کہلاتی ہیں اور انکے سامنے عقل کی باتیں کرنا حماقت ہے۔

مجھے یہ کتاب پڑھکر سخت افسوس ہوا کہ مذہب انسان کو کتنا اندھا کر دیتا ہے اور اس بلا میں پروفیسر وغیرہ پروفیسر سبھی گرفتار ہیں اگر وقت ملا تو آیندہ کسی اشاعت میں اس پر تفصیلی تبصرہ پیش کیا جائے گا۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: امامیہ مشن، نخاس، لکھنؤ۔

ناہید مختصر ناول یا طویل افسانہ ہے، مرحوم آغا شاعر قزلباش دہلوی کا جسے ہندوستانی پبلشرز دہلی نے شایع کیا ہے۔ آغا شاعر، صرف شاعر ہی نہ تھے، بلکہ ادیب بھی تھے، صحافی بھی تھے اور نظم کی طرح نثر بھی خوب لکھتے تھے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ ناول پہلی بار شایع ہوا ہے، یا اس سے پہلے بھی چھپ چکا ہے، بہرحال ضرورت تھی کہ مرحوم کی اس ادبی یادگار کو باقی رکھا جاتا۔ قیمت ایک روپیہ۔

شیریں قیسی رامپوری کا مختصر ناول ہے۔ قیسی صاحب آجکل کے مقبول ناول نویسوں میں سے ہیں اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ قیسی صاحب ہماری معاشرت میں اصلاح کے قایل ضرور ہیں لیکن شاید ذہنی ارتقار کا اس حد تک ساتھ نہیں دے سکتے جہاں سے ماورائے مذہب عقل و فراست کی دنیا شروع ہوتی ہے۔ اس ناول میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ایک عورت مرد کے لئے کتنی قربانیاں کر سکتی ہے اور اگر مرد انھیں قبول نہ کرے تو پھر اس کی نفرت بھی اتنی ہی شدید ہو جاتی ہے۔

عبارت صاف، انداز بیان سلجھا ہوا اور پلاٹ اچھا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ ہندوستانی پبلشرز، دہلی

منتخب نظمیں سنہ ۴۴ء کی نظموں کا انتخاب ہے جسے مکتبۂ اردو لاہور نے شایع کیا ہے۔ اس میں تقریباً تین درجن شعراء کا نام نظر آتا ہے جن میں مشہور زیادہ اور غیر معروف کم ہیں۔ یہ انتخاب ادارۂ ادب لطیف لاہور نے کیا ہے اور زیادہ تر جدید خیالات کی جدید شاعری کو سامنے رکھکر انتخاب کیا گیا ہے۔ کسی کے انتخاب کے مسئلہ میں رائے زنی کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ اس کا تعلق ذاتی رائے سے ہے اور ذاتی رائے اچھی ہو یا بری، نقد و تبصرہ سے بڑی حد تک محفوظ رہتی ہے۔ تاہم میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جن شعراء کی نظموں کا انتخاب کیا گیا ہے، انھوں نے سنہ ۴۴ء میں ان نظموں سے بہتر نظمیں بھی کہی ہیں اور میں شاید ان میں سے سوائے دو چار کے کسی کا انتخاب نہ کرتا۔ قیمت عہ

دھوپ چھاؤں مولوی فضل الرحمان صاحب ناظم نشرگاہ لاسلکی حیدر آباد دکن، کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ میں فاضل مصنف کے ڈرامے تو کتابی صورت میں بھی دیکھ چکا ہوں اور اسٹیج پر بھی، لیکن یہ خبر نہ تھی کہ وہ صرف تمثیل نگار ہی نہیں، بلکہ نظم نگار بھی ہیں۔ یہ نظمیں اپنے موضوع اور طرز ادا کے لحاظ سے بالکل زمانۂ حال کی چیزیں

اور ادب قدیم سے انھیں کوئی تعلق نہیں، لیکن ادب جدید کا وہ بھیانک پن ان میں نہیں ہے جو بعض نوجوان شاعروں کی نظموں میں پایا جاتا ہے -

ان نظموں کی ٹکنک بڑی حد تک وہی ہے جس سے ہمارا ذوق آشنا ہے اور جس کے ترنم سے بے نیاز ہوکر ہم کوئی خوش آہنگ شعر نہیں کہہ سکتے۔ اور اگر کسی نظم میں وہ اس ٹکنک سے کسی حد تک ہٹے بھی ہیں تو اس خوبصورتی کے ساتھ کہ ہم اسے محسوس نہیں کرسکتے۔

یہ نظمیں اپنے مفہوم کے لحاظ سے بہت بلند ہیں اور عہد حاضر کی ذہنی ترقیوں کی آئینہ دار - قیمت ۱۲/ - ملنے کا پتہ: کتابخانہ انجمن ترقی اردو عابد روڈ - حیدرآباد دکن -

قایدین کے خطوط جناح کے نام

ہندوستان کی موجودہ سیاسی پیچیدگی اور اس کا تعلق دور ہو یا نہ ہو لیکن اس کے اسباب اب پوشیدہ نہیں رہے - اور ان کو سمجھنے کے لئے وہ مراسلت کافی ہے جو ہندو مسلم جماعتوں کے اکابر کے درمیان ہوئی ہے - اس مجموعہ میں جناب عبدالرحمٰن سعید نے انھیں خطوں کو یکجا کر دیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کی بڑی ضرورت تھی - ان خطوط کے پڑھنے کے بعد پاکستان وغیر پاکستان دونوں کی حیثیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اور اسی کے ساتھ قایدین کے اُن نفسیاتی کیفیت پر بھی روشنی پڑتی ہے جو ملک کی تحریک آزادی پر کسی نہ کسی نہج سے اثر انداز ہوئی ہے - نفیس اکاڈیمی حیدرآباد نے بہت نفاست کے ساتھ اسے شایع کیا ہے - قیمت دو روپیہ

۱۹۴۴ء کی معیاری غزلیں اور نظمیں

ادارۂ ہندوستانی پبلشرز دہلی نے سال گزشتہ کی طرح امسال بھی معیاری نظموں اور غزلوں کا مجموعہ شایع کیا ہے - پہلے ۱۹۴۳ء کی نظموں کا انتخاب شایع ہوا تھا اور اب ۱۹۴۴ء کی نظموں کا انتخاب، شایع کیا ہے -

اس مجموعہ میں مشہور شعراء کی ۳۴ غزلیں اور ۲۶ نظمیں ہیں اور سوا چند کے سب اچھی ہیں - قیمت ایک روپیہ چار آنے -

گمنام خطوط

مجموعہ ہے اُن ۵۰ خطوط کا جو رسالہ چمنستان دہلی میں وقتاً فوقتاً شایع ہوئے تھے - اسکے مرتب سید محمود حسن کاظمی فراق بتائے جاتے ہیں، ان کے مصنف بھی غالباً وہی ہیں - باتوں باتوں میں زندگی کے پیچیدہ مسایل کو حل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ مراسلت کے ذریعہ سے تبادلۂ خیال کیا جائے، خواہ یہ صورت حقیقی ہو یا غیر حقیقی - ادبی حیثیت سے بھی یہ خطوط قابل اعتنا ر ہوتے - - قیمت ڈیڑھ روپیہ -

The mind of Mahtma Gandhi

مسٹر پی، کے، پربھو اور یو۔ آر، راؤ نے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے - اس مجموعہ میں مہاتما گاندھی کے اُن تمام اقوال اور فقروں کو یکجا کر دیا گیا ہے جن سے گاندھی جی کے سیاسی، اخلاقی اور مذہبی خیالات پر روشنی پڑتی ہے - کتاب مختلف ابواب میں تقسیم کی گئی ہے اور ہر باب کا ایک علٰحدہ عنوان مقرر کرکے اسکے تحت جتنے اقوال گاندھی جی کے مل سکے ہیں یکجا کر دئے گئے ہیں، اس طرح اس کتاب نے گاندھی جی کی سوانح عمری پر ایک انتقادی مطالعہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے - کتاب نہایت دلچسپ ہے اور ہر اہل قلم کی میز پر اس کو ہونا چاہئے -

اگر اس کا اُردو ترجمہ بھی شایع ہو جائے تو اس کی افادیت بہت بڑھ سکتی ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کلکتہ نے اسے شایع کیا ہے اور تین روپیہ میں اسی پتہ سے مل سکتی ہے۔

حکمت اقبال مجموعہ ہے تیرہ اہل قلم کے مضامین کا جن میں اقبال کی کسی نہ کسی شاعرانہ یا فلسفیانہ خصوصیت پر بحث کی گئی ہے۔ اقبال پر اسوقت تک بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور آیندہ بھی کہا جائے گا، لیکن اس موضوع کی تازگی غالباً ہمیشہ قایم رہیگی، کیونکہ ایک شاعر اپنی جگہ خواہ کتنی ہی محدود انفرادیت کیوں نہ رکھتا ہو، لیکن اپنے مطالعہ کرنے والوں کے مختلف نقطہ ہائے نظر کے لحاظ سے وہ چند در چند حیثیات کا مالک ہو جاتا ہے۔ اول اول اقبال صرف شاعر محض کی حیثیت سے رونما ہوئے، لیکن ان کی یہ حیثیت بہت جلد فلسفی شاعر کی حیثیت میں تبدیل ہو گئی اور اہل نظر کو بہت کچھ سمجھنے اور کہنے کا موقعہ ہاتھ آگیا۔ اس مجموعہ میں بعض مقالات نہایت پاکیزہ ہیں اور کافی تحقیق کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔

غلام دستگیر رشید ایم۔اے نے انھیں مرتب کیا ہے اور نفیس اکاڈیمی حیدرآباد نے شایع — چار روپیہ قیمت ہے۔

نازیت بظاہر نازیت ختم ہو چکی ہے، لیکن جب تک دنیا میں سرمایہ داری اور دولت کی بھوک باقی ہے یہ کسی نہ کسی نئی صورت میں ہمیشہ رونما ہوتی رہے گی، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اس کا مطالعہ علمی و تاریخی نقطۂ نظر سے کریں اور سمجھیں کہ نظام عالم میں یہ طاغوتیت کیونکر رونما ہوئی اور آیندہ اس سے کیا کیا خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس کے مصنف شاہ حسین رزاقی ایم۔اے، تاریخ و سیاسیات پر اچھا عبور رکھتے ہیں اس لئے انھوں نے اس تحریک کے کسی پہلو کو نہیں چھوڑا اور بڑی مفید معلومات اس کتاب میں فراہم کر دی ہیں — نفیس اکاڈیمی حیدرآباد جو مفید لٹریچر پیش کرنے میں اسوقت پیش پیش نظر آتی ہے، قابل مبارکباد ہے کہ اس نے یہ مفید کتاب شایع کی۔ قیمت دو روپیہ بارہ آنے ہے۔

یادگار برق مہاراج بہادر برق بی۔اے، دہلی کے مشہور خوشگو شاعر تھے اور ملک کے تمام مشہور رسایل و جراید میں ان کا کلام شایع ہوتا تھا۔ یہ تذکرہ انھیں کا ہے جسے جناب طالب بی۔اے دہلوی نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں مولف نے ان تمام خیالات کو یکجا کر دیا ہے جو برق مرحوم کی ذات یا انکی شاعری کے متعلق مختلف حضرات نے ظاہر کئے ہیں یا ملک کے رسایل میں شایع ہو چکے ہیں۔ اخیر میں بعض وہ نظمیں بھی شامل کر دی گئی ہیں جو اسوقت تک شایع نہ ہوئی تھیں۔ یہ تذکرہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے واقعی یادگار برق ہے اور اس کو پیش کر کے طالب دہلوی نے اپنا فرض تلمذ پوری طرح ادا کر دیا ہے۔ کتاب بہت اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے۔ قیمت ہے اور ملنے کا پتہ: طالب بی۔اے، چاوڑی بازار، گلی بتاشان، دہلی۔

تجلیات مجموعہ ہے زیادہ تر مہر عثمانی جونا گڈھی کی غزلوں کا۔ جسے مکتبۂ قصر الادب آگرہ نے شایع کیا ہے — جناب مہر عثمانی اگو عمر کے لحاظ سے نوجوان ہیں، لیکن فکر و احساس کے لحاظ سے کافی پختگی رکھتے ہیں، ان کا کلام رسایل و جراید میں شایع ہوتا رہتا ہے اور لطف و دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ ان کا کلام سخافت و دنائت سے پاک ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر بات بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔۔ قیمت دو روپیہ۔

★ آپنے مستقبل کا فکر کیجیے

آپ آج جو اقدام اٹھائیں گے اُس کا اثر آپ کی آئندہ زندگی پر پڑے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ ساری عمر تھوڑی تنخواہ پر ایک بے ہنر مزدور کی حیثیت سے مشقت کرنا چاہتے ہیں۔ یا آپ کوئی دلچسپ ہنر سیکھ کر ایک کارگر کی مفید، کامیاب اور خوشحال زندگی پسند کرتے ہیں۔

اگر آپ نے میٹرک یا اس کے برابر کا کوئی امتحان پاس کر لیا ہے، یا میٹرک تک پڑھ چکے ہیں، تو آپ کوئی مفید ہنر سیکھ کر اپنے مستقبل کو شاندار بنا سکتے ہیں۔ ذیل میں چار ہنروں کا ذکر کیا جاتا ہے، جن کی جنگ کے بعد بڑی مانگ ہوگی۔ آپ ان میں سے ایک ہنر سیکھ کر جدید ہندوستان کی تعمیر میں حصہ لیجیے۔

- ★ ماہر استادوں کی زیر نگرانی آپ کی فنی تربیت مفت ہوگی
- ★ جس دن آپ داخل ہوں گے۔ اسی دن سے آپ کی آمدنی شروع ہو جائے گی۔
- ★ افواج ہند کے ساتھ کام کرنے سے آپ ملک کی خدمت بھی کریں گے اور اپنی فنی مہارت اور تجربے میں اضافہ بھی۔
- ★ جنگ کے بعد آپ ملکی صنعت گاہوں میں اچھی تنخواہ پر بطور کاریگر روزگار حاصل کر سکیں گے۔

تنخواہ	ٹریننگ کے دوران میں (بھرتی شدہ اُمیدواروں کے لئے)	ٹریننگ کے بعد (فوج میں تعینات ہونے پر)
اِنسٹرومنٹ میکینک	(ا) مبلغ ۵۹ - ۴ - ۰ ماہوار (ب) مبلغ ۴۴ - ۴ - ۰ ماہوار	مبلغ ۶۳ روپے سے ۹۴ روپے ۱۴ آنے ماہوار تک
ریڈیو میکینک	(ا) مبلغ ۵۹ - ۴ - ۰ ماہوار (ب) مبلغ ۴۴ - ۴ - ۰ ماہوار	مبلغ ۶۳ روپے سے ۹۴ روپے ۱۴ آنے ماہوار تک
ڈرافٹسمین	مبلغ ۶۳ روپیہ ماہوار	مبلغ ۷۰ روپے سے ۱۲۳ ماہوار تک
سرویئر	مبلغ ۶۳ روپیہ ماہوار	مبلغ ۷۰ روپے سے ۱۲۳ ماہوار تک

(ا) اگر بھرتی ہونے کے وقت عمر ۱۷½ سے ۳۰ سال کے درمیان ہو۔

(ب) اگر بھرتی ہونے کے وقت عمر ۱۷ سے ۱۷½ سال کے درمیان ہو۔ یہ تنخواہ ٹریننگ کے پہلے چھ مہینوں میں ملے گی اس کے بعد وہی جو (ا) کے لئے مقرر ہے۔

[illegible] ان غیر بھرتی شدہ اُمیدواروں کو جو میٹرک پاس ہوں ٹریننگ کے دوران میں [illegible] ۴۵ روپیہ ماہوار اور ان کو جو میٹرک پاس نہ ہوں مبلغ ۴۴ روپے سے ۶۲ روپے ماہوار تک وظیفہ ملے گا۔ تنخواہ کے علاوہ بھرتی شدہ اُمیدواروں کو خوراک مفت، رہنے کے لئے جگہ مفت، ڈاکٹری نگہداشت مفت حاصل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں وردی، کپڑے اور بہت سی دیگر رعایتیں دی جاتی ہیں۔

تعلیمی معیار ڈرافٹسمین اور سرویئر۔ عام طور پر اُمیدواروں کو میٹرک پاس ہونا چاہیے۔ اگر میٹرک پاس [illegible] تو اچھی تعلیمی لیاقت اور ان پیشوں کو سیکھنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

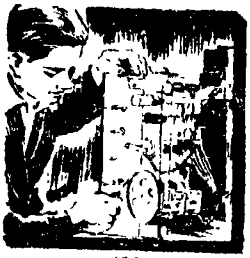
اِنسٹرومنٹ میکینک اور ریڈیو میکینک۔ اُمیدوار میٹرک پاس یا نویں، دسویں جماعت تک پڑھے ہوں اور میٹرکولیشن کے مقابلے کا فوجی امتحان پاس کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

عمر ڈرافٹسمین اور سرویئر۔ جو میٹرک پاس ہوں ۱۶½ سے ۳۰ سال تک۔
جو میٹرک پاس نہ ہوں ۱۷½ سے ۳۰ سال تک۔
انسٹرومنٹ میکینک اور ریڈیو میکینک ۱۷ سے ۳۰ سال تک

جسمانی صحت کا معیار - اُمیدوار مقررہ جسمانی معیاروں پر پورے اتریں۔ اور ہر لحاظ سے تندرست و توانا ہوں۔



انسٹرومنٹ میکینک



ریڈیو میکینک



ڈرافٹسمین



پراسپکٹس [illegible] پوری تفصیلات ہیں ابھی ان میں سے کسی پتے پر خط لکھ کر طلب کیجیے

پیراونشل پبلسٹی ورکر و ٹیکنیکل آفیسر

ٹیکنیکل ٹریننگ اسکیم

سول سکریٹریٹ لکھنؤ

ملنے کا پتہ — نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ اردو میں بھی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:

۱ ۔ چند گفتنی فلاسفۂ قدیم کی روایات کے ساتھ

۲ ۔ برہمن کا مذہب

۳ ۔ فطرت کے کرشمے

نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشتریت و کیفیات لئے ہوئے ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ ایڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولانا نیاز فتحپوری کی جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی دوسرا ایڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرتی و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ مہلک ہے۔ زبان و بلاغت و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔ مثلاً مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نصیر، ثاقب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جن کا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصہ اول للعہ حصہ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

پیش کش "نگار" کے خاص نمبر

دفتر نگار لکھنؤ

جنوری سنہ ۳۹ء

(مصحفی نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
حیات مصحفی - اردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ -
مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں
انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء

(نظیر نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
نظیر کا مسلک
شاعری پر تبصرہ
نظیر اور عوام
انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء

یہ نمبر دنیا کے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور اردو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے -

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء

اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ء میں شایع ہوا تھا

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء

اس نمبر میں نیاز فتحپوری نے مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی -

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرات اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۴۰۰ روپیہ	۲۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
نصف صفحہ	۲۰۰ روپیہ	۱۰۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۳۰ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۴۵ روپیہ	۱۵ روپیہ

جنوری سنہ ۴۴ء

(جدید شاعری نمبر)

اس میں بتایا گیا ہے کہ جدید رجحانات شعری کی کیا حقیقت ہے اور آزاد نظم نگاری کا وزن و قافیہ سے بے نیاز ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے

قیمت دو روپے علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء

(قرآن نمبر)

اس میں ڈاکٹر شبلی کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ

قیمت دو روپے

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ
ششماہی جاری نہیں ہو سکتا

سالانہ بیرون ہند دس روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں آسکتا -

"منیجر"

جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

—— کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات ——
—— اور قواعد طلب کیجئے - منیجر ——

رجسٹرڈ نمبر لے ۴۶۶

Oct 45

۔۔۔ ہے اور ہر فقرہ
۔۔۔ سفی کی معرکۃ الآرا تصنیف

۔۔۔ حتر انصاری ۔۔۔۔۔۔ للعہ

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸/عہ

۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸/عہ

۔۔۔ ات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸/ہے

قیمہ ۔ دگی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عہ

۔۔۔ ستانہ گوئی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸/عہ

ادارۂ ادبیات نو

۵۸ ٹمپل روڈ ـــ لاہور

تصانیف نیاز فتحپوری

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے [illegible] ادبی مقالات [illegible] ہیں جو پہلے [illegible] اس لئے قیمت بھی زیادہ ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں [illegible] ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد [illegible] کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت [illegible] روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشائے لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے مطبوعے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت [illegible] روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصہ اول

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصہ دوم

[illegible] زیادہ ضخیم ہے اور

ایک صفحہ [illegible] روپیہ [illegible] روپیہ [illegible]

[illegible]

دو صفحہ [illegible] روپیہ [illegible] روپیہ ۹۰ روپیہ ۳۰ روپیہ

چوتھائی [illegible] روپیہ ۹۰ روپیہ ۲۵ روپیہ ۱۵ روپیہ

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات

اور قواعد طلب کیجئے — مینجر

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے [illegible] زبان و تخیل اسکی نزاکت بیان [illegible] مضمون اور اس کی [illegible] اں کے درجہ تک [illegible] ابت صحیح اور [illegible]

[illegible] محصول

ترغیبات جنسی (یا)

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں شہوانی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ تنقیدی تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی کی ابتدا کیونکر اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

نیا اڈیشن

قیمت [illegible] علاوہ محصول

مجموعہ استفسار و جواب (۳ جلد)

ان تینوں جلدوں میں [illegible] سے یکر [illegible] تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں علمی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے

قیمت فی جلد تین روپیہ علاوہ محصول

علم و حکمت سیاست و اجتماع تاریخ و مذہب پر نادر تصنیفات

مولانا عبید اللہ سندھی، حالات، تعلیمات، سیاسی افکار۔ قیمت للعہ
شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک از مولانا عبید اللہ سندھی ۔۔
شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ۔۔۔ " "
خطبات مولانا عبید اللہ سندھی ۔۔ مرتبہ پروفیسر محمد سرور ۔۔
امام ربانی مجدد الف ثانی اور انکا نظریہ توحید ۔۔ از ڈاکٹر برہان الدین ۔۔
قرآنی دستور انقلاب ۔۔۔ از حضرت مولانا عبید اللہ سندھی ۔۔
چشمۂ کوثر } مسلمانان ہند کی علمی، مذہبی اور سیاسی تاریخ
رود کوثر } از محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس
مضامین ابوالکلام آزاد ۔ دو حصوں میں
مضامین البلاغ ۔۔۔ ابوالکلام آزاد
مقالات الہلال ۔ "
مضامین الہلال ۔۔۔ "
مسلمانوں کا ماضی، حال، مستقبل ۔ از میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں ۔۔۔
مقالات جمال الدین افغانی ۔۔
مضامین جمال الدین افغانی ۔۔
تعمیر ملت ۔۔ از محمد شریف چشتی ایم۔ اے
شخصیات ۔۔ از پروفیسر محمد سرور
فیصلہ ہندوستان ۔۔ ۔۔
اٹھارہ مہینے ہندوستان میں ۔۔ پنڈت جواہر لال نہرو ۔۔۔
ہمارے ہندوستانی مسلمان ۔۔ ڈبلیو ہنٹر
سرخ چین کا رہنما ۔۔ از اسرار احمد آزاد
سوشلزم ۔۔ مرتبہ عبداللطیف اعظمی
سوویٹ روس ۔۔ از محمد کلیم احمد
ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں ۔۔ ۔۔
اسلام کے سیاسی تصورات ۔۔
مارکس کی تعلیمات ۔
سوویٹ روس کی بالشویک پارٹی کی تاریخ ۔۔
افادات حضرت شاہ ولی اللہ
تقویۃ الایمان ۔۔ از شاہ اسمٰعیل شہید
تعلیم کا مسئلہ ۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین
تزک بابری ۔۔ ۔۔ تاریخ یونان
سلطنت روما ۔۔ ۔۔ انقلاب کی تاریخ
سیر افغانستان ۔۔ از سید سلیمان ندوی
تعارف قرآن خود قرآن کی زبانی
نگارشات محمد علی ۔ مرتبہ رئیس احمد جعفری
مقالات محمد علی مرحوم ۔۔
اسلام کیسے پھیلا ۔۔ از عبدالواحد سندھی
مقالات مولانا اسلم جیراجپوری ۔۔

سندھ ساگر اکادمی ـ چیمبرلین روڈ ـ لاہور

معیاری ادب

مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں } از عبداللطیف اعظمی بی۔ اے جامعہ } مولانا شبلی شاعر بھی تھے اور نقاد بھی، مورخ بھی تھے اور سیرت نگار بھی۔ معلم بھی تھے اور مصلح بھی۔ مگر شبلی کی ادبی حیثیت انکی ہمہ رنگ اور ہمہ گیر شخصیت کا سب سے اہم اور سب سے دلچسپ پہلو ہے اور یہی پیش نظر کتاب کا موضوع ہے۔ اس کتاب میں پہلی دفعہ مولانا کی شاعری اور ان کی ادبی حیثیت پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ان کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ کتاب مجلد مع گرد پوش قیمت ۔

انداز ے ۔ فراق گورکھپوری ۔ اردو ادب کی تنقید میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ شاعری انتقاد کے ہراتے ہوئے آئینہ میں اس کی شاعرانہ شخصیت اس کے مخصوص وجدان اور اسکی نفسیات کی جھلک نظر آئے گی ۔ قیمت

ننگا پانو ۔ از شیر محمد اختر۔ افسانے، شیر محمد اختر کی زندگی کی کئی تصویریں دکھا چکا ہے۔ اس نے سائے میں زندگی کو تلاش کیا۔ بادلوں میں زندگی کی نسل ڈھونڈ نکالی۔ بھنور میں سرگرداں زندگی کی جھلکیاں دکھائیں اور اب اس زندگی نے ننگا پانوں کا روپ دھارا ہے ۔ پاؤں کا جو ہوتا ہے چاندی سے بھی زیادہ سفید اسکا اندازہ آپ خود لگائیے ۔ قیمت عہ

کہا کہی ۔ ممتاز مفتی کے افسانوں کا مجموعہ

چھوٹی موٹی نگینوں ∴ لجائی ہوئی مستیوں
شام کے آنچل سے ∴ بادلوں کے دامن میں

دبی دبی انگلیوں کی سے قریوں کی آپ بیتیاں ۔ قیمت عا

نفسیات ۔ پروفیسر محمد سرور۔ شعر و ادب ۔ سیاست و اجتماع اور علم و حکمت کی چند نامور شخصیات کے نہایت دلچسپ مرقعے۔ مختصر مگر جامعیت لئے ہوئے۔ قیمت عہ

ارضی دیوتا ۔ سرزمین شام کے آتش نوا شاعر اور زندہ دل فلسفی ابل خلیل جبران ۔ جس کا ہر نقطہ ایک انگارہ ہے اور ہر فقرہ ایک نفسی تجزیہ۔ ارضی دیوتا اس مایۂ ناز فلسفی کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے ۔ قیمت عا

ایک ادبی ڈائری ۔ از اختر انصاری ۔۔۔ للعہ
اردو تنقید پر ایک نظر ۔۔۔
فن داستان گوئی ۔۔۔
نئے ادبی رجحانات ۔۔۔
ادب اور زندگی ۔۔۔
فن داستان گوئی ۔۔۔

ادارۂ ادبیات نو

۵۸ ٹمپل روڈ ـــ لاہور

تخلیق کار
مسٹر بھگوان راؤ

تاریخِ عرب کا وہ دور جب خدا کی اصلاح پر پہلی بار مجبور ہوا

نغمۂ صحرا

جاگیرتی پکچرز کی انسانیت نواز پیشکش

ماجرا
مسٹر ہربنس لال

پروڈیوسر　　**ضرور دیکھئے؟**　　مسٹر آنند برو منیم صاحب

(۱)	جب ہر حکمراں انسانیت کی بیخ کنی ہی کو **عروجِ** حیات متصور کر رہا تھا؟	حالات حاضرہ کا حقیقی ترجمان
(۲)	جب فلاحِ انسانیت کا [illegible] سے قطعی بند ہو چکا تھا؟	
(۳)	جب حرص و ہوس کی کند چھریاں مظلوم سانسوں کی معصوم روحوں کا نقاب [illegible] مدہوش ہو کر جھوم رہی تھیں	فلم **نغمۂ صحرا**
(نوٹ)	ادب، آرٹ اور موسیقیت سے لبریز یہ تصویر آپ کو غفلت دیرینہ سے بیدار کر دیگی	بہت جلد آپ کے شہر کی خوبصورت اسکرین پر جلوہ فرما ہونے والا ہے۔

ہدایات آرٹ — ماسٹر اچریکر صاحب

ہدایات عکاسی — مسٹر رام پرشاد راؤ، معاون مسٹر شنکر راؤ

ہدایات موسیقی — مسٹر سی رامچندر صاحب

ہدایات صدا بندی — مسٹر ڈی گاندھی صاحب

مکالمے و گانے — حضرت امین رضوی داناپوری صاحب

پبلسٹی — بنیاد

برائے معلومات: جاگیرتی پکچرز بمبئی ۱۴ سے خط و کتابت کیجئے

نگار

مدیر مسئول: نیاز فتحپوری

جلد ۴۸ — فہرست مضامین ماہ اکتوبر ۱۹۶۸ء — شمارہ ۴

ملاحظات

حیات شبلی اور ہندوستانی اکاڈمی جولائی کے نگار میں، ہندوستانی اکاڈمی [illegible] کرتے ہوئے اب اکاڈمی سے [illegible] "حیات شبلی" والنعام کا مستحق کیوں قرار دیا گیا جبکہ وہ شرائط انعام کو پورا نہ کرتی تھی۔

اس کا جواب اصولاً اکاڈمی کو دینا چاہئے تھا، لیکن یہ فرض سید سلیمان ندوی نے [illegible] نصاری نے پورا کیا ہے، چنانچہ ستمبر کے معارف میں بہ سلسلۂ شذرات، شاہ صاحب لکھتے ہیں :

"حیات شبلی انعامی مقابلہ میں سرے سے بھیجی ہی نہیں گئی تھی، مصنف اور تصنیف دونوں کی حیثیت اس سے بلند ہے، کہ اس کو مقابلہ میں بھیجا جاتا، اور نہ اس قسم کے انعاموں سے مصنف کے اعزاز میں کوئی اضافہ ہو سکتا ہے۔ خود ہندوستانی اکاڈمی نے اس کو خرید کر منگایا تھا، اتفاق سے اس زمانہ میں حضرت [illegible] تشریف [illegible] گئے تھے، ورنہ شاید وہ اس کو بھی گوارا نہ فرماتے، اکاڈمی نے ان کو انعامی کمیٹی کا ممبر [illegible] بنایا تھا لیکن [illegible] کی خرابی کی بنا پر اُس کو قبول نہیں کیا تھا، اور نہ انعامی کمیٹی کے کسی جلسہ میں شریک ہوئے، مدیر نگار نے اکاڈمی کے

نگار

مدیر اعلیٰ : نیاز فتحپوری

جلد ۴۸ — فہرست مضامین ماہ اکتوبر ۱۹۴۵ء — شمار ۴

ملاحظات

حیات شبلی اور ہندوستانی اکاڈیمی جولائی کے نگار میں، ہندوستانی اکاڈیمی کی ایک بے ضابطگی کا ذکر کرتے ہوئے ارباب اکاڈیمی سے دریافت کیا گیا تھا کہ "حیات شبلی" کو انعام کا مستحق کیوں قرار دیا گیا جبکہ وہ شرائط انعام کو پورا نہ کرتی تھی۔

اس کا جواب اصولاً اکاڈیمی کو دینا چاہئے تھا، لیکن یہ فرض سید سلیمان ندوی کے ایک شاگرد شاہ معین الدین احمد انصاری نے پورا کیا ہے، چنانچہ ستمبر کے معارف میں بہ سلسلۂ شذرات، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"حیات شبلی انعامی مقابلہ میں سرے سے بھیجی ہی نہیں گئی تھی، مصنف اور تصنیف دونوں کی حیثیت اس سے بلند ہے، کہ اس کو مقابلہ میں بھیجا جاتا، اور نہ اس قسم کے انعاموں سے مصنف کے اعزاز میں کوئی اضافہ ہو سکتا ہے۔ خود ہندوستانی اکاڈیمی نے اس کو خرید کر منگایا تھا، اتفاق سے اس زمانہ میں حضرۃ الاستاذ تشریف بھی نہیں رکھتے تھے، ورنہ شاید وہ اس کو بھی گوارا نہ فرماتے، اکاڈیمی نے ان کو انعامی کمیٹی کا ممبر ضرور بنایا تھا، لیکن انھوں نے صحت کی خرابی کی بنا پر اس کو قبول نہیں کیا تھا، اور نہ انعامی کمیٹی کے کسی جلسہ میں شریک ہوئے۔ مدیر نگار نے اکاڈیمی کے

اعلان کی نقل میں بھی تحریف سے کام لیا ہے، اس اعلان کے آخر میں یہ نوٹ بھی تھا، کہ اکاڈیمی موصولہ کتابوں پر انعام دینے کے لئے مجبور نہیں ہے، بلکہ اگر اس کی نگاہ میں کوئی دوسری کتاب انعام کی مستحق ہوگی، تو وہ اس کو خود منگا کر مقابلہ میں شریک کر سکتی ہے، مدیر نگار اس نوٹ کو اُڑا گئے۔

اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکاڈیمی نے حیات شبلی کو انعام کا مستحق قرار دیکر کوئی بے ضابطگی نہیں کی، حالانکہ خود اکاڈیمی کے اعلان کی رو سے یہ الزام پھر بھی قایم رہتا ہے۔

شاہ صاحب نے مجھ پر یہ الزام قایم کیا ہے کہ میں اعلان کے اُس نوٹ کو اُڑا گیا جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ "اکاڈیمی موصولہ کتابوں پر انعام دینے کے لئے مجبور نہیں ہے بلکہ اگر اس کی نگاہ میں کوئی دوسری کتاب انعام کی مستحق ہوگی تو اس کو خود منگا کر مقابلہ میں شریک کر سکتی ہے"۔ لیکن وہ اس اعلان کا آخری فقرہ خود بھی اُڑا گئے جس میں اس شرط کو ضروری قرار دیا گیا ہے کہ "وہ کتاب معینہ مدت میں شایع ہوئی ہو"۔

مانا کہ "حیات شبلی" انعامی مقابلہ کے لئے نہیں بھیجی گئی اور بقول شاہ صاحب یہ بھی مسلّم کہ مصنف (سید سلیمان ندوی) اور تصنیف دونوں کی حیثیت اس سے بلند تھی کہ اس کو مقابلہ میں بھیجا جاتا (گو اس انعام کے قبول کرنے کے وقت سید سلیمان ندوی کی حیثیت اتنی بلند نہ رہی تھی)، لیکن باوجود اس کے بے ضابطگی کے الزام سے ارباب اکاڈیمی بری نہیں ہو سکتے، کیونکہ کتاب خواہ مصنف کی طرف سے بھیجی گئی ہو یا خود اکاڈیمی نے اسے طلب کیا ہو دونوں صورتوں میں انعام کے لئے یہ شرط ضروری قرار دی گئی تھی کہ وہ کتاب یکم اکتوبر ۳۵ء اور ۳۱ر مارچ ۴۳ء کے درمیان کسی وقت شایع ہوئی ہو (ملاحظہ ہو اعلان کی دفعہ نمبر ۱ و دفعہ ۴ (ج)) اور اس امر کا ثبوت کہ حیات شبلی اس شرط کو پورا نہیں کرتی خود معارف کے صفحات میں مل سکتا ہے۔

فروری ۴۳ء کے معارف میں حیات شبلی کے متعلق اعلان کیا جاتا ہے کہ "ساڑھے پانچسو صفحوں تک چھپ چکی ہے، آیندہ تین سو صفحے باقی ہیں، کوشش ہو رہی ہے کہ اپریل تک چھپ جائے"۔ اس کے پورے نو مہینے کے بعد نومبر ۴۳ء کے معارف میں یہ اطلاع شایع ہوتی ہے کہ "حیات شبلی" چھپ کر طیار ہو گئی ہے" اور پھر دسمبر ۴۳ء میں آخری اعلان اس کی اشاعت کے متعلق ان الفاظ میں نظر آتا ہے کہ "انشاء اللہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں کتاب شایع ہو جائے گی"۔

ان تمام تحریروں سے ثابت ہے کہ حیات شبلی اکاڈیمی کی معین کردہ مدت کے دس ماہ بعد شایع ہوئی اور اُصولاً اسے انعامی کتب میں شامل نہ ہونا چاہئے تھا۔

اب رہا اکاڈیمی کا ایک خارج از میعاد کتاب کو خود قیمتاً حاصل کرکے انعام کا مستحق قرار دینا، سو یہ اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے اور اکاڈیمی کی بے ضابطگی کو بہت زیادہ مکروہ بنا دینے والا!

اس کتاب کی قیمت آٹھ روپیہ (علاوہ محصول) ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے آٹھ نسخے اکاڈیمی نے کافی رقم خرچ کرنے کے بعد حاصل کئے ہوں گے۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اکتوبر تک اور کتابیں دفتر میں پہونچ گئی تھیں تو جنوری تک کیوں انھیں دفتر میں ڈال رکھا اور ایک میعاد سے باہر شایع ہونے والی کتاب کا

کیوں انتظار کیا گیا۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جو کتابیں انعامی مقابلہ کے لئے موصول ہوئی تھیں ان کو انعامی کمیٹی کے تمام ممبران کے پاس بھیجا بھی نہیں گیا اور اس کمیٹی کی سفارش حاصل کئے بغیر مجلس عالمہ نے حیات شبلی کے حق میں فیصلہ کر کے انعام کی رقم سید سلیمان ندوی کو دیدی جس کو انھوں نے (باوجود اس کے کہ ان کی حیثیت اس قسم کے انعامی مقابلوں کی شرکت سے بہت بلند ہے) غالباً محض اس لئے قبول کر لیا کہ " دل دوستاں آزردن جہل ست دکفارۂ یمین سہل"

شیوہ و انداز اینان رانگر !

شاہ صاحب نے اپنے اُستاذ محترم کی بلند حیثیت کے اظہار میں جو کچھ فرمایا ہے اور اکاڈیمی کی حمایت میں جو " دلایل قاطعہ و براہین ساطعہ" پیش کئے ہیں ان کی داد ہم صرف ان الفاظ میں دے سکتے ہیں کہ:

گرچہ خوش گفتی، نہ گفتن ہم خوش ست !

اس سلسلہ میں مجھے ایک بات اور عرض کرنا ہے، وہ یہ کہ "حیات شبلی" پر جو تبصرہ جون کے نگار میں شایع ہوا ہے وہ میرا نہیں ہے اور نہ میں نے اب تک اس کتاب کو دیکھا ہے بلکہ یہ اعظم گڈھ ہی کے ایک صاحب عبدالوحید خاں کا لکھا ہوا ہے جو اقبال سہیل کے عزیز ترین شاگرد ہیں اور جن کا نام بھی مضمون کے اخیر میں درج ہے، حیرت ہے کہ شاہ صاحب نے اسے میری طرف منسوب کرنے کی جسارت کیونکر کی۔

شاہ صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے اخیر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ "اگر حیات شبلی کے انعام پر مجھے رشک و حسد ہے تو میرے لئے بھی اکاڈیمی کا دروازہ کھلا ہوا ہے، آیندہ میں بھی اپنی کوئی تصنیف پیش کر کے انعام حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا" اس کے متعلق میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سید سلیمان کی طرح میں بھی اپنی حیثیت کو اس سے بلند سمجھتا ہوں کہ انعامی مقابلوں میں شرکت کروں، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ آخر میں انعام قبول کر لینے والی پست سطح پر اُتر آتے ہیں اور میں باینہمہ جہل و بے مایگی اس ادنیٰ سطح پر آنا کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔

دُنیا کا سیاسی مستقبل جنگ ختم ہو چکی، لیکن امن و سکون بدستور مفقود ہے، توپوں کی گرج سنائی نہیں دیتی لیکن زمین اب بھی دہل رہی ہے اور پچھلی جنگ کے بعد دنیا جن اوہام و شکوک میں مبتلا ہوئی تھی، ان سے کہیں زیادہ غیر متقین حالت اسوقت پائی جاتی ہے۔

یہ جنگ گویا کرۂ زمین کی میعادی تپ تھی نہایت سخت قسم کے بحران و ہذیان کی اور اس تپ کی میعاد ختم ہونے کے بعد دنیا پر وہ ضعف و نقاہت طاری ہے کہ اگر پرہیز میں ذرا بھی بے احتیاطی ہوگئی تو تپ کا استرداد لازمی ہے، خواہ اس کا نتیجہ موت و ہلاکت ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے ہم کو جنگ کے اختتام پر اسوقت تک خوش نہ ہونا چاہئے، جب تک یہ دور تہذیب ختم نہ ہو جائے اور اس آگ کو اسوقت تک بجھا ہوا نہ سمجھنا چاہئے، جب تک خاکستر میں ایک چنگاری بھی باقی ہے۔

جرمنی، جو مغرب کے نظام تمدن کا محور و مرکز تھا بالکل تباہ ہو چکا ہے اور اس حد تک کہ جنگ سی سالہ کے بعد سے اس وقت تک کوئی ملک ایسا تباہ نہیں ہوا، اور فاتح اقوام اگر انتہائی رعایت سے کام لیں، تو بھی وہ ایک زمانۂ طویل تک اپنی کھوئی ہوئی آزاد سیاست کو واپس نہیں لا سکتا۔ لیکن کیا یہ بات واقعی ہمیں مستقبل کے امن و سکون کا یقین

دلانے والی ہے، اور کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ زخم اطراف میں سمیت کئے بغیر، جلد بھر جائے گا؟
کسی خاص حصۂ زمین کی فضا گرم ہو کر جب ہوا اوپر کی طرف بڑھتی ہے تو چاروں طرف کی ہوا نہایت تیزی سے اس خلا کو پُر کرنے لگتی ہے، جس سے فضا میں طغیانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور اسی کو ہم آندھی کہتے ہیں۔ بالکل یہی حال اسوقت کی سیاسی فضا کا ہے، کیونکہ جرمنی کی تباہی سے جو خلا یوروپ کی فضائے سیاست میں پیدا ہوگیا ہے، اس کو پُر کرنے کے لئے مختلف سیاستیں مضطربانہ دوڑ پڑی ہیں اور دنیا اک سیاسی طوفان میں مبتلا نظر آتی ہے۔

اس وقت دنیا میں صرف تین آوازیں (برطانیہ، امریکہ اور روس کی) ہمارے کانوں میں آرہی ہیں جو بظاہر ہم آہنگ معلوم ہوتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بلند ہوجانے کی کوشش کررہی ہے اور بالکل ممکن ہے کہ آخر میں یہی کوشش "نفخ صور" ثابت ہو۔
روس کو جرمنی کی شکست سے جو اقتدار یوروپ میں حاصل ہوگیا ہے وہی امریکہ و برطانیہ کے لئے کیا کم باعث تشویش تھا کہ اب وہ بحر روم کے بعض ساحلی مقامات پر بھی اپنے لئے جگہ پیدا کررہا ہے اور مشرق بعید میں بھی اس کے اثرات وسیع ہوتے جارہے ہیں، امریکہ اس میں شک نہیں کہ مشرق بعید اور بحر الکاہل میں اب کسی اور کا اثر قایم ہونا گوارا نہیں کرسکتا اور نہ برطانیہ بحر روم کے اقتدار میں کسی اور کو اپنا شریک دیکھنا پسند کرسکتا ہے۔ لیکن زمانہ کی ہوا روس کا ساتھ دے رہی ہے اور اسی لئے لندن اور امریکہ کے بعض اخبار کہہ رہے ہیں کہ ہم کو "تیسری جنگ" کی طیاریاں ابھی سے شروع کردینا چاہئے۔ الغرض دُنیا ابھی خطرہ سے باہر نہیں ہوئی ہے اور اگر یوروپ کے متمدن حکومتوں کی "جوع الارض" اور محکوم قوموں کو بدستور محکوم رکھنے کی جابرانہ پالیسی اب بھی بدستور قایم رہی تو روس کے اثرات کا وسیع ہونا اور آخر میں ڈماکریسی اور اشتراکیت کا متصادم ہونا بالکل یقینی ہے۔

پیدائشی غلام

زندگی کا مقصد بنی نوع انسان کی بے لوث خدمت ہے لیکن آپ کے ملک میں لاکھوں نوجوان زندگیاں سسک سسک کر دم توڑ رہی ہیں اور آپ قومی و ملکی فرائض سے بے خبر ہوکر زندگی کی توہین کررہے ہیں، یقین جانئے یہ زندگی، یہ مسرت جسے آپ اپنی کہکر پکارتے ہیں، آپ کی نہیں یہ کسی اور کی ملکیت ہے، کسی اور کی امانت ہے، یہ جس کی ملکیت ہے، جس کی امانت ہے، اسکو دیدیجئے تاکہ آپ پر سے غلامی کا یہ ٹیکہ دور ہوکر دنیا پر ثابت ہوجائے کہ آپ کے کاندھے بھی بارِ فرض اُٹھانے کی ہمت رکھتے ہیں اور ابھی آپ کی رگوں میں وہ خون موجود ہے جو انسانیت کے حقیقی فرض کی ادائگی میں ہر آنے والی مصیبت کا خاتمہ کرسکتا ہے، اُٹھئے اور ان زنگ آلود بیڑیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ملک کو فلاکت سے نجات دلائیے۔ اس سلسلہ میں پہلے آپ فلمی دُنیا کے اس واحد ادارہ کو جو جاگیرتی ملیجرز کے نام سے ملک کی سچی خیرخواہی میں سب سے اول ہے اس کی آنے والی تصویر "دو قسمت" ضرور دیکھ لیجئے تاکہ آپ کو منزل مقصود پر پہونچنے میں سہولت ہوجائے۔

عورت اور اسلام

قرآن کا دعویٰ ہے کہ میں دنیا میں خدا کا آخری اور مکمل ترین پیغام ہوں۔ میں تمام پہلی شریعتوں کا ناسخ ہوں اور اب میرے بعد کوئی اور شریعت نازل نہیں ہوگی اور اس پر دلیل یہ دی کہ "فیہا کتبٌ قیمہ" یعنی پہلی شریعتوں کی تمام اچھی اور قایم رہنے والی اور مستقل تعلیم جو عالمگیر صداقتوں اور اُصولوں کی حامل تھی وہ قرآن میں شامل کرلی گئی ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں کی بلکہ اس دعوے کو اس تحدی کے ساتھ دوہرایا ہے:

"ما ننسخ من آیتہٍ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا" (۲:۱۰۶) — (ہم کوئی شریعت یا وحی منسوخ نہیں کرتے یا لوگوں کے دل سے اسے فراموش یا محو نہیں ہونے دیتے جب تک اس سے بہتر یا کم ازکم اسی جیسی دوسری شریعت اس کی جگہ نہیں لے آتے)

ہم اس دعوے کی صداقت ان احکام کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں جو عورتوں سے متعلق ہیں۔ یوں تو جیسا کہ قرآن نے اعلان کیا ہے "لکل امتہٍ رسولٌ" (۱۰: ۴۷) ہر ایک قوم کی ہدایت کے لئے ایک حامل شریعت رسول مبعوث ہوا ہے لیکن آج ہمارے زمانے میں قرآن کے علاوہ تین اور مذاہب اور ان کی کتابیں نسبتاً زیادہ مشہور ہیں۔ ہندو دھرم اور وید۔ یہودیت اور تورات۔ نصرانیت یا عیسائیت اور انجیل ان کے علاوہ اور جتنی کتابیں ہیں یا تو وہ چنداں اہم نہیں یا پھر ان میں ہمارے موضوع سے متعلق کچھ زیادہ مواد موجود نہیں۔ اس لئے ہم تفصیلی بحث کے لئے انہی تین پر اکتفا کرینگے

(۲)

ہندو دھرم میں عورت کا درجہ

ہندو دھرم میں اس وقت تک کسی شخص کی نجات ممکن نہیں جب تک اسکی وفات کے بعد اس کا بیٹا چند مخصوص رسمیں نہ ادا کرے۔ اگر کسی کے اپنا صلبی بیٹا نہ ہو تو اسے اجازت ہے کہ وہ نیوگ کے ذریعے بیٹا حاصل کرے۔ اگر وہ اپنی زندگی میں ایسا نہ کرسکے تو اس کی وفات کے بعد اس کی بیوہ اسی ذریعے سے اپنے متوفی خاوند کے لئے بیٹا پیدا کرے جو ضروری رسوم پوری کرے گا اور یوں اس کی نجات میں معاون ہوگا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ویدک دھرم میں روحانی پہلو سے لڑکی، لڑکے کے برابر نہیں یا کم ازکم وہ والدین کو حیات بعد الموت میں نجات اور موکش نہیں دلاسکتی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں میں لڑکے کو لڑکی پر ترجیح دی جانے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ ویدوں میں اولادِ نرینہ کے حصول کے لئے تو دعائیں ملتی ہیں لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ اے ایشور مجھے لڑکی عطا کر۔ اس کے برعکس یہ ملتا ہے کہ اگر کوئی شخص قربانی کی گھاس اِدھر اُدھر چاروں طرف بکھیر دے تو اس کے ہاں بیٹی پیدا نہیں ہوگی[1]

---

[1] تیتریہ یجروید (۱:۱:۶:۴)

توراۃ میں عورت کا مقام

یہودیت اور عیسائیت اس معاملے میں بہت حد تک خاموش ہیں اور انھوں نے صراحت سے کچھ نہیں لکھا۔ البتہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے لڑکی کی پیدائش چنداں باعث فخر نہیں تھی۔ جب حضرت یعقوب کی بیوی راخل دردِ زہ میں مبتلا تھی تو دائی نے اس سے کہا "ڈر مت! اب کے بھی تیرے بیٹا ہی ہوگا"[1]۔ لڑکی کی پیدائش پر یہ ڈر بے وجہ نہیں ہو سکتا۔ اسکے آثار ہمیں حضرت موسیٰ کے زمانہ کے بعد بھی ملتے ہیں۔ افرائیمی القانہ کا اپنی بانجھ بیوی حنہ سے کہنا "کیا میں تیرے لئے دس بیٹوں سے بڑھ کر نہیں؟" اور حنہ غریب کا زار زار روتے ہوئے خداوند سے دُعا مانگنا کہ "اے رب الافواج! اگر تو اپنی لونڈی کی مصیبت پر نظر کرے اور مجھے یاد فرمائے اور اپنی لونڈی کو فراموش نہ کرے اور اپنی لونڈی کو فرزند نرینہ بخشے تو میں اسے زندگی بھر کے لئے خداوند کی نذر کر دوں گی"[2] بتاتا ہے کہ بانجھ پن کا داغ مٹانے کے لئے محض لڑکی کی پیدائش کافی نہیں تھی بلکہ اصل ضرورت لڑکے کی تھی تاکہ وہ اپنی سوت اور قبیلے کی دوسری عورتوں کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔

لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی شریعت میں بھی لڑکا لڑکی سے بہتر ہے یا دوسرے لفظوں میں لڑکی، لڑکے سے ناپاک تر ہے کیونکہ حکم دیا ہے کہ اگر کسی عورت کے لڑکا پیدا ہو تو وہ سات دن تک ناپاک رہے گی جو حیض کے ایام کا قانون ہے اور آٹھویں دن لڑکے کا یہودی شریعت کے مطابق ختنہ ہوگا اور اس کے بعد تینتیس دن تک وہ طہارت کے خون میں رہے۔ جب تک یہ طہارت کے ایام پورے نہ ہوں وہ کسی مقدس چیز کو چھوئے نہ مقدس میں داخل ہو۔ اس کے بالمقابل اگر اس کے لڑکی ہو تو وہ دو ہفتے ناپاک رہے گی اور اس کے بعد چھیاسٹھ دن تک طہارت کے خون میں رہے گی[3]۔ گویا لڑکی کی صورت میں میعاد دگنی ہے۔

قرآن میں ذکر ہے[4] کہ حضرت مریم کی والدہ نے نذر مانی تھی کہ میں اس حمل سے پیدا شدہ بچے کو ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کر دوں گی۔ جب ان کے مریم پیدا ہوئیں تو انھوں نے کہا کہ یا خدا! یہ تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے تو خدا نے کہا کہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ لڑکی لڑکے سے بہتر ہے۔ حضرت مریم کی والدہ کا یہ قول بہرحال یہی ظاہر کرتا ہے کہ دینی پہلو سے لڑکی کو لڑکے سے فروتر سمجھا جاتا تھا۔

موسوی شریعت میں عورت کی عام حیثیت کیا تھی یہ غالباً ایک اور مقام سے بھی واضح ہوتی ہے۔ دَہ احکامِ موسیٰ میں سے دسویں حکم[5] میں "پڑوسی کی بیوی۔ اس کے گھر اور کھیت اور غلام اور لونڈی اور بیل اور گدھے" سب کا ذکر ایک سانس میں کر دیا ہے۔

اسلام اور عورت

اسلام نے پوری صراحت سے یہ اعلان کر دیا کہ لڑکے اور لڑکی میں کوئی فرق نہیں سب مخلوق اسی ایک اللہ کی ہے جو کسی کو محض لڑکیاں عطا فرماتا ہے تو کسی کو لڑکے اور کسی کو لڑکے اور لڑکیاں دونوں[6]۔ نہ لڑکے کو لڑکی پر کوئی فضیلت حاصل ہے نہ لڑکے کے والدین کو لڑکی کے والدین پر۔

---

[1] پیدائش (۳۵ : ۱۷) [2] سیموئیل الاول (۱ : ۸ - ۱۱) — [3] احبار (۱۲ : ۲ - ۶) — [4] آل عمران ۳ : ۳۶ - [5] استثناء (۵ : ۲۱) — [6] الشوریٰ ۴۲ : ۴۹ - ۵۰)

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی مرد اور عورت میں کوئی تفاوت نہیں۔ بحیثیت مخلوق دونوں کا درجہ مساوی ہے۔ فرق اعمال سے ہے" جو کوئی اچھے عمل کرے گا مرد ہو یا عورت اور اس کا ایمان درست ہے تو اسکے لئے اس دُنیا میں بھی حیاتِ طیبہ ہے اور آخرت میں اعمال کا نیک اجر بھی"[۱] اصل بنیاد اعمال میں جنس نہیں، روحانیت یا مغفرت یا نیک اجر مرد سے مخصوص نہیں۔ اگر عورت بھی ایمان صحیح اور اعمال صالحہ رکھتی ہے تو بعینہٖ وہی انعام اسے ملے گا جو مرد کو حاصل ہوگا اور جو بھی برے عمل کرے گا اسے اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔[۲]

پس اول تو سرے سے اس عقیدے ہی کی تردید کردی کہ کسی شخص کو محض چند باتوں کا زبانی اقرار کرلینے یا ان پر ذہنی ایمان لے آنے یا بصورتِ دیگر چند رسوم ادا کردینے سے نجات مل سکتی ہے یا کوئی اور روحانی ترقی کا سامان میسر آسکتا ہے۔ بلکہ صاف کہہ دیا کہ ایمان عمل کے بغیر نامکمل ہے اور ان دونوں کے جمع ہونے کے بعد ہی خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ دوسرے اس کے ساتھ اس بات کا بھی فیصلہ کردیا کہ روحانی پہلو سے مرد کو عورت پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے نیز فرمایا کہ قیامت کو جب انسانی اعمال میزان میں ہوں گے تو نہ بھائی بھائی کی مدد کرسکے گا، نہ ماں باپ اولاد کا بوجھ اُٹھا سکیں گے اور نہ بیوی بچے ہی کسی شخص کے کام آئیں گے۔ اس دن ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا اور محض اس کے اپنے اعمال کی بنا پر ہی اس کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔[۳]

ظاہر ہے کہ جب نجات کا انحصار ہر ایک انسان کے ذاتی اعمال پر ہے تو اس کے لئے لڑکے کی خواہش کرنا یا لڑکی پر لڑکے کو ترجیح دینا غیر ضروری ہوگیا۔ اس کی نظر میں دونوں یکساں ہیں لڑکا بھی خدا کی نعمت اور لڑکی بھی۔ اصل خواہش یہ ہونا چاہئے کہ خدا "ذریات طیبہ" عطا فرمائے جو صالح اور اس کی نعمتوں کی وارث ہو۔

(۳)

تعلیم نسواں

جہاں تک تعلیم نسواں کا تعلق ہے ہندوؤں کے ہاں لازم ہے کہ عورت مذہبی تعلیم حاصل کرے کیونکہ ہون اور یگیہ کے موقع پر اسے اپنے خاوند کے ساتھ بیٹھ کر وید کے منتروں کی تلاوت کرنا پڑتی ہے۔[۴] ظاہر ہے کہ جب تک اسے مناسب تعلیم نہ دی جائے گی وہ اس فرض سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ویدوں میں متعدد ایسے رشیوں کے نام ہیں جو عورتیں تھیں۔ اُپ نشدوں میں بعض عورتوں کا مردوں کے ساتھ علمی اور مذہبی مسایل پر مناظروں تک کا ذکر ہے جو اعلیٰ تعلیم کے بغیر ناممکن ہے۔

تورات اور انجیل دونوں اس مضمون پر بالکل خاموش ہیں۔

قرآن نے اولاد کی تعلیم پر خاص توجہ دی بلکہ یہاں تک اصرار کیا کہ جہالت کو گناہ کی بنیاد قرار دیا۔[۵] قرآن ان والدین کو بیوقوف کہتا ہے جو اپنی اولاد کو بے علم رکھتے ہیں۔[۶] اس کے نزدیک اولاد کو بے علم رکھنا انھیں قتل کردینے کے مترادف ہے۔[۷] اس لئے اس نے ہدایت کی کہ اولاد کی تربیت اچھی ہونا چاہئے۔ "قولِ معروف" سے ان کی تعلیم ہو اور وقتاً فوقتاً

۱؎ النحل ۱۶ = ۹۷ - نیز الغافر ۴۰ = ۴۰ - ۲؎ الاحزاب ۳۳ = ۳۵ - ۳۶ - نیز النساء ۴ = ۱۲۲ - ۱۲۴ - ۳؎ رگ وید (۱ = ۲۸ ، ۳) ، (۱ = ۱۳۱ - ۳) وغیرہ - ۴؎ النحل ۱۶ = ۱۱۹ نیز الانعام ۶ = ۵۴ - ۵؎ الانعام ۶ = ۱۴۰ - ۶؎ الانعام ۶ = ۱۵۱ - ۷؎ النساء ۴ = ۵ - ۶ -

ان کا امتحان ہوتا رہے جس سے معلوم ہو کہ انھوں نے کس قدر ترقی کی ہے اور یہ سلسلہ ان کے بلوغ تک جاری رہے[1]

(۴)

ویدک بیاہ ویدوں کی تعلیم کے مطابق نکاح کی عمر بلوغ کے بعد ہے اور وید میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر ہے[2] بہتر ہے اگر خاوند کی عمر لڑکی کی عمر سے زیادہ ہو۔ نیز اگر لڑکا اپنی تعلیم ختم کر لینے کے بعد شادی کرے لیکن یہ فرض نہیں کہ سب حالتوں میں ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے۔ یہ محض سفارش ہے۔

ہندوؤں میں نکاح ولی کے بغیر نہیں ہوتا۔ قدرتاً اصل ولی باپ ہے[3]۔ باپ کی عدم موجودگی میں بھائی اور اگر دونوں میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو تو حکومت[4] (برادری یا پنچ) لیکن اس میں نقص یہ تھا کہ اگر ولی کسی ذاتی غرض سے لڑکی کے نکاح کے معاملے میں تغافل برتتے تو کیا ہو۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے بعد کے مقننوں نے فیصلہ کیا کہ اگر لڑکی کے بالغ ہو جانے کے بعد اس ولی کے نکاح کی کوشش نہ کرے تو لڑکی کو حق حاصل ہے کہ وہ حکومت کی منظوری سے اپنی پسند کا نکاح کرلے[5]۔ اس صورت میں ولی کا حقِ ولایت سلب ہو جائے گا۔ لیکن لڑکی کے جسم پر جو زیور ہے وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔ یہ اسے ولی کو واپس کرنا ہوگا[6]۔ پہلے بڑے لڑکے یا لڑکی کا نکاح ہونا چاہیئے۔ بڑی اولاد بن بیاہی موجود ہو تو اس صورت میں چھوٹی کا نکاح جرم ہے جس کے لئے سزا بھگتنا پڑے گی[7]۔

ہندو دھرم میں نکاح کی اقسام ہندوؤں کے ہاں نکاح کی مختلف شکلیں اور لمبی چوڑی رسمیں ہیں۔ منو نے آٹھ قسم کے نکاحوں کا ذکر کیا ہے لیکن ان سب کی بنیاد ویدوں میں موجود ہے۔

۱۔ برہم ۔ جب لڑکی کا نکاح ولی کی موجودگی میں ہو اور جہیز میں ہر طرح کی ملبوسات اور زیور ہوں اور شادی کی رسمیں ویدی پر ادا کی جائیں (رگ وید ۔ (۱۰ = ۱۷ = ۱) نیز (۱۰ = ۳۹ = ۱۴) وغیرہ)

۲۔ آسر ۔ جب ولی دولہا سے کچھ رقم نقد یا تحایف وغیرہ لے کر لڑکی کو نکاح میں دے دے (رگ وید ۔ (۱۰ = ۲۷ = ۱۲)، (۱۰ = ۸۵ = ۳۱)

۳۔ آرش ۔ جب نکاح دو گایوں کے ساتھ ہو (رگ وید ۱۰ = ۸۵ = ۱۳)

---

[1] النساء ۴ = ۵-۶ ۔ [2] رگ وید (۱۰ = ۳۹ = ۳)، (۱۰ = ۸۵ = ۲۱) وغیرہ ۔ [3] ایضاً (۱۰ = ۸۵ = ۹) ۔ [4] ایضاً (۸ = ۱ = ۶) و (۱ = ۱۳۴ = ۷) نیز منوسمرتی (۵ = ۱۵۱) ۔ [5] منو اور بودھاین اور بششٹ کی رائے ہے کہ لڑکی بلوغ کے بعد تین برس تک انتظار کرے ۔ گوتم پہلے ایام ماہواری کے تین ماہ بعد یہ حق لڑکی کو دیتا ہے ۔ [6] منوسمرتی (۱۰ = ۹۰ - ۹۲) ۔ [7] اتھروید (۴ = ۱۱۲) ۔ حضرت موسیٰ سے پہلے جو شریعت نافذ تھی اس کا قانون بھی یہی تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یعقوب نے راخل سے نکاح کرنے کے لئے اس کے باپ لابن کی سات برس تک خدمت کی لیکن میعاد پوری ہو جانے کے بعد لابن نے ان کا نکاح لیاہ سے کر دیا جو راخل سے بڑی تھی ۔ جب حضرت یعقوب نے اس پر شکایت کی تو لابن نے جواب دیا کہ ہم پہلوٹی سے پہلے چھوٹی کو نہیں بیاہتے اس پر انھیں راخل سے نکاح کرنے کے لئے مزید سات برس خدمت کرنا پڑی (کتاب پیدائش باب ۲۹)

۴ - راکشس - جب لڑکی کے والد کی مخالفت کے باوجود دولہا زبردستی لڑکی کو اغوا کرکے لیجائے (رگ وید-۱۰=۹۳۴)

۵ - پیشاچ - جب نکاح جادو ٹونے کا نتیجہ ہو (رگ وید- ۷ = ۵۵ = ۵ - ۸ نیز اتھرووید میں اس موضوع پر متعدد منتر ہیں)

۶ - گندھرب - جب نکاح عشق و محبت کا نتیجہ ہو (رگ وید - ۱۰ = ۲۷ = ۱۲ - اتھرووید - ۱۱ = ۸ = ۱)

۷ - سویمبر - جہاں لڑکی خود اپنے شوہر کا انتخاب کرے (رگ وید - ۸ = ۱۱۶ = ۱ نیز ۱۰ = ۸۵ = ۹)

رسوم کا بیان طوالت سے خالی نہ ہوگا۔ ان کی ایک لمبی فہرست ہے اور یہ لڑکے اور لڑکی دونوں کے گھروں پر ادا کی جاتی ہیں[۲]

محرّمات وید میں محرمات نکاح صرف دو ہیں - بہن[۳] اور بیٹی[۳]۔ ماں کا ذکر صراحت سے غالباً اس لئے نہیں کیا کہ وہ بہرحال حرام ہوگی۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مندرجہ صدر اقسامِ نکاح میں ابتدائی زمانے سے لیکر متمدن زمانے تک کی تمام شکلوں کا بیان ہے - چوتھی اور پانچویں قسم یعنی پیشاچ اور راکشس جیسا کہ ان کے ناموں ہی سے ظاہر ہے نہایت قدیم زمانے سے تعلق رکھتی ہیں - پہلی اور ساتویں اور آٹھویں آخری سے اور بقیہ درمیانی زمانے سے - لیکن وید کا ان سب قسموں کی متمدن سماج میں اجازت دے دینا باعثِ حیرت ہے - گویا اغوا اور نکاح میں کوئی تمیز ہی نہیں رکھی اسی طرح آسر نکاح کسی طرح دختر فروشی سے کم نہیں۔

ویدوں کا زمانہ ویدوں کا زمانہ متعین کرنا بہت مشکل ہے - غالی ہندؤں کے نزدیک تو وہ آغاز آفرینش میں نازل ہوئے - لیکن یہ ثابت کرنا محال ہے - مختلف محققوں اور عالموں نے مختلف زمانوں کے دلایل مہیا کئے ہیں - جن میں سے بعض مثلاً تلک اور جیکوبی انھیں چار سے پانچ ہزار سال قبل مسیح تک کی تصنیف بتاتے ہیں اور دوسرے مثلاً میکس موئر وغیرہ صرف ڈیڑھ دو ہزار برس قبل مسیح کی - صداقت خواہ کچھ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اگرچہ وہ کتابی صورت میں مدون بہت دیر سے ہوئے ہیں تاہم ان کا زمانہ تصنیف یا الہام بہت قدیم ہے یعنی وہ زمانہ جب سماج ابھی نہایت ابتدائی حالت میں تھی اور جب تکلفات بہت کم تھے - یہی سبب ہے کہ ہم ان مجموعوں میں بعض ایسے قوانین اور رواج بھی موجود پاتے ہیں جو آج صرف نہایت پست اور غیر مہذب اقوام عالم میں ملتے ہیں۔

ابتدا میں انسان کو نسل کشی کے لئے لازماً اپنی بہن سے نکاح کرنا پڑا ہوگا یا بیٹی سے اور جب آبادی بڑھی اور عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو محرمات میں سب سے پہلے یہی دونوں نزدیک ترین رشتے شمار کئے گئے ہوں گے۔ وید کا صرف انہی دو رشتوں کو محرمات میں گننا بھی ان کی قدامت کی دلیل ہے۔

۱؎ منوسمرتی (۳ = ۲۰ - ۳۴) - ۲؎ ان رسوم کا مفصل بیان سوامی دیانند سرسوتی کی کتاب "سنسکار ودھی" میں موجود ہے

۳؎ رگ وید (۱۰ = ۱۰۲) نیز (۱۰ = ۱۶۲ - ۵)

رسوم نکاح رسوم کی زیادتی بھی قدامت کا طرۂ امتیاز ہے ۔ یہ قدیم مذاہب کا خاصہ ہے کہ ان میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اس وقت تک مکمل اور قانونی حیثیت سے قابلِ تسلیم نہیں جب تک اس کے ساتھ مذہبی اور نیم مذہبی رسموں کا ایک لمبا سلسلہ نہ ہو ۔ ویدک دھرم ۔ زردشتی مذہب یہودیت غرضکہ کوئی پرانا مذہب اس سے مستثنیٰ نہیں ۔ وجہ ظاہر ہے ۔ سماج منظم نہیں تھی ۔ کوئی باقاعدہ حکومت یا دوسری ایسی طاقت موجود نہ تھی جو مجرموں کو قرار واقعی سزا دے سکتی ۔ اس لئے ضرورت تھی کہ شادی بیاہ اور دوسرے اعمال کے ساتھ ایک طرح کا تقدس وابستہ کیا جائے تاکہ نہ صرف خاوند اور بیوی ہی اس پر سختی سے قایم رہیں اور گناہ اور سزا کے خوف سے اس کی حرمت کے خلاف کچھ نہ کریں بلکہ دوسروں کو بھی یہ بتانے اور یقین دلانے کی ضرورت تھی کہ مناسب رسوم کے بغیر مرد اور عورت کا تعلقات زن وشوئی قایم کر لینا گناہ ہے ۔ مقصود یہ تھا کہ جہاں ایک طرف خفیہ تعلقات اور حرام اولاد اور دوسری پیچیدگیوں کا ازالہ ہو جائے وہاں دوسری طرف لوگ نکاح اور دوسرے معاہدوں کو استوار خیال کریں ۔ یہ نہ ہو کہ آج عہد باندھا اور کل توڑ دیا ۔ چونکہ ابتدا میں مذہب یا توہم پرستی ہی انھیں ایسے ارتکاب سے روک سکتی تھی اس لئے ان رسوم کی پناہ لینا پڑی ۔

یہودیت میں نکاح پر پابندیاں یہودیت نے یقیناً اس پر ترقی کی ۔ فضول اور لایعنی رسوم کو کم کر دیا لیکن اسکے ساتھ ہی بعض دوسری پابندیوں کا اضافہ بھی کر دیا ۔ سب سے پہلی پابندی مذہب سے متعلق تھی کہ غیر موسویوں سے شادی بیاہ نہ کرنا ، نہ ان کے بیٹوں کو بیٹیاں دینا نہ اپنے بیٹوں کے لئے ان کی بیٹیاں لینا کیونکہ وہ تیرے بیٹوں کو میری پیروی سے برگشتہ کر دیں گے تاکہ وہ اور معبودوں کی عبادت کریں"[۱]

دوسرے محرمات کا دائرہ وسیع کر دیا[۲] چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت موسوی نے ماں ۔ سوتیلی ماں ۔ بہن ۔ سوتیلی بہن ۔ نواسی ۔ پوتی ۔ پھوپھی[۳] ۔ بہو اور (بیوہ یا مطلقہ) بھاوج سے نکاح کی ممانعت کی ہے ۔ نیز ماں کے ساتھ نکاح کر لینے کی صورت میں اس کی بیٹی یا پوتی یا نواسی کے ساتھ نکاح جایز نہیں ۔ بیک وقت دو حقیقی بہنوں سے بھی نکاح منع ہے[۴]

عیسائیت شریعت جدیدہ نہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عیسائیت سے متعلق ایک دو اصولی باتیں بیان کر دی جائیں ، اول یہ کہ یہ کوئی نئی شریعت نہیں نہ اس کا ایسا کوئی دعویٰ ہی ہے کہ اس کے بعد موسوی شریعت منسوخ ہو گئی ہے ۔ عیسائیت نے ان تمام قوانین کو برقرار رکھا اور ان پر عمل فرض قرار دیا ہے جو اس سے پہلے حضرت موسیٰ کے ذریعہ نازل ہو چکے تھے ۔ لکھا ہے کہ[۵] " ایک شخص نے

---

[۱] استثنار (۷ = ۳ - ۴) ۔ [۲] احبار باب ۱۸ ۔ [۳] حضرت موسیٰ سے پہلے پھوپھی سے نکاح جائز تھا خود حضرت موسیٰ کے والد عمران نے اپنی پھوپھی یوکبد سے نکاح کیا (خروج ۶ - ۲۰) حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون اور مریم تینوں اسی نکاح کا نتیجہ تھے ۔
[۴] اس سے پہلے دو حقیقی بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا بھی جائز تھا ۔ چنانچہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت یعقوب نے لیاہ اور راخل دو سگی بہنوں سے نکاح کیا (پیدائش باب ۲۹) ۔ [۵] متی (۱۹ = ۱۶ - ۱۹)

(حضرت یسوع مسیح ناصری علیہ السلام کے) پاس آکر کہا: اے اُستاد! میں کونسی نیکی کروں تاکہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں۔ حضرت یسوع نے اس سے کہا: اگر تو زندگی میں داخل ہونا چاہتا ہے تو حکموں پر عمل کر۔ اس نے پوچھا: کونسے حکموں پر۔ حضرت یسوع نے کہا: یہ کہ خون نہ کر۔ زنا نہ کر۔ چوری نہ کر۔ جھوٹی گواہی نہ دے۔ اپنے باپ کی اور ماں کی عزت کر اور اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ" وغیرہ۔ یہ وہی احکام ہیں جو حضرت موسٰی کو طور پر الواحِ عشرہ میں ملے تھے اور جو موسوی شریعت کا سنگِ بنیاد ہیں[1]۔ پس یہ خیال غلط ہے کہ عیسائیت کوئی شریعتِ جدیدہ ہے جس کے آنے سے پہلی شریعت منسوخ ہوگئی۔

کتاب کی تشریح

دراصل یہ غلطی دو وجہ سے پیدا ہوئی، اول اس لئے کہ قرآن میں صرف توراۃ اور انجیل اور زبور تین کتابوں کا نام لیا گیا ہے اور یہ خیال کر لیا گیا کہ کتاب سے مراد شریعت ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر نبی صاحبِ کتاب ہوتا ہے[2]۔ اب اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوسکتا کہ ہر ایک نبی صاحبِ شریعت ہوتا ہے کیونکہ ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں جب ایک ہی قوم کی طرف بیک وقت متعدد نبی مبعوث ہوئے ہیں۔ اگر یہ سب حاملِ شریعت تھے تو گویا ایک ہی وقت میں متعدد شریعتیں یا قانون نافذ کر دئے گئے۔ یہ تین صورتوں سے خالی نہیں اگر یہ سب قانون ایک دوسرے کے مطابق تھے تو ایک ہی نبی کافی تھا اتنے نبی بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر قانون مختلف تھے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ خداوند تعالٰے نے ایک وقت میں مختلف قانون نافذ کر دئے جو کوئی صاحبِ تمیز نہیں مان سکتا اور سب سے آخر یہ قانون ایک دوسرے کی تکمیل کرتے تھے تو ماننا پڑے گا کہ ہر ایک نبی کی شریعت غیر مکمل تھی حالانکہ مخاطب ایک ہی تمدن اور تعلیم کے لوگ تھے۔ یہ بجائے خود محلِ اعتراض ہے۔ لیکن یہ سب خیال آرائیاں غیر ضروری ہیں۔ دراصل یہاں کتاب کے معنی وحی ہیں اور اس لحاظ سے واقعی ہر ایک نبی صاحبِ کتاب ہوتا ہے لیکن صاحبِ شریعت نہیں ہوتا۔ اس کی کتاب اس کی وہ وحی ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے خواہ یہ محض چند رویا و کشف ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو اور اس میں شریعت کا کوئی حکم بھی نہ ہو۔ خود قرآن میں دوسری جگہ لفظ کتاب وحی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے[3]۔ فرمایا: "وماکان ہذالقرآن ان یفتری من دون اللہ ولاکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل الکتاب لاریب فیہ من رب العالمین"۔ (اور یہ قرآن اللہ تعالٰے کے بغیر کسی دوسرے جھوٹے طور پر بنایا جا ہی نہیں سکتا بلکہ یہ تو اس کلامِ الٰہی کی تصدیق کرتا ہے جو پہلے سے نازل شدہ موجود ہے اور یہ مفصل وحی ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں اور یہ رب العالمین کی طرف سے ہے) یہاں تفصیل الکتاب قرآن کی صفت یا بدل ہے اور دونوں صورتوں میں کتاب کے معنی وحی ہوں گے۔ رہا یہ کہ پھر قرآن نے صرف ان تین کتابوں کا ذکر ہی کیوں کیا تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ اس کے مخاطب اول وہ لوگ تھے جو انہی کتابوں سے واقف تھے نیز چونکہ زبور اور انجیل موسوی شریعت کے دو زیادہ مشہور اور بلند مرتبہ نبیوں کی وحی پر مشتمل تھیں اس لئے ان کا نام خصوصیت سے بیان کر دیا۔ ورنہ اس سے یہ مقصود نہیں کہ کوئی اور کتاب نازل نہیں ہوئی۔ جیسے کتنے اور انبیاء کا ذکر نہیں کیا[4] ایسی ہی کتنی کتابوں کا ذکر بھی

[1] استثناء (۵ = ۷ - ۲۱) — [2] البقرہ ۲ = ۲۱۳ — [3] یونس = ۳۹ — [4] النساء - ۱۶۴ -

ملتوی کر دیا۔ دراصل اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ہر نبی صاحب شریعت نہیں دوسری وجہ اس غلط فہمی کی یہ ہوئی کہ خود بخود سمجھ لیا گیا کہ ہر نبی شریعت کا حامل ہوتا ہے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی بسا اوقات کسی پہلے نبی کے اتباع میں اسکی تائید اور اس کے دین کے احیاء اور اس کی فراموش شدہ شریعت کے دوبارہ قیام کے لئے بھی مامور کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں نئی شریعت لانے والے نبی بہت کم ہوئے ہیں۔ بہت بڑی اکثریت ایسے ہی نبیوں کی تھی جو کسی دوسرے نبی کی شریعت کے قیام اور اجراء کے لئے مبعوث ہوئے۔ مثال کے طور پر ہندوستان ہی کو لے لیجئے۔ یہاں صحیح معنوں میں شریعت صرف ایک نازل ہوئی جو وید کی چار کتابوں پر مشتمل ہے۔ اسکے بعد جتنے نبی یہاں ہوئے ہیں وہ خود بھی اسی شریعت کے پیرو تھے اور دوسروں کو بھی اسی پر عمل کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ رام اور کرشن سے متعلق تو کچھ شبہ ہی نہیں۔ اگرچہ رام کی کتاب موجود نہیں لیکن رامائن کے مطالعہ سے ان کے عقاید سے متعلق کافی شہادت مل جاتی ہے۔ کرشن کی گیتا بھی کوئی نئی شریعت نہیں بلکہ وید کی تعلیم ایک خاص پہلو یعنی وحدت الوجود اور انجام سے بے غرض ہو کر خدمت بجا لانے کی تفسیر اور تشریح ہے۔ اور تو اور بدھ بھی اپنی تمام عظمت کے باوجود کسی نئی شریعت کے حامل نہیں تھے۔ ان کی ترہی پیٹاکا، کا غائر مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ وید کی شریعت کے مخالف نہیں تھے نہ ان کی تعلیم ہی وید کی تعلیم سے متناقض ہے۔ بلکہ اس میں ویدانت اور یوگ کے بعض مسایل کو زیادہ اہمیت دیکر انھیں شرح و بسط سے بیان کر دیا ہے۔ یہی حال دُنیا کی دوسری شریعتوں کا ہے۔

بعثِ عیسوی کی غرض موسوی سلسلے کے جملہ انبیاء اسی قبیل سے تھے۔ وہ ساری عمر توراۃ پر عمل پیرا رہے اور اسی کے مطابق جھگڑوں کا فیصلہ کرتے رہے[1]۔ حضرت مسیح ناصری کی بعثت کی غرض بھی شریعت موسوی کی تکمیل و تقویت تھی۔ وہ شریعت جو حضرت موسیٰ کے پیرو بھول چکے تھے اور جس پر عوام اور جہلاء کا تو کیا ذکر ہے ان کے خواص اور علماء تک کا بھی عمل نہیں تھا۔ اسی لئے حضرت مسیح نے اپنے پیروں کو نصیحت کی کہ "فقیہی اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں پس جو کچھ وہ تمھیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں"[2]۔ ظاہر ہے کہ یہ فقیہ اور فریسی وہی باتیں بتاتے ہوں گے جو توراۃ میں ہیں۔ اگر حضرت مسیح خود کوئی نئی شریعت لائے ہوتے تو وہ لوگوں کو موسوی شریعت کے علماء کے احکام کی پابندی کی نصیحت نہ فرماتے صرف اسی پر بس نہیں۔ حضرت مسیح نے کوئی ایسی تعلیم نہیں دی جو توراۃ میں موجود نہ تھی۔ ان کا مشہور "پہاڑی وعظ" بھی جو خاص ان کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ بھی پہلی شریعت کا خلاصہ ہے اور وہ خود اعتراف فرماتے ہیں کہ "یہ نہ سمجھو کہ میں توراۃ یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ ان کی تصدیق اور تکمیل کرنے کو آیا ہوں"[3]۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے محبت اور شفقت پر خاص زور دیا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ تعلیم کہاں تک عالمگیر اور سب حالات میں قابلِ عمل ہو سکتی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ انھوں نے محبت اور شفقت

---

[1] المایدہ - ۵ : ۴۴ — [2] متی (۲۳ : ۲-۳)، [3] ایضاً (۵ : ۱۷)

پر خاص زور دیا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ تعلیم کہاں تک عالمگیر اور سب حالات میں قابلِ عمل ہو سکتی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ان سے پہلے کسی نبی نے محبت اور رافت کی تعلیم نہیں دی۔ یہاں ہندوستان ہی میں اس موضوع پر جو کچھ بدھ نے کہا یا چین میں تاؤ دھرم کے بانی لاؤزو نے فرمایا حضرت مسیح اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ خود توراۃ میں بالکل وہی الفاظ موجود ہیں جو حضرت مسیح نے فرمائے اور جو گویا ان کی تمام تعلیم کا بنیادی پتھر ہیں یعنی "اپنے ہمسائے سے اپنی مانند محبت کر"[1]۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کے زمانے کے یہودی اپنی سنگدلی اور انتقام پسندی میں اس حد تک پہونچ چکے تھے کہ گویا انھوں نے اخلاقِ عالیہ کو ترک ہی کر دیا ہو۔ اس لئے انھیں تصویر کا دوسرا رُخ دکھانے کے لئے اس کے بالعکس اسی شدت سے تبلیغ کرنے کی ضرورت تھی اور یہی حضرت مسیح نے کیا۔

نئے عہد نامہ کی حیثیت

عیسائیت سے متعلق دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ موجودہ انجیل الہامی نہیں۔ ایک کے سوا یہ تمام کتابیں اصل میں یونانی زبان میں تھیں اور حضرت مسیح کی مادری زبان یقیناً یونانی نہیں تھی۔ اگرچہ ہم آج تک یہ فیصلہ تو نہیں کر پائے کہ ان کی اپنی زبان کیا تھی آرامی یا عبرانی یا سریانی اور ان کی وحی کس زبان میں تھی لیکن اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ نہ صرف موجودہ چاروں انجیلیں الہامی نہیں بلکہ یہ حضرت مسیح کے واقعہ صلیب کے بھی ایک مدت بعد مختلف اوقات میں تالیف ہوئیں۔ درحقیقت یہ کتابیں محض چند حواریوں کی یادداشتوں کا مجموعہ ہیں۔ جن میں ان کے ذاتی مشاہدات اور ان واقعات کا بیان ہے جو انکی موجودگی میں پیش آئے یا ان تک دوسروں کے ذریعہ سے پہونچے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر اناجیل اربعہ میں تضاد بھی ہے۔ جیسے کوئی واقعہ یا بات کسی طرح یاد رہ گئی یا بتائی گئی اس نے جوں کی توں بیان کر دی اور ایک ہی واقعہ سے مختلف اثرات قبول کر لینا اور اس پر "زیبِ داستان" کے لئے کچھ بڑھا دینا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ پس ان انجیلوں کا درجہ زیادہ سے زیادہ وہی ہے جو اسلام میں حدیثوں کا ہے جن میں رطب و یابس سب کچھ ہے۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ان چار انجیلوں کے ساتھ حواریوں کے خطوط بھی جو انھوں نے تبلیغ کے دوران میں اپنے احباب یا نومسیحیوں یا کنیسوں کو لکھے نیز وہ واقعات بھی جو واقعہ صلیب کے بعد ان حواریوں کو پیش آئے شامل کر دئے گئے ہیں اور اب انجیل کا جزو لاینفک ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج عیسوی "شریعت" کی بنیاد اتنی حضرت یسوع مسیح کے الہامات اور اقوال پر نہیں جتنی ان حواریوں کے اقوال اور بالخصوص پولوس کے خطوط پر ہے۔ حالانکہ جناب پولوس نہ حواری ہیں نہ صحابی۔

عیسائیت اور شادی

یہ ایک ضمنی لیکن ضروری بحث تھی جس کا مدعا یہ ہے کہ نہ حضرت مسیح کوئی نئی شریعت لائے نہ متداول انجیل ہی الہامی ہے اس لئے موسوی شریعت (توراۃ) کی تعلیم گویا عیسائیت ہی کی تعلیم ہے اور جہاں ہمیں کسی مسئلہ سے متعلق انجیل میں سے کوئی حکم میسر نہ آئے ہم یہ ماننے میں حق بجانب ہیں کہ اس میں وہ توراۃ کے احکام کی پابند ہے۔ جہاں تک مسئلہ زیرِ بحث کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح نے کسی جگہ مرد یا عورت کے نکاح کی ممانعت نہیں کی۔ لیکن پولوس رسول نے فرمایا کہ[2] "مرد کے لئے اچھا ہے کہ عورت کو نہ چھوئے لیکن حرامکاری کے

---

[1] احبار (۱۹ = ۱۸) — [2] کرنتھیون الاول (۷ = ۱-۲)

اندیشے سے ہر مرد اپنی بیوی اور ہر عورت اپنا شوہر رکھے۔" پھر فرمایا کہ "اگر تیرے بیوی ہے تو اس سے جدا ہونے کی کوشش نہ کر اور اگر تیرے بیوی نہیں تو بیوی کی تلاش نہ کر" گویا تجرد افضل ہے لیکن اگر انسان کو اندیشہ ہو کہ مجرد رہنے سے میرے بھٹک جانے اور گناہ میں ملوث ہو جانے کا خدشہ ہے تو وہ نکاح کا جوا اپنی گردن پر رکھ لے۔ اس کے بالکل متضاد یہ رائے انہی پولوس رسول کے قلم سے دوسری جگہ موجود ہے[۲]۔ لیکن روح صاف فرماتا ہے کہ آیندہ زمانوں میں بعض لوگ گمراہ کرنے والی روحوں اور شیاطین کی تعلیم کی طرف متوجہ ہو کر ایمان سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ یہ ان جھوٹے آدمیوں کی ریاکاری کے باعث ہوگا جن کا دل گرم لوہے سے داغا گیا ہے۔ یہ لوگ بیاہ کرنے سے منع کریں گے اور ان کھانوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیں گے جنھیں خدا نے اس لئے پیدا کیا کہ ایماندار اور حق شناس لوگ انھیں شکرگزاری کے ساتھ کھائیں"

یہاں نکاح کے خلاف تعلیم دینے والوں کو شیطان اور گمراہ کن روحوں سے تعبیر کیا گیا ہے جو پہلے سے مختلف ہے۔

یہ تھی صورت حال جب قرآن نازل ہوا۔

لا رہبانیۃ فی الاسلام قرآن کہتا ہے کہ عورت کی تخلیق کی غرض مرد کے لئے سامانِ سکون مہیا کرنا ہے[۳]۔ ایک جگہ عورت کو لباس سے تشبیہ دی ہے[۴]۔ گویا عورت بھی لباس کی طرح مرد کے عیبوں کو ڈھانپتی ہے اور اس کے لئے زینت کا باعث ہے[۵]۔ مطلب واضح ہے کہ عورت کی ہستی مرد کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسے دوسرے سامان جو اس کی صحت و حیات کے بقا کے لئے ضروری ہیں۔ ایسی صورت میں تجرد اور رہبانیت کا خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا جس کی تعلیم پولوس نے دی تھی بلکہ اسلام صراحت سے کہتا ہے کہ تم اپنے مجرد مردوں اور عورتوں کے نکاح کردو۔ وانکحوا الایامی منکم[۶]

اسلام میں نکاح سے غرض نکاح کی غرض و غایت نہایت بلاغت سے ایک لفظ میں بیان کر دی جہاں عورت کو کھیتی سے تعبیر کیا[۷]۔ جس طرح کھیتی اناج کے بقا و دوام کا ذریعہ ہے اسی طرح عورت سے نسلِ انسانی قایم رہے گی اور یہی نکاح کی غرضِ اول ہے لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ عورت کی مقاربت صرف اسی صورت میں جائز ہے جب مقصد حصول اولاد ہو جیسا کہ بعض ویدک دھرم کے پیرؤں کا عقیدہ ہے بلکہ اسے سامانِ سکون بھی کہا۔ وہ مرد کے تھکے ماندے قواء کے لئے سکون اور آرام کا ذریعہ بھی ہے اس لئے ہم تسکین کی خاطر بھی اس کی قربت حاصل کر سکتے ہیں۔ حدیث میں انہی دو مقاصد کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ بیوی کو صاحبِ محبت (ودود) اور صاحبِ اولاد (ولود) ہونا چاہئے۔ (باقی)

مالک رام - ایم - اے

[۱] کرنتھیوں الاول (۷ = ۲۷) — [۲] تیمتھس الاول (۴ = ۱-۳) — [۳] الاعراف ۷ = ۱۸۹ —
[۴] البقرہ (۲ = ۱۸۷) — [۵] الاعراف (۷ = ۲۶) — [۶] النور (۲۴ = ۳۲) —
[۷] البقرہ : ۲۲۳ -

سیاہ بلّی

(حق و تاثری کے کرشمے)

میں جس عجیب و غریب وحشت خیز قصہ کو بیان کرنے جا رہا ہوں اس کو نہ تو ہر شخص یقین کرے گا اور نہ میں اس کی امید کرتا ہوں۔ لیکن یہ قصہ میرے تخیل کی پیداوار نہیں، اور چونکہ کل میں اس دُنیا سے رخصت ہونے والا ہوں اس لئے اس واقعہ کو صرف اس لئے لکھ رہا ہوں کہ شاید اس کے بیان کر دینے سے میری روح کا بار کچھ ہلکا ہو جائے۔ میں دُنیا کے سامنے اپنی گھریلو زندگی کے چند معمولی واقعات بیان کر رہا ہوں جو یکے بعد دیگرے کچھ اس نوعیت و تسلسل کے ساتھ واقع ہوئے کہ میرے لئے انتہائی ذہنی و روحانی کرب و تشنج کا سبب بن گئے۔ مگر اتنا بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگرچہ یہ واقعات میرے لئے انتہائی خوف و دہشت کا باعث ہوئے ہیں مگر بہت ممکن ہے کہ دوسروں کو ان میں کوئی خاص اہمیت نظر نہ آئے۔

میں اپنے بچپن میں اپنی سیدھی سادی اور عجز پسند طبیعت کے لئے مشہور تھا۔ میں اس قدر رحمدل واقع ہوا تھا کہ میرے ساتھی اکثر میرا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ بچپن ہی سے مجھے پالتو جانوروں کا شوق تھا اور میرے والدین نے میرے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے میرے واسطے طرح طرح کے جانور پال رکھے تھے۔ میرا زیادہ تر وقت انھیں جانوروں کے ساتھ گزرتا اور انتہائی سکون و مسرت کے ساتھ گزرتا۔ میری عمر کے ساتھ ساتھ میرا یہ شوق بھی بڑھتا رہا۔

جب میری شادی ہو گئی تو حُسنِ اتفاق دیکھئے کہ میری بیوی بھی اسی ذوق کی ثابت ہوئی جو میرا تھا، اس کو میری خوشنودی کا بہت خیال تھا، چنانچہ اس نے پالتو جانوروں سے میری دلچسپی دیکھ کر چند نہایت پسندیدہ جانور پال لئے۔ مختلف قسم کی خوبصورت اور خوش آواز چڑیاں، سنہرے رنگ کی مچھلیاں چند نہایت عمدہ قسم کے کتے اور انھیں کے ساتھ ایک سیاہ بلّی!

یہ بلّی بہت خوبصورت تھی۔ رنگ بالکل سیاہ تھا یہاں تک کہ جسم میں کسی دوسرے رنگ کا ایک نقطہ بھی نہ تھا اور سمجھدار اتنی تھی کہ بعض اوقات اُس پر حیرت ہوتی تھی۔

میری بیوی تھوڑی سی توہم پرست واقع ہوئی تھیں، اس لئے وہ کبھی کبھی باتوں ہی باتوں میں اشارتاً کہہ جاتیں کہ سیاہ بلیاں اکثر جادوگرنیاں ہوا کرتی ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اس خیال کو زیادہ اہمیت نہ دیتی تھیں۔

میں نے بلّی کا نام پلوٹو رکھا تھا اور اس سے مجھے خاص طور پر دلچسپی تھی، میں خود ہی اس کو اپنے ہاتھ سے

کھلاتا اور اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتا۔ وہ بھی مجھ سے غیر معمولی طور پر دلچسپی رکھتی۔ میں جدھر بھی جاتا وہ میرے پاؤں سے لگی رہتی جب میں گھر سے باہر جانے لگتا تو اس کو بڑی دقت سے الگ کرتا۔

ہماری یہ دوستی اور محبت کئی سال اسی طرح قایم رہی، اس عرصہ میں مجھے شراب کی لت ہو گئی (مجھے یہ کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے) اور اس نے میری فطرت میں عجیب قسم کی تبدیلی پیدا کر دی۔ میں کچھ اداس سا رہنے لگا میرے مزاج میں سختی اور ترشی پیدا ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہ عالم ہو گیا کہ مجھے دوسرے کے جذبات و احساسات کا مطلق پاس و لحاظ نہ رہتا۔ یہاں تک کہ میں اپنی بیوی سے بھی نہایت درشت و غیر مہذب طریقہ سے پیش آنے لگا اور نوبت اس حد تک پہونچ گئی کہ میں نے اُسے مارا بھی۔ اب پالتو جانوروں کے ساتھ بھی میرا سلوک بالکل مختلف ہو گیا، اور میں اکثر انھیں بھی زدوکوب کرنے لگا۔ کتے یا دوسرے جانور اگر اتفاق سے یا اپنی محبت کی بنا پر کبھی میرے پاس آجاتے تو میں انھیں ضرور مارتا، مگر پھر بھی اُس بلی کے ساتھ میرا سلوک اتنا خراب نہ تھا، میں ایک حد تک اس کا ضرور خیال رکھتا۔ میری شراب خواری بڑھتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ میری بدمزاجی بھی۔ یہاں تک کہ بلی کو بھی میری درشت مزاجی کا پتہ چل گیا۔

ایک رات جب میں نشے کے عالم میں، شہر کی گلیوں کا چکر لگانے کے بعد گھر میں داخل ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ بلی میرے پاس آنے سے گریز کر رہی ہے۔ میں نے بڑھ کر اُسے بہت سختی سے دبوچ لیا۔ میرے اس غیر متوقع حملہ سے وہ خوف زدہ سی ہو گئی اور اپنے کو چھوڑانے کی کوشش کرنے لگی، جب میں اُسی طرح اُسے دبائے رہا تو اس نے مجھے کاٹ لیا۔ جس سے میرے ہاتھ پر ہلکا سا خراش آ گیا۔ اُس کا کاٹنا تھا کہ میرے اوپر غصہ کا بھوت سوار ہو گیا اور بالکل جانور بن گیا۔ میں نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا چاقو نکالا اور بلی کی گردن مضبوطی سے پکڑلی تاکہ وہ سر نہ ہلا سکے اور اس کی ایک آنکھ کاٹ کر باہر نکال لی۔ (اب بھی مجھے اُس بہیمانہ حرکت کا خیال آتا ہے تو کانپ جاتا ہوں)۔

دوسرے دن صبح جب میں سو کر اُٹھا۔ تو نشہ اُتر چکا تھا۔ عقل و ہوش پھر واپس آ گئے تھے۔ رات کی اس حرکت کے خیال سے مجھ پر ایک دہشت و پشیمانی کی سی کیفیت طاری تھی۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قایم نہ رہ سکی میں پھر شراب خواری میں مصروف ہو گیا اور اس واقعہ کا خیال بھی ذہن سے جاتا رہا اس عرصہ میں بلی بھی آہستہ آہستہ اچھی ہو گئی اور اگرچہ اس کی آنکھ کی جگہ اب ایک غار نظر آتا تھا جو بہت بھیانک معلوم ہوتا، مگر اس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی، وہ گھر میں آزادانہ گھوما کرتی۔ تاہم جب میری صورت دیکھتی تو خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتی۔ اگرچہ میرے احساسات مردہ ہو چکے تھے مگر پھر بھی جب میں یہ دیکھتا کہ وہ بلی جو مجھ سے پہلے اتنی محبت کرتی تھی اب اس طرح مجھ سے گریزاں رہتی ہے تو مجھے کچھ افسوس اور کچھ تکلیف سی ہوتی، مگر یہ احساس جلد ہی ختم ہو گیا اور اس کی جگہ مجھے اُس کی اس حرکت پر جھنجلاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ اور میرے اندر درندگی کی وہ کیفیت پیدا ہونے لگی۔ جب کسی کو اذیت پہونچا کر خوشی ہوتی ہے اور جُرم کے ارتکاب میں ایک خاص لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔

ایک دن علے الصباح میں نے نہایت شقاوت سے اُس بلّی کے گلے میں ایک پھندا ڈالا اور اُسے ایک درخت کی خشک شاخ سے لٹکا دیا — اگرچہ اس کو پھانسی دیتے وقت میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور میرا نفس مجھے ملامت کر رہا تھا، مگر پھر بھی میں اپنی حرکت سے باز نہ آیا۔

جس دن مجھ سے یہ شقاوت ظاہر ہوئی اُسی رات اتفاق سے میرے مکان میں آگ لگ گئی اور میری آنکھ اسوقت کھلی جب میرا بستر آگ پکڑ چکا تھا۔ ———

——— پورے مکان سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ میں میری بیوی اور خادمہ بہزار دقت مکان سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوسکے۔ لیکن میرا تمام سامان جل کر خاک ہو چکا تھا — اس واقعہ سے مجھ پر قنوطیت چھا گئی اور میں اپنی قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ رہا۔

میں اُن کمزور دل کے لوگوں میں نہیں ہوں جو مصیبت کو کسی گزشتہ جرم کا بدلا سمجھتے ہیں۔ لیکن میں واقعات کی کسی کڑی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔ آتشزدگی کے دوسرے دن میں اپنے جلے ہوئے مکان کو دیکھنے گیا۔ گھر کی تقریباً تمام دیواریں جل کر بیٹھ گئی تھیں۔ مگر ایک دیوار باقی تھی۔ میرے پلنگ کا سرہانا اس دیوار کی طرف رہتا تھا۔ اس دیوار پر نیا پلاستر کرایا گیا تھا اور غالباً پلاستر کی نمی کی وجہ سے وہ دیوار آگ نہ پکڑ سکی تھی۔ اس دیوار کے پاس لوگوں کا ایک ہجوم لگا ہوا تھا اور لوگ اُس کے ایک حصّہ کو بہت زیادہ غور سے دیکھ رہے تھے اور حیرت کا اظہار کر رہے تھے میں بھی اس دیوار کے قریب گیا تو دیکھا کہ دیوار پر ایک بلی کی تصویر بنی ہوئی ہے اور اس کے گلے میں رسّی کا پھندا لٹک رہا ہے۔ تصویر اس قدر زیادہ صاف اور نمایاں تھی کہ اس کو دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی تھی۔

یہ تصویر دیکھ کر میں انتہائی خوفزدہ ہوا مگر جلد ہی میرے ذہن نے اس کی ایک تاویل کر لی جس سے مجھے کسی حد تک سکون ہو گیا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اپنے مکان سے ملحق ایک باغیچہ میں بلی کو پھانسی دی تھی۔ آگ لگنے پر باغیچہ غالباً آدمیوں سے بھر گیا ہوگا۔ اور ان میں سے کسی نے بلّی کو درخت سے علٰحدہ کر کے مجھے جگانے کے لئے میرے کمرے کی کھڑکی سے اندر پھینک دیا اور دوسری دیواروں کے گر جانے کی وجہ سے وہ نئی پلاستر کی ہوئی دیوار اور ملبے کے بیچ میں دب گئی ہوگی اور دیوار کے چونے اور جلتی ہوئی لاش سے نکلے ہوئے امونیا نے بلّی کی وہ تصویر دیوار پر کھینچ دی ہوگی۔

ہر چند میں نے اس واقعہ کی عقلی تاویل تو کر لی مگر میرا ضمیر پوری طور پر مطمئن نہیں ہوا اور یہ واقعہ میرے ذہن پر ایک گہرا اثر چھوڑ گیا۔ پلوٹو کا وہمی سایہ مہینوں مجھے پریشان کرتا رہا اور اس عرصہ میں مجھ پر ایک پشیمانی کی سی کیفیت (جو حقیقت میں پشیمانی نہ تھی) طاری رہی۔ یہاں تک کہ مجھے اُس بلّی کی جدائی کا افسوس ہونے لگا اور میں اپنی آوارہ گردی میں بھی اکثر پلوٹو کی ہمشکل بلّی تلاش کرتا رہتا تاکہ میں اُس خلا کو پورا کر سکوں جو اُس کے مرنے سے پیدا ہو گیا تھا — ایک شب میں شرابخانہ میں مدہوش پڑا ہوا تھا کہ یکایک میری نظر ایک بلّی پر پڑی جو شراب کے بڑے پیپے پر سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھی — میں اُٹھ کر اس کے قریب گیا اور اس پر ہاتھ پھیرنے لگا، یہ ایک سیاہ بلّی تھی — اتنی ہی بڑی جتنی کہ پلوٹو تھی — اُس کی شکل بھی بالکل اُسی کی طرح تھی — لیکن فرق یہ تھا کہ پلوٹو کے جسم پر

سیاہ رنگ کے علاوہ دوسرے رنگ کا ایک بال بھی نہ تھا اور اس کے سینہ پر سفید رنگ کا ایک بڑا دھبہ موجود تھا۔ میرے چھوتے ہی وہ کھڑی ہوگئی۔ آہستہ سے غرائی اور پھر اپنا جسم میرے ہاتھ سے ملنے لگی۔

میں نے مالک مکان کو اس کو قیمت دینا چاہی مگر اُس نے کہا کہ بلّی اس کی نہ تھی اور نہ اُس سے پہلے اس نے کبھی اس کو اپنے مکان میں دیکھا تھا۔

میں اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا رہا اور جب میں وہاں سے گھر چلنے لگا تو وہ کچھ اس طرح سے پیش آئی کہ گویا وہ میرے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس کو اپنے ساتھ لے لیا۔ میرے گھر سے یہ بہت جلد مانوس ہوگئی اور میری بیوی کو تو اس سے خاص اُنس پیدا ہوگیا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے اس سے بھی نفرت پیدا ہوگئی اور میں اس سے الگ الگ رہنا چاہتا، بعض اوقات اس کو جسمانی اذیت پہونچانا چاہتا مگر صرف اس لئے باز رہتا کہ مجھے اپنی پچھلی وحشیانہ حرکت یاد آجاتی اور میں کچھ شرم سی محسوس کرنے لگتا۔ چند ہفتوں تک تو میں اُس سے صرف گریزاں ہی رہا مگر آہستہ آہستہ مجھے اُس سے سخت کراہت پیدا ہوگئی اور میں اس کی مکروہ صورت سے اس طرح بھاگنے لگا جیسے کوئی وبا کے جراثیم سے بھاگتا ہے۔

جس رات کو میں اُسے گھر لایا تھا اُس کی صبح کو یہ پتہ چلا کہ پلوٹو کی طرح اُس کے بھی ایک آنکھ نہ تھی۔ سب سے پہلے اسی چیز نے میرے دل میں اُس کی طرف سے نفرت کا جذبہ پیدا کیا تھا مگر میرے برخلاف اسی چیز نے اس کو میری بیوی کا محبوب بنا دیا تھا کیونکہ جیسا میں پہلے بیان کر چکا ہوں، میری بیوی میں رحمدلی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

الغرض مجھے اس بلّی سے جتنی نفرت بڑھتی جاتی اتنا ہی میرے ساتھ اس کی محبت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ جب میں کسی جگہ بیٹھتا تو یہ یا تو میرے پاؤں کے پاس آکر بیٹھ جاتی یا اُچک کر میرے گھٹنوں پر بیٹھ جاتی۔ اگر میں اُٹھ کر چلنے لگتا تو یہ میرے پاؤں کے بیچ میں آجاتی اس کے اس طرح پاؤں سے لگ کر چلنے کی وجہ سے میں کئی مرتبہ گرتے گرتے بچا۔ اکثر جب میں کھڑا ہوتا تو وہ اپنے تیز پنجوں سے میرا لباس پکڑ کر میرے سینہ تک چڑھ جاتی۔ ایسے موقعوں پر میرا جی چاہتا کہ میں اس کو فوراً قتل کر دوں۔ مگر کچھ تو میں اپنے گزشتہ جرم کو یاد کرکے اس حرکت سے باز رہتا اور کچھ —— مجھے صاف صاف اس کا اقرار کر لینا چاہئے — اس جانور کے خوف اور دہشت سے۔

میں اس جانور سے اس وجہ سے خوفزدہ نہیں تھا کہ مجھے اس سے کوئی جسمانی صدمہ پہونچنے کا اندیشہ تھا۔ مگر — مجھے یہ بیان کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے — کہ یہ خوف و دہشت جو مجھے اس جانور سے محسوس ہوتا صرف ایک کمزور واہمے کی بنا پر تھا۔ میری بیوی نے اکثر مجھے اُس کے سینہ کے سفید نشان کی طرف توجہ دلائی تھی۔ یہ نشان پہلے صرف ایک بے ڈھنگے دھبے کی طرح تھا۔ مگر یہ دھبہ آہستہ آہستہ اپنی شکل بدل رہا تھا۔ اس قدر آہستہ آہستہ کہ اُس کی تبدیلی کا احساس ممکن نہ تھا۔ میں بہت عرصہ تک کوشش کرتا رہا کہ میں اس تبدیلی کو صرف اپنے وہم پر محمول کر دوں۔ مگر اب اُس دھبے نے ایک خاص شکل اختیار کر لی تھی — یہ ایک ایسی چیز کی شکل تھی جس کا نام لینے سے بھی میں دہشت زدہ ہو جاتا ہوں اور یہی وہ چیز تھی جس کی وجہ سے میں اُس بلّی سے متنفر و خوفزدہ رہا کرتا تھا یہ نشان ایک بہت ہی ہولناک چیز — پھانسی کے پھندے کا نشان تھا! موت اور نزع کے کرب و تشنج کا نشان!—

[redacted]

اب راحت و اطمینان مجھ سے کوسوں دور تھا۔ تو مجھے دن کو سکون نصیب ہوتا اور نہ رات کو چین آتا۔ دن کو تو وہ خود ایک لمحہ کے لئے میرا پیچھا نہ چھوڑتا اور رات کو اس کا خیال مجھے ستاتا رہتا۔ بسا اوقات میں نہایت بھیانک خواب دیکھ کر چونک اُٹھتا اور دیکھتا کہ بلّی مجھسے اس قدر نزدیک ہے کہ اس کی سانس میرے گالوں کو چھوتی ہے اور اس کا وزن جو میرے لئے ایک کابوس بن گیا تھا اور جس کو اپنے سینے سے میں کسی طرح نہ ہٹا سکتا تھا مستقلاً میرے اوپر مسلط رہتا۔

اِس روحانی اذیت نے میری رہی سہی اچھائیوں کو بھی تباہ کر دیا۔ بدی اور معصیت کے خیالات میرے تنہا ساتھی رہ گئے۔ میری طبیعت کی غمگینی اور چڑچڑے پن میں اس قدر اضافہ ہوگیا کہ میں دُنیا کی ہر چیز اور ہر آدمی سے نفرت کرنے لگا۔ میرے غصّہ کی کوئی انتہا نہ رہ گئی۔ مجھے معمولی سی معمولی بات پر طیش آجاتا۔ مگر میری صابر شاکر بیوی جو عموماً میرے اس طیش و غضب کا ہدف ہوتی تھی، خاموشی سے اُس کو برداشت کرتی رہتی۔

غربت اور افلاس نے ہمیں اُسی پُرانے جلے اور ٹوٹے ہوئے مکان میں رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک دن میں اور میری بیوی مکان کے تہ خانے میں اُترنے لگے جہاں گھر کی اکثر چیزیں رکھی رہتی تھیں۔ جب میں زینہ سے اُتر رہا تھا تو وہ بلّی حسب عادت میرے پاؤں کے بیچ میں آگئی۔ میرا پاؤں اُس سے اٹک گیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ بلّی کی اس حرکت پر مجھے اس قدر طیش آیا کہ میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور مجھ پر جنون کا ایک دورہ سا پڑ گیا۔ بچوں کا سا وہ خوف جو مجھے اس کے قتل سے ابھی تک روکے ہوئے تھا بالکل غائب ہوگیا۔ قریب ہی ایک کلہاڑی رکھی ہوئی تھی وہ میں نے اُٹھالی اور اس کو مارنا چاہتا تھا کہ میری بیوی نے میرا ہاتھ روک لیا اور اگر اُس نے میرا ہاتھ نہ پکڑ لیا ہوتا تو اسوقت یقیناً بلّی کا خاتمہ ہوگیا ہوتا۔ میری بیوی کی اس حرکت نے میرے شیطانی جنون میں اور بھی اضافہ کر دیا اور بغیر کچھ سمجھے بوجھے میں نے اُس کلہاڑی سے اپنی بیوی پر حملہ کر دیا۔ کلہاڑی سر پر لگی اور اندر دھنستی ہوئی چلی گئی۔ اس غریب نے ایک آہ بھی نہ کی۔ وہ وہیں مردہ ہوکر گر پڑی۔

اس ہولناک قتل کے ارتکاب کے بعد میں اُس لاش کو چھپانے کی تدابیر سوچنے لگا میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اپنے ہمسایوں کے دلوں میں شبہ پیدا کئے بغیر میں یہ لاش نہ دن کو باہر نکال سکتا ہوں نہ رات کو۔ ذہن میں مختلف تدابیر آئیں۔ پہلے میں نے یہ سوچا کہ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں اور چولھے میں جھونک دوں۔ پھر یہ سوچا کہ اس تہ خانے میں زمین کھود کر دفن کر دوں، یا پھر کسی بکس میں بند کرکے کسی قلی کے ذریعہ سے کسی دوسری جگہ پہونچا دوں آخر کار ان تمام تدابیر سے بہت زیادہ بہتر ایک تدبیر میرے ذہن میں آگئی۔ میں نے یہ طے کیا کہ جس طرح اگلے زمانہ میں خانقاہوں میں رہنے والے پیر و فقیر اپنے شکار کو تہہ خانوں کی دیواروں میں زندہ چن دیا کرتے تھے اسی طرح اس لاش کو بھی تہہ خانے کی دیوار میں چن دیا جائے۔

اس قسم کے کام کے لئے یہ تہہ خانہ بہت موزوں تھا۔ اس کی دیوار زیادہ مضبوط نہیں تھی اور حال ہی میں دیواروں پر بھدا سا پلاستر کرایا گیا تھا، چونکہ اس جگہ پر نمی بہت زیادہ تھی اس وجہ سے وہ پلاستر بھی خشک نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں ایک نقلی آتش دان تھا جس کی وجہ سے یہاں پر دیوار کی سطح کافی اونچی ہوگئی تھی

چنانچہ میں نے سوچا کہ لاش کو دفن کرنے کی مناسب جگہ یہی ہے۔ اس دیوار کو دیکھ کر کسی کو یہ شبہ نہ ہو سکے گا کہ یہاں پر کوئی لاش پوشیدہ ہے۔

میں نے آسانی سے آتشدان کی چمنی کی اینٹیں دیوار سے علحدہ کر لیں اور لاش کو اس میں کھڑا کر کے اوپر سے اینٹیں چن کر پلاستر کر دیا۔ پلاستر سے بالکل یہ نہیں ظاہر ہوتا تھا کہ اُس حصّہ پر نیا پلاستر کیا گیا ہے، میں اپنی جگہ پر پوری طرح مطمئن تھا۔

اس کے بعد میں نے اس بلّی کو تلاش کرنا شروع کیا جو میری ان تمام تکالیف کا باعث تھی۔ کیونکہ اب میں نے قطعی طور پر طے کر لیا تھا کہ اس کو ختم ہی کر کے چین لوں گا، اگر وہ مجھے اس وقت مل جاتی تو اُسی وقت اسکی زندگی کا فیصلہ ہو جاتا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عیار بلّی میرے شدید طیش اور تشدد سے ڈر کر میرے سامنے آنے سے گریز کر رہی تھی۔ اس جانور کے غائب ہو جانے سے مجھے جو بے پایاں اطمینان اور سکون نصیب ہوا ہے احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ یہ اُس رات کو بھی نہیں آئی اور اس طرح قتل کے ارتکاب کے باوجود، میں نہایت اطمینان سے سویا۔ دوسرا اور تیسرا دن بھی گزر گیا اور اب میں پھر ایک آزاد انسان کی طرح سانس لینے لگا۔ وہ عجیب الخلقت مخلوق غالباً دہشت زدہ ہو کر مکان چھوڑ کر بھاگ گئی تھی! میں خوش تھا کہ اب میں اُسے پھر کبھی نہ دیکھوں گا۔ یہ خیال میرے لئے انتہائی مسرت بخش تھا۔ اُس بھیانک اور تاریک فعل کا خیال میرے لئے کچھ زیادہ پریشانی کا باعث نہ تھا کچھ لوگوں نے مجھ سے میری بیوی کے بارے میں دریافت کیا۔ لیکن ان کو فوراً تشفی بخش جواب دیدیا گیا۔ اب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ میری آیندہ زندگی پُرسکون اور مطمئن گزرے گی۔

قتل کے چوتھے دن خلاف توقع پولیس کی جماعت نے میرے مکان کو گھیر لیا اور پھر نہایت غور سے خانہ تلاشی شروع کی چونکہ مجھے یہ اچھی طرح یقین تھا کہ اُس لاش کا پتہ چلانا آدمی کے بس کی بات نہیں اس لئے مجھے اس تلاشی سے ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی۔ میں بالکل مطمئن تھا۔ پولیس افسران کے حکم کے بموجب میں برابر ان کے ساتھ رہا۔ انھوں نے گھر کا کونہ کونہ چھان ڈالا۔ تین چار مرتبہ تہ خانہ کی تلاشی لی۔ مگر مجھ پر ان باتوں کا ذرا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میرا دل ایسا ہی مطمئن اور پرسکون تھا جیسے کوئی معصومانہ اور خوشگوار خواب دیکھنے کے وقت ہوتا ہے میں اپنے سینہ پر ہاتھ رکھے ہوئے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ پولیس پوری طور پر مطمئن ہو گئی تھی اور جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس وقت میرا جوشِ مسرت اتنا شدید تھا کہ اس کو روکنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ میرا دل اس فتح اور کامیابی پر کچھ کہنے کے لئے بیتاب تھا۔ خواہ وہ ایک ہی حرف کیوں نہ ہو، چنانچہ جب پولیس والے تہ خانے کے زینہ پر چڑھنے لگے تو میں نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا " حضرات! مجھے مسرت ہے کہ میں آپ کے شکوک رفع کرنے میں آپ حضرات کی مدد کر سکا، خدا آپ کو تندرست اور مطمئن رکھے، لیکن جملہ معترضہ کے طور پر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مکان نہایت عمدہ طریقہ سے بنایا گیا ہے (میرا دل کچھ کہنے کے لئے اس طرح بیتاب ہو رہا تھا کہ مجھے خود یہ نہیں معلوم تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں) بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ غیر معمولی طور پر عمدہ بنایا گیا ہے! یہ دیواریں ـــ کیا آپ حضرات تشریف لئے جا رہے ہیں؟ ـــ یہ دیواریں نہایت مضبوطی سے بنائی گئی ہیں

یہاں پہونچکر محض اپنی بہادری جتلانے کے خاطر میں نے دیوار کے عین اُس مقام پر جہاں میری مظلوم بیوی کی لاش تھی، ایک لکڑی سے جو میرے ہاتھ میں تھی زور سے کھٹکھٹایا، لیکن اس کھٹکھٹانے کی آواز ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ دیوار کے اندر سے ایک آواز آئی جو پہلے بہت دھیمی تھی، جیسے کوئی بچہ ہچکیاں لیتا ہے، مگر فوراً ہی وہ ایک لمبی، پرشور چیخ میں بدل گئی - ایک دلگداز چیخ کی صدا - جس میں دہشت اور فتح مندی کا ایک عجیب امتزاج تھا - ایسی صدا جو صرف جہنم کی گہرائیوں ہی سے بلند ہوسکتی ہے - جہاں گناہگار اور فرشتہ ہائے عذاب دہشت اور کامرانی میں ایک ساتھ چیختے ہیں

میرا خود اپنے بارے میں کچھ کہنا بیکار ہوگا - میں فوراً بیہوش ہوکر گر پڑا - پولیس کی جماعت خوف و دہشت سے چند لمحے تو زینہ پر بالکل ساکن کھڑی رہی اور پھر انھوں نے دیوار کو کھودنا شروع کیا - دو ہی چار ضربوں میں دیوار کے اوپر نئی چُنی ہوئی اینٹیں ایک ساتھ گر پڑیں - خون سے نہائی ہوئی لاش جو سڑنا شروع ہوگئی تھی سامنے دیوار میں کھڑی ہوئی تھی اور اُس کے سر پر انگارے کی طرح دہکتی ہوئی لال لال آنکھ کھولے ہوئے بلّی بیٹھی ہوئی تھی جسکی شرارت نے مجھے پہلے ہولناک قتل پر اُکسایا اور پھر اپنی آواز سے مجھے تختۂ دار تک پہونچا دیا - معلوم ہوتا ہے کہ غلطی سے میں نے اس کو لاش کے ساتھ بلّی کو بھی دیوار میں چن دیا تھا -

(ایڈگر ایلن پو)

ہمارے علماء کا دینی نظریہ

(اسلام حریت فکر کے منافی ہے)

یورپ میں مذہب کی طرف سے عام بددلی پیدا کرنے والی شے وہاں کے مذہبی افراد کی تنگ خیالیاں اور کوتاہ بینیاں رہی ہیں۔ ابتدا میں اُن کی طرف سے یہ کوششیں کی گئیں کہ "فکری حریت" کا رجحان پھیلنے نہ دیا جائے اور آزادانہ بحث و نظر پر الحاد و بے دینی کی تہمت رکھ کر اُسے پروان چڑھنے سے روک دیا جائے۔ اس کے لئے حکومتی اقتدار بھی استعمال کیا گیا اور عوام بھی اس کے خلاف مشتعل کئے گئے مگر انسان کے اس جائز حق کے دبانے میں یہ کوششیں مسلسل ناکام ثابت ہوئیں۔ جب غیر معمولی تشدد کے باوجود بھی "فکر و نظر" کی جولانیاں قائم رہیں اور محکمۂ احتساب کا شکنجہ بھی انھیں دبا نہ سکا، زمانہ کی رفتار سے مجبور ہو کر عیسائیت نے استدلال کے اسلحہ اس کے مقابلہ کے لئے سنبھالے مگر توہمات اور تعصبات اور اُن کے "مذہبی تصور" کی بے اعتدالیوں نے عقل و دماغ کے بازو شل کر دئے تھے اس لئے ہر مورچہ پر شکست کھاتے گئے اور لامذہبیت کی قوتوں کا سر اونچا ہوتا چلا گیا۔ اس طرف ایک عرصہ سے ہمارے مذہبی رجحانات بھی اسی کشمکش میں مبتلا ہیں، بدقسمتی سے علمائے اسلام کی بڑی تعداد میں بھی تنگ خیلیوں اور کوتاہ بینیوں کا مادہ پورے طور سے موجود ہے۔ وہ مذہب کے متعلق اپنے ذاتی و شخصی تخیلات کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ جو شخص "آمنا و صدقنا" کہہ کر اپنا دماغ اُن کے حوالے نہ کر دے تو اُس کا مذہبی حیثیت سے ملعون و مردود ہو جانا لازمی ہے، اُن کی نگاہوں میں اہم و غیر اہم مسایل کے مابین کوئی فرق ہی نہیں ہے، ہمارا یہ مورچہ بہت کمزور ہے اور یہیں سے لامذہبیت کی فوجیں ہمارے مذہب کے "حِصنِ حصین" میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔

پیغمبر اسلام کی روحانی و نفسی بصیرت کی مثال نہیں پائی جاتی۔ انھیں اس کا ابتدا ہی سے احساس تھا کہ اس قسم کے افراد کی طرف سے مذہب کو نقصانِ عظیم پہونچے گا۔ اسلامی منبع سے فطری و عملی تعلیمات کا جو صاف شفاف چشمہ جاری ہوا ہے اُسے یہ لوگ اپنے توہمات و تعصبات کے خس و خاشاک سے بالکل ہی برباد کر دیں گے۔ اسی بنا پر مختلف الفاظ میں سرورِ کائنات نے اس خطرے سے اپنی امت کو متنبہ کر دیا تھا۔

بہت ممکن ہے کہ علماء سُوء سے مراد حامیانِ مذہب کا یہی پڑھا لکھا تنگ نظر صنف ہو جو اپنے ذاتی و شخصی افکار و آرا کو واقعیت و حقیقت کا درجہ دیتی ہے اور جو شخص ان کے خیالات پر فکر و نظر کی مشق کرتا ہے اسے کافر

بناتی ہے - یہ طبقہ دراصل یہ نہیں سمجھتا کہ مذہب کی اصلی غایت کیا ہے - مذہب انسانی زندگی ہی سے وابستہ ایک چیز ہے اور اس لئے وہ جامد و متحجر نہیں ہو سکتا - غور و فکر کی نگاہ میں مذہب کا اصلی منشا یہی ہو سکتا ہے کہ فکری و اخلاقی و تمدنی حیثیت سے نوع بشری کے لئے ارتقا کے راستے کھلتے چلے جائیں، بحث و نظر کو روک کر کوئی مذہب اپنا یہ منشا پورا نہیں کر سکتا - ایسی صورت میں آزادانہ فکر و نظر پر غلط قسم کی قیدیں عاید کرنا یا اس کی مشق و ممارست کو تکفیر کے حربوں سے روکنا مفید نہیں ہو سکتا مگر دشواری یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے علماء کی طرح مفکرین و علماء اسلام کی بھی بڑی تعداد ان معاملات میں صحیح جادہ پر نہیں ہے -

یہ امر یقیناً قابلِ افسوس ہے کہ غیر دانشمندانہ قدامت پسندی نے اُن میں غیر رواداری پیدا کر دی ہے اور وہ اپنے سلسلۂ خیالات و افکار سے مختلف سلسلہ پر غور کرنا ہی پسند نہیں کرتے -

حضرت علیؓ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا ہے :-

" خدا اُن انسانوں کو بہت زیادہ دشمن رکھتا ہے جنھوں نے غلط مسایل جمع کر لئے ہیں، جاہل عوام میں بہت تیز رفتار بن جاتے ہیں اور فتنوں کی تاریکیوں میں خوب دوڑتے ہیں، امن و صلح میں جو مصلحتیں ہیں اُن کی طرف سے بالکل اندھے ہوتے ہیں، عوام نے اُن کا نام عالم رکھا ہے، درانحالیکہ اُنھیں اس کے مفہوم سے کوئی تعلق نہیں - ان لوگوں نے غلط مسایل کے جمع کرنے کی طرف جلد بازانہ اہتمام کیا ہے اور ان امور کا کثیر حصہ جمع کر لیا ہے لیکن حق یہ ہو کہ اس ذخیرہ کا کم ہونا اُس کے کثیر ہونے سے بہتر ہے - ان لوگوں کے تبحّر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب غلط مسایل کے بدمزہ اور گندے پانی سے سیراب ہو چکتے ہیں تو پھر اُن مسایل کی توضیح کے ضامن و ذمہ دار بن کر جو دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتے ہیں، مسندِ قضا پر خاص شان کے ساتھ جلوہ فرما ہوتے ہیں - اب اگر کہیں کوئی مشکل پیش آگئی تو اُس کے حل میں اپنی رائے کو دخل دیتے ہیں جو بالکل ہی فضول و کہنہ و بوسیدہ ہے اور اس کے بعد اُنھیں یہ بھی زعم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے وہ مشکل حل کر دی - (حقیقت میں) ایسا شخص جاہل ہے، جہالتوں کی تاریکیوں میں اِدھر اُدھر آوارہ و سرگرداں پھرنے والا - اندھا ہے - علم کی لکڑی کو قطع کرنے والی داڑھ سے اُس نے نہیں کاٹا ہے وہ روایات و احادیث کو اس طریقہ سے چاروں طرف چھڑکتا اور اُڑاتا ہے جس طرح تیز ہوا خشک گھاس کو چاروں طرف اُڑاتی ہے، جو مسایل اُس کے سامنے ہیں اُن کے فیصلہ کرنے کا وہ اہل نہیں ہے اور نہ اُسے اُن تعریفوں کا کوئی استحقاق ہے جو عوام کی زبانوں سے ادا ہوتی ہیں، جو باتیں وہ نہیں جانتا اُن کے متعلق اُسے نہ تو یہ خیال ہی ہوتا ہے کہ علم وہاں بھی ہو سکتا ہے اور نہ وہ یہی محسوس کر سکتا ہے کہ اُس کی رسائی کے ماورا بھی کچھ راستے ہیں "

جناب امیرؓ نے مخصوص قسم کے مدعیانِ علم کی جو خصوصیتیں اس خطبہ میں گنوائی ہیں اُنھیں اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو اس خطرناک جماعت کی شناخت بہت آسانی سے ہو سکتی ہے اور اُن کی کہنگی فکر اور غیر رواداری نظر اور بغیر سوچے سمجھے روایات و احادیث کو بنائے استدلال بنانے سے حریتِ فکر کو جو نقصان پہونچ سکتا ہے اُس سے نجات مل سکتی ہے -

---

اسلام غور و فکر کا حامی ہے، وہ تفکر و تعقل کی قوتوں کا خوابیدہ رہنا ناپسند کرتا ہے۔ قرآن حمیدان برخود غلط افراد کی عقلی تنگ داماںیوں اور فکری سبک ظرفیوں کا طرفدار نہیں ہے۔

اُس نے بیشتر مقامات پر "تفکر و تعقل و تدبر و تفقہ" کی طرف انسانی طبایع کو متوجہ کیا ہے اور عدم تفکر و تعقل کی خرابیاں اپنے مخصوص عنوان میں بتائی ہیں " افلا تفکرون افلا تعقلون" کی صدائیں اسکی تلاوت کرنے والوں کو برابر چونکاتی رہتی ہیں، قرآن مجید نے تو اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ مذہب کو تقلیدی حیثیت سے اختیار کرنے کے رجحان کی شہرگ ہی کاٹ دینا چاہی ہے، اُس میں اس کی صاف صاف تصریح موجود ہے کہ آباؤ اجداد کے دین پر اس لئے باقی رہنا کہ وہ آباؤ اجداد کا دین ہے نہایت ہی غیر حکیمانہ طریقہ ہے حقیقت میں دین وہی ہے جو اپنے عقل و فہم کی روشنی میں اختیار کیا گیا ہو کیونکہ اس قسم کے اختیار کردہ دین سے دل و دماغ کی مفید صلاحیتوں کو مدد ملتی ہے اور انسانی سیرت کو صحیح معنوں میں تشکیل ہوتی ہے:

" واذا قیل لہم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اباءنا ولو کان اباءھم لا یعقلون شیئاً و لا یھتدون"

(اور جبکہ اُن سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے جو اُمور نازل کئے ہیں اُن کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ نہیں ہم تو اُن چیزوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے اگرچہ اُن کے آباؤ اجداد نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ سیدھے راستہ پر ہوں) اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان معاملات میں غور و فکر کو اپنی پوری آزادی استعمال کرنے کا حق دیتا ہے۔

مسلمانوں کے فرقہ شیعہ کی کتب احادیث میں بعض ایسی واضح روایتیں ملتی ہیں جن سے اس نظریہ کی پوری تائید ہوتی ہے۔

کتاب الکافی باب العقل میں جناب ابوعبداللہ سے روایت کی گئی ہے:۔

" اگر تم کسی شخص کو بہت ہی نمازی اور بڑا ہی روزہ دار دیکھو تو جب تک کہ اُس کی عقل پر نظر نہ کر لو اُس پر مباہات نہ کرو"۔

اس روایت کا صاف منشا یہ ہے کہ بدون عقل کثرتِ عبادت کوئی قابل فخر چیز نہیں ہے یعنی جب تک کہ قوائے عقلیہ کی صیقل، نظر و فکر نے نہ کر دی ہو اور دماغ صحیح معنوں میں شائستہ نہ بن چکا ہو، ہماری عابدانہ زندگی قابل فخر و مباہات نہیں ہے۔

اسی کافی کے باب العقل میں دوسری حدیث یہ ملتی ہے: " قال لا یعباء باہل الدین ممن لا عقل لہ"
(وہ مذہبی افراد بالکل ہی در خور اعتنا نہیں ہیں جو عقل سے محروم ہیں)۔ اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری عقلی زندگی جب تک کہ اُسے فکری تربیت اور عقلی شائستگی کا سہارا حاصل نہ ہو بے معنی چیز ہے۔

حقیقت بھی یہ ہے کہ " ارتقائے فکری" کی منزلیں طے کئے بغیر چند عقاید کا زبان سے دہرا دینا اور کچھ اعمال کا رسمی طور سے پابند ہو جانا حکیم مطلق کی مخلوق کے شایانِ شان نہیں ہے۔

قرآن مجید کی صریحی ہدایتوں اور دوسری دلیلوں کی موجودگی کے باوجود بعض جلیل القدر اعاظم فقہا نے بحث و نظر کو مردود قرار دینے کی جو سعی کی ہے وہ غلط قسم کی فکری فضا کا نتیجہ ہے ۔ اسی خیال کے ایک زبردست بزرگ کا خیال ہے :

"علیک بالفقہ وایاک علم الکلام فلان یقال اخطأت خیر لک من ان یقال کفرت ۔" (فقہ سیکھو اور خبردار علم کلام نہ سیکھو (اس لئے کہ تمہارے متعلق یہ کہا جاتا کہ تم نے خطا کی بہتر ہے اس بات سے کہ تمہیں کافر کہا جائے) الیواقیت والجواہر فی بیان عقاید الاکابر جلد اول مطبوعہ مصر) ـــــ ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں : ـــ

"بحث و مباحثہ کرنے والوں کے لئے میرا یہ حکم ہے کہ انھیں لکڑیوں سے پیٹا جائے اور اُن کو مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں تشہیر کیا جائے اور کہا جائے کہ یہ اُس شخص کی سزا ہے جو کتاب اور سنت کو ترک کر دے اور علم کلام میں معروف ہو جائے ۔"

ان دلچسپ خیالات کی صدائے بازگشت اب تک سنائی دیتی ہے اور دین و مذہب کے مقدس سرپرستوں کی بڑی تعداد کی طرف سے بحث و مباحثہ اور غور و نظر کو شجر ممنوعہ قرار دینے کی کوششیں کی جاتی ہیں لیکن اسلام کی حکیمانہ ترجمانی انھیں قبول نہیں کر سکتی ۔ کوئی بھی مذہب ہو اگر ہماری زندگی سے تعلق رکھتا ہے تو وہ تحریک کا یہ نکتہ نظرانداز نہیں کر سکتا کہ انسانی تہذیب و شائستگی کا ارتقا زیادہ تر اُن اسباب و علل پر موقوف ہے ، جو ہمارے قبضہ میں ہیں اور ان اسباب و علل میں ممتاز حیثیت علم کی ترقی اور ہماری اس صلاحیت کو حاصل ہے کہ ہم اپنے عادات خصایل نئے حالات کے مطابق بنائیں اور عقلی ارتقا کے لئے آزادانہ فکر و نظر کو ضروری قرار دے لیں ۔ [illegible] یہاں بھی بند رکھا گیا اور اپنے ہی افکار و خیالات کو دنیا پر عاید کرنے کی کوشش کی گئی تو آمریت کے قدم بیچ میں جائیں گے ۔

اس قسم کی باتیں اُس جماعت کی طرف سے زیادہ کی جاتی ہیں ، جو "عقل" کو بہت ہی سبک و خفیف چیز سمجھتی ہے اس کی نگاہ میں عقل و استدلال کا غلبہ کرنا دین و مذہب کو ہاتھ سے کھو دینے کے مرادف ہے ۔ جون [illegible] کے معارف علم گڑھ میں اقبال پر عقل و استدلال کی بیمائگی کا رونا رویا گیا ہے ۔ صاف بات تو یہ ہے کہ علامہ اقبال کے افکار عقل کے بارے میں مشکل ہی سے قبول کئے جا سکتے ہیں ، جن مسایل پر عقل ہی غور کر سکتی ہے انھیں سوائے آخر کس دوسری بات کے کیا جائے ؟ وجدان ، تو اس کا دایرہ بھی محدود ہے ، جو میدان عقل کی تگ و تاز کے لئے موزوں ہے وہ وجدان اقبال کی اصطلاح میں "جنون" کی حیثیت بھی "پائے چوبیں" سے زیادہ نہیں ہے ۔

پروفیسر جوڈ کا یہ قول بہت صحیح ہے کہ "عقل و استدلال غلطی کر سکتا ہے بلکہ اکثر اُس سے غلطی ہوتی ہے ، تعصب کی آمیزش سے اُس کے فیصلوں میں جانبداری کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے اور ذاتی خواہشیں اُسے مسخ کر سکتی ہیں وغیرہ وغیرہ لیکن اپنے اکثر غلط رو ہونے اور ایک ناقص آلہ کی حیثیت رکھنے کے باوجود وہی تنہا ایسی چیز ہے جس سے ہم کام لے سکتے ہیں ۔"

علامہ اقبال نے مسئلہ کے اس پہلو کی طرف التفات نہ فرمایا ورنہ وہ عقل سے اس قدر بیزار نہ ہوتے ـــ اصل یہ ہے کہ حریت فکر کے مخالفین کے دلوں میں یہ خدشہ موجود ہے کہ اگر فکر و نظر کی باگیں چھوڑ دی گئیں تو پھر اس

دنیا میں مذہبیت کے قدم جم نہیں سکتے۔ ہر طرف دہریت و الحاد کا پھریرا لہراتا نظر آئے گا معارف کے فاضل مقالہ نگار کے یہ فقرے قابلِ غور ہیں:

" دین و مذہب کو ہاتھ سے کھو کر عقل و استدلال کو اختیار کر کے نوجوانوں نے کیا پایا۔ مادی عقل نے اُن کے قلوب میں کیا انقلاب برپا کر دیا؟ ان کے نقطۂ نظر کو کس طرح بدل دیا؟ اور نقطۂ نظر کے بدل جانے سے جہان اور جہان کے چارسوان کے لئے کیسے بدل گئے؟ اقبال کو جو نظر آیا وہ یہ تھا:

جان لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب　　　دل نزع کی حالت میں خرد پختۂ و چالاک

قلب سے عشق و ایمان رخصت ہوا اور تاریکی چھائی، دل تیرہ اور نگہ بے باک ہوگئی۔ روح اخلاقی اقدار سے محروم ہو کر لاغر ہونے لگی۔ اس کے عوض تن میں فربہی پیدا ہونے لگی۔ زاغ کی عمر بھی تو غلیظ کھا کر دراز ہوتی ہے اور وہ ہوتا بھی سرگیں خوری کے لئے ہے: مع　　عمر زاغ از بہرِ سرگیں خوردنست　　(رومی)
شاید اسی سرگیں نے انھیں شستہ اور روشن دماغ کر دیا لیکن نگاہ کی وسعت اور یقین کا ذوق ایمان کا گداز روح کی پاکیزگی اور عفت ان سے رخصت ہوگئی۔

اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن　　　اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب"

میرا خیال تو یہ ہے کہ عقل و استدلال کو اختیار کر کے نوجوانوں نے دین و مذہب نہیں کھویا ہے۔ لیکن اگر مذہب در اصل ایسی ہی کمزور چیز ہے کہ اس پر غور و فکر کے نتائج لازماً الحاد و بے دینی کی صورت ہی میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں تو پھر ایک انسان کا لامذہب ہو جانا حق بجانب ہے۔ صورت واقعہ تو یہ ہے کہ لامذہبیت و لادینیت تعلیم یافتہ نوجوانوں میں دوسرے گوشوں سے آرہی ہے۔ جیسا ابتدا میں کہا گیا ہے اس کے لئے ارباب مذاہب کی بڑی تعداد کی غیر رواداری۔ اُن کی تشدد پسندی۔ اُن کی مذہبی انانیت اُن کی فکری کوتاہ بینی کافی حد تک ذمہ دار ہے۔

سید اختر علی تلہری

فاتح برلن مارشل زوکوف

یہ جنگ عظیم چند ایسے جری اور کامیاب جنرل سامنے لائی ہے کہ ان کا نام تاریخ عالم کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ ان میں سب سے پہلا نام روسی جنرل، مارشل گورگی کانسٹینٹی ناوچ زوکوف کا ہے۔

فاتح برلن، مارشل زوکوف نے اس جنگ میں جو کچھ کر دکھایا اور جس غیر معمولی ذہانت و فراست سے کام لیا، اسکی مثال ملنا ممکن نہیں۔

مارشل ۱۸۹۵ء میں وسطی روس کے ایک چھوٹے سے گاؤں استرلکوف میں ایک کسان کے گھر پیدا ہوئے۔ والدین کی غربت کی وجہ سے زیادہ دنوں تک اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ اور کم عمری ہی میں معاشی ضرورت سے مجبور ہو کر سمور کے ایک تاجر کے یہاں ملازمت کرنی پڑی۔ پہلی جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی آپ کو زار روس کی فوج میں جبراً بھرتی کر لیا گیا۔ میدان جنگ میں دو سال گزارنے کے بعد آپ ایک معرکہ میں زخمی ہو گئے اور گھر واپس آئے۔ آپ بستر علالت ہی پر تھے کہ روس میں انقلاب ہوا اور زار روس کو تخت سے اُتار کر عنان حکومت اشتراکیوں نے اپنے ہاتھ میں لیلی۔ جب آپ صحتیاب ہوئے تو روس خانہ جنگی کی مصیبت میں مبتلا تھا کیونکہ عہد زار کے امرا اور جنرلوں نے برطانیہ، امریکہ اور جاپان سے مدد حاصل کر کے اشتراکی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ زوکوف صحتیاب ہوتے ہی سرخ فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اور اپنی سیاسی دوربینی کی وجہ سے جلد ہی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بھی بنا لئے گئے۔

اس خانہ جنگی کے زمانہ میں ان کے جوہر کھلنے شروع ہوئے۔ سُرخ فوج کے افسروں نے دیکھا کہ اس نوجوان کسان میں معرکہ آرائی کی غیر معمولی ذہانت پوشیدہ ہے، ان کو افیسروں کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے ملٹری اکاڈمی میں داخل کر دیا گیا۔ اکاڈیمی سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہ سوویٹ یونین کی مستقل افواج کے افسر مقرر کر دئے گئے۔ ان کو علم اور فنِ جنگ میں مہارت حاصل کرنے کا اسقدر شوق تھا کہ سرکاری فرائض ادا کرنے کے اوقات کے علاوہ جتنا وقت بھی آپ کو ملتا یا تو اشتراکی لٹریچر پڑھنے میں گزارتے یا فنون جنگ کے متعلق کتابیں پڑھنے اور مضامین لکھنے میں۔ اسی عرصہ میں آپ نے غیر ملکی زبانیں بھی سیکھنا شروع کیں۔ چنانچہ آپ اسپینی اور جرمن زبان سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہٹلر کے برسر اقتدار آنے سے پیشتر آپ کئی مرتبہ جرمنی گئے جہاں جرمن جنرل اسٹاف کے اسکول کی طرف سے روسی اور چینی جنرلوں کو لکچر دینے کا انتظام کیا گیا تھا۔

۱۹۳۶ء میں جب اسپین میں خانہ جنگی کی ابتدا ہوئی تو سوویٹ حکومت کی طرف سے آپ کو فوجی ناظر (Observer) کی حیثیت سے اسپین بھیجا گیا۔

جب ۱۹۳۹ء میں جاپانیوں نے جمہوریت منگولیا پر حملہ کر دیا اور چونکہ روس، منگولیا کا حلیف اور از روئے معاہدہ مملکت منگولیا کی سرحدوں کی حفاظت کا ذمہ دار تھا، اس لئے سرخ فوج کی طرف سے منگولی افواج کی مدد کے لئے ژوکوف کو ایک ٹینک ڈویژن کے ساتھ مورچہ پر بھیجا گیا۔

اسی مورچہ پر سب سے پہلے سرخ افواج کی دلیری اور ہمت کا امتحان ہوا اور اسی معرکہ میں ژوکوف کی شہرت کی بنیاد پڑی۔

جب روس اور فنلینڈ میں لڑائی ہوئی تو ژوکوف بھی ٹموشنکو کے ساتھ روسی فوجوں کی کمان کر رہے تھے۔ فنلینڈ کی جنگ ختم ہو جانے کے بعد انھیں قیف کے علاقہ کا فوجی کمانڈر بنا دیا گیا اور جنرل کا عہدہ عطا کیا گیا۔

جنرل ژوکوف نے سرخ افواج کی خامیوں کا فن لینڈ کے مورچہ پر اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا چنانچہ انھوں نے سرخ افواج کی تنظیم جدید کا ایک خاکہ بنا کر حکومت روس کے سامنے پیش کیا۔ جسے کمیونسٹ پارٹی نے منظور کر لیا۔ اس امر کے باوجود کہ اُس وقت تک روس اور جرمنی کے درمیان غیر جانبداری کا معاہدہ قایم تھا، آپ نے حالات آیندہ کا صحیح طور پر اندازہ کرتے ہوئے اہل روس کو اُن سے خبردار رہنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ سرخ افواج کی نئی تنظیم نہایت ضروری ہے۔

جنرل ژوکوف کی پیش بینی صحیح ثابت ہوئی اور جون ۱۹۴۱ء میں ہٹلر نے روس پر حملہ کر دیا۔ مارشل اسٹالن نے اُس وقت ژوکوف کو سرخ افواج کا چیف آف اسٹاف مقرر کیا۔ اس عہدہ پر پہونچتے ہی مارشل ژوکوف نے اتنی عظیم الشان ذمہ داریاں اپنے سر لیں کہ آج تک تاریخ عالم میں کسی جنرل نے نہیں لی تھیں۔ مارشل ژوکوف، چیف آف اسٹاف کی حیثیت سے ماسکو کے قلعہ کرملن میں دشمن کے مقابلہ کے لئے جنگی چالیں سوچتے، نقشے طیار کرتے اور پھر محاذ جنگ پر پہونچ کر فوجوں کی کمان کرتے۔

مارشل ژوکوف نے اپنے سر یہ ذمہ داری اس لئے لی تھی کہ وہ اُصول پر یقین رکھتے ہیں کہ جنگ کی چالیں ہمیشہ حسب ضرورت بدلتی رہنا چاہئیں اور ایسی جنگی چالیں کبھی محاذ جنگ سے دور رہ کر نہیں سوچی جا سکتیں۔ چنانچہ مارشل ژوکوف کا اصول ہے کہ میدان جنگ کی فوجی ترتیب کو دیکھنے کے لئے خود مورچے تک پہونچ جاتے ہیں۔ ان میں ہوشیاری، پیش بندی اور دوربینی کے ساتھ ساتھ دلیری، جرأت اور مصیبت میں سکون قلب قایم رکھنے کی خوبیاں موجود ہیں۔

ان کا سب سے زیادہ زبردست معرکہ "معرکۂ ماسکو" ہے۔ اہل ماسکو اسی معرکہ کی وجہ سے ان کو "نجات دلانے والا" کہتے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۱ء کے موسم خزاں میں جب جرمن فوجوں نے تین طرف سے ماسکو کو محصور کر لیا تھا، اُس وقت ان کو ماسکو کا سپہ سالار مقرر کیا گیا اور انھوں نے اپنے ہاتھ میں کمان لیتے ہی نازی فوجوں کے اُمنڈتے ہوئے سیلاب کو ان کی جگہوں پر روک دیا۔ اور اسوقت تک روکے رکھا جب تک کہ جوابی حملہ کرنے کے لئے سامان جنگ کے ضروری ذخائر ان کے پاس جمع نہ ہو گئے۔ اس عرصہ میں ہٹلر نے ماسکو فتح کرنے کی سیکڑوں ترکیبیں کیں، لاکھوں بکتر بند سپاہی ماسکو کے مورچے پر جمع کر دئے، مگر سرخ فوج ایک آہنی دیوار کی طرح اپنی جگہ پر قایم تھی اور مارشل

زوکوف خطرات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مورچے کے حالات کا خود مطالعہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جرمن فوجوں نے ایک زبردست حملہ کیا اور جب جرمن فوجیں اس حملہ کے بعد ذرا دم لینے کے لئے ٹھیریں تو یکایک سرخ فوجوں کا اتنا زبردست جوابی حملہ شروع ہوا کہ جرمن فوجیں اس کو روک نہ سکیں۔ یہاں تک کہ جرمن فوجیں برلن کی طرف بھاگ نکلیں۔

مارشل زوکوف نے اپنی اس زبردست کامیابی کے بعد اخبار نویسوں کو ماسکو کے محاذ پر جرمنوں کی شکست کے اسباب بتاتے ہوئے کہا کہ: "جرمن سپاہی آسان فتوحات کے عادی ہیں اور عموماً شہروں اور بڑے بڑے قصبات کے قریب ہی خوب لڑتے ہیں، کیونکہ جرمن سپاہی گرم مکانوں کو چھوڑ کر برف سے ڈھکی ہوئی زمین پر نہیں جانا چاہتا۔

ماسکو کے مورچے کی اس کامیابی کے بعد مارشل زوکوف کو اسٹالن گراڈ کے مورچے پر بھیجا گیا۔ جہاں جرمن فوجیں اسٹالن گراڈ کو فتح کرکے دریائے والگا کو عبور کرنے کی تدبیریں کر رہی تھیں۔ اسٹالن گراڈ میں ۱۲ دن رات اس گھمسان کا رن پڑا کہ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مورچہ پر سرخ فوجوں کو ایسی شکست ہوگی کہ وہ پھر اُبھر نہ سکیں گی۔ مگر مارشل زوکوف نے پہونچتے ہی لڑائی کا رنگ بدل دیا اور وہ مورچہ جہاں سوویٹ یونین کی موت و زیست کا فیصلہ ہونا تھا، نازیوں کی تباہی و بربادی کا سبب بن گیا۔

مارشل زوکوف نے مارشل اسٹالن اور مارشل واروشیلاف کے ساتھ مل کر آئندہ موسم گرما کے حملوں کے نقشے طیار کئے اور انھیں نقشوں کی بدولت جرمنوں کو کرسک، اورل، خارکوف اور اسمالنسک جیسے قلعہ بند اور مرکزی مقامات سے ہٹنا پڑا۔

۱۹۴۴ء میں جب یوکرین میں سخت جنگ ہو رہی تھی تو وہاں روسی کمانڈر میدان جنگ میں ایسے زخمی ہوئے کہ جانبر نہ ہو سکے اور اسٹالن نے مارشل زوکوف کو اس مورچہ کی کمان سونپ دی۔

محاذ جنگ کی حالت ایسی تھی کہ زوکوف کی کامیابی کی بظاہر کوئی امید نہ تھی لیکن خلاف توقع روس میں موسم سرما جلد ختم ہو گیا اور برف کے پگھل جانے سے پورا میدان جنگ دلدل بن گیا۔ زوکوف کے سپاہی چلتے وقت گھٹنوں تک اس دلدل میں دھنس جاتے۔ مگر ان مشکلات کے باوجود چونکہ زوکوف نے توپخانے سے دشمن پر زبردست گولہ باری شروع کر دی اور روسی ٹینک اُس دلدل میں آگے بڑھنا شروع ہوئے اور دو ہی دن کے معرکے میں جرمنوں کو سخت شکست ہوئی اس کامیابی کے صلہ میں مارشل زوکوف کو "تمغۂ فتح" عطا کیا گیا، جس کی قیمت تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہے۔

جنوری ۱۹۴۵ء میں برلن پر سرخ افواج کے حملہ کی تیاریاں مارشل زوکوف ہی نے کی تھیں۔ اسوقت ۴۰۰ میل لمبے مورچہ پر تقریباً ۲۰۰ ڈویژن سرخ افواج حملہ آور ہو رہی تھیں۔ اس مرتبہ مارشل زوکوف نے برلن پر سامنے سے حملہ کیا اور سب سے زیادہ اہم اور خطرناک مورچہ کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لی۔ اس حملہ میں سرخ افواج جرمنی کے دارالسلطنت کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہی تھیں اور بعض بعض مورچوں پر حالت تو یہ ہو گئی تھی کہ جب جرمن سپاہی پیچھے پلٹتے تو دیکھتے کہ ان کی پشت پر سرخ افواج کے مورچے قایم ہیں۔

مارشل زوکوف اپنے سیاسی عقاید کے لحاظ سے اشتراکی ہیں اور روس کی کمیونسٹ پارٹی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

ہنگامۂ عالم سے گھبرا کر

(جستجوئے خلوت)

دُنیا کی تمام ذہنی وجمالیاتی تخلیق کا سرچشمہ "خلوت" ہی ہے۔ انسان کی تخلیق سے لیکر افسانے کی تخلیق ـب سب کے لئے خلوت ہی کا سناٹا، اسی کی غنائی فضا، اور اسی کا ملاجلا اندھیرا اجالا بے حد ضروری ہے۔ اگر ـنیا میں خلوتکدے نہ ہوتے تو شاید تاریخ ایک سادہ ورق کتاب ہوتی، انسان زمان ومکان کی قیود سے آزاد ـتا بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ انسان پیدا ہوتے ہی مرجاتا۔

اگر دنیا محض "جلوت" ہی ہوتی تو انسان پیدا ہوتے ہی اندھا ہوجاتا، بہرہ ہوجاتا، اس کا دماغی توازن ـزلزل ہوجاتا، اس کا جسم ٹوٹنے لگتا اور وہ تھک کر بہت جلد مرجاتا کیونکہ جلوت کی فضا لطافت کی حامل نہیں ہوتی ـسورج کی تیز کرنوں، شور وشغب کی گرجتی لہروں اور بھیگی ہواؤں کی کثافتوں سے بوجھل ہوتی ہے۔ انسان کی ـکھیں اس دوامی "جلوت" کی تیز روشنی سے چوندھیا کر اپنی بینائی کھودیتیں، ہنگامۂ شور وغل سے اس کے ـانوں کے پردے پھٹ جاتے، اس کے حواس کا سکون وتوازن بگڑجاتا اور وہ پاگل ہوکر چیخ اُٹھتا ـــــــ ـگل کردو یہ سورج کا چراغ، بند کردو یہ شور وغل۔ میں سکون چاہتا ہوں، سوجانا چاہتا ہوں۔ میرے لئے کسی ـسنسان پُرسکون اور اندھیری جگہ میں ایک بستر بچھادو"

بستر پر لیٹنے کی خواہش بلاواسطہ خلوت ہی کی خواہش ہے کیونکہ بستر بالعموم خلوت کدہ ہی میں ہوتا ہے اور ـلاقی قوانین کی رو سے بستر کو خلوت ہی میں ہونا چاہئے۔

بستر کی طرح خلوتکدے کی ہر چیز نرم اور آرام دہ ہوتی ہے۔ خلوت کی مدہم سی تاریکی کتنی نرم اور چمکیلی ہوتی ہے ـس کی فضا کھلے برآمدے کی فضا کے مقابلے میں کتنی خنک اور روح پرور ہوتی ہے۔ اس کا سکوت حواس میں کتنا ـسکون پیدا کرتا ہے۔ انسان آرام سے لیٹا ہوا میٹھا میٹھا سا خواب دیکھتا ہے، عورت کا خواب، شاہنامے کا ـواب، آنے والی نسل کا خواب ـــــ اور جب وہ خلوتکدے سے باہر آتا ہے تو تاج محل تعمیر کرتا ہے۔ شاہنامہ ـتصنیف کرتا ہے۔ سہراب کو جنم دیتا ہے۔

خلوتکدے کے لوازم میں ایک اور چیز بھی ہے ـــــ عورت! ـــ عورت خلوتکدے کی روح ہے۔ اور ـس خلوتکدہ میں عورت نہیں وہ خلوتکدہ ویران ہے۔ ہمارا سماجی نظام اور ہماری تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے

کہ عورت ازمانہ اور تاریخ کے ہر دور میں خلوتکدہ کی سالنس رہی ہے۔ اس کو سماجی اور تاریخی اصطلاح میں "چار دیوار" کی مخلوق کہا جاتا ہے۔ لیکن اب جبکہ سرمایہ دارانہ نظام حیات میں عورت "چار دیوار" کی حدود سے باہر نکل آئی ہے، عورت نہیں رہی ہے، بلکہ وہ ایک ٹائپسٹ، ایک شاپ گرل، ایک ٹکٹ چیکر، ایک مڈ وائف، ایک نرس، ایک استانی ہوگئی ہے۔ جلوت کی تیز روشنی میں اس کی نسائیت اس سے الگ ہوگئی ہے اور پرچھائیں اس سے لپٹ گئی ہے۔

ایسا کیوں ہے، اس کا جواب بھی آپ خلوتکدے ہی میں سوچئے۔ عورت کو یاد کرنے، اس کے بارے میں کچھ سوچنے کے لئے خلوتکدے کی فضا ہی بڑی سازگار ہوتی ہے۔ آپ ہی کہئے کہ کیا آج تک کسی نے بھرے بازار میں یا راستہ چلتے ہوئے، دوکان پر سامان خریدتے وقت، ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے، دفتر کی مثلوں پر جھکے ہوئے اپنی محبوبہ کو یاد کیا ہے ــــــ ؟ راستہ چلتے ہوئے محبوبہ کو یاد کرنا تو بڑی خطرناک بات ہے۔ آپ اپنی محبوبہ سے جتنے قریب ہوں گے اتنے ہی کسی تیز رفتار موٹر کی زد میں ہوں گے۔ کل ہی کی بات ہے کہ میاں اغن اپنی منگیتر کی یاد میں کھوئے ہوئے نابر روڈ پر سے گزر رہے تھے کہ ٹریفک کنٹرول کے ایک سپاہی نے انھیں بُری طرح ڈانٹ دیا کیونکہ وہ ایک ملٹری ٹرک کی زد میں آتے آتے بچ گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ٹرک ڈرائیور گورا نشے میں نہیں تھا۔

جلوت میں بات بات پر لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ زندگی کا راستہ ہر ہر قدم پر ایک موڑ پیدا کرتا ہے۔ انسان زندگی سے گھبرانے لگتا ہے۔ اسی لئے ہمارے دیس کے پرانے ہوشمندوں نے "نو وارد ان بساط حیات" کو نصیحت کی تھی کہ گوشۂ عزلت اختیار کرو ــــ ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را ــــ غالب مرحوم نے تو ایک بار ہنگامۂ حیات سے تنگ آکر تمنا کی تھی کہ:

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
پاسباں کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

یہ خواہش زندگی سے فراریت کا اظہار نہیں بلکہ جلوت کی اس فضا سے بیزاری کا اعلان ہے جو شر انگیزی اور تخریب سے معمور ہوتی ہے۔

تاریخ کے پچھلے ادوار میں جب دُنیا ایک خلوت کدہ تھی، تخریبی ہنگاموں سے بڑی حد تک ناآشنا تھی، لیکن آج چاندی کے سکے کی چمک سے ساری دنیا جلوتکدہ بن گئی ہے اور سکے کی کھنک سے ہنگامہ شور و نشور پیدا ہے۔ جانے وہ کون سفاک تھا جس نے پہلے پہل چاندی کے سکے کو انسان کی تمدنی زندگی میں رواج دیا اور اس کے ننھے ننھے دانتوں سے روحانی رشتے کاٹ ڈالے۔ اب دنیا ایک کارگہ تخریب ہے۔ کل تک جہاں غلہ اُگانے والے کھیت تھے آج ان پر دبابے رینگ رہے ہیں، دبابوں کے آہنی دانتوں نے گیہوں کی ننھی ننھی کونپلوں کو چبا چبا کر تھوک دیا ہے اور لوگ بھوک سے بلک بلک کر مر رہے ہیں۔

جلوتکدے کی شرح اموات و پیدائش کتنی افسوسناک ہے۔ ایک دن میں دس انسان پیدا ہوتے ہیں اور اسی دن دس انسان مر جاتے ہیں۔ اور اس اندیشہ کا بہت بڑا امکان ہے کہ یہ اوسط گھٹتے گھٹتے ایک

پیدائش اور دس اموات کا رہ جائے گا اور وہ دن بھی آئے گا جب کہ پیدائش صفر ہوگی اور اموات ہی اموات واقع ہوں گی ـــــ اور کسی دن سورج بھی طلوع نہ ہوگا ـــــ! اس دن کے لئے انسان اگر طیار نہیں ہے تو نجات کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ رجعت کر جائے، جنگ کے میدانوں سے، بین الاقوامی کانفرنسوں سے، کالجوں سے، بازاروں سے، جس عہد میں انسان خلوت کدے کی فضا میں پلتا تھا تو برسوں زندہ رہتا تھا اور دنیا کو غیر فانی اور اعلیٰ تخلیقات سے مالا مال کر دیتا تھا۔ انسان خود خلوتکدے کی تخلیق ہے، دنیا کا عظیم ترین شاعر فردوسی جلوتکدے میں پیدا ہوا اور اس نے خلوتکدے کی الہامی فضا میں شاہنامہ تصنیف کیا۔ اگر آپ یہ کسی سے کہیں کہ فردوسی نے شاہنامہ ایران کے کسی ہوٹل یا قہوہ خانے میں بیٹھ کر تصنیف کیا تو لوگ آپ پر ہنسیں گے، آج کی دنیا کے مقبول ترین سیاسی عقیدے کمیونزم کو کارل مارکس نے اپنے خلوتکدے کے سناٹے میں گھنٹوں داڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر سوچا ہے۔ اسلام کی اشاعت غارِ حرا کے خلوتکدے سے ہوئی۔ بدھ مت برگد کے پیڑ کے گوشۂ عزلت سے نکلا۔ ہندو مذہب پہاڑوں اور کٹیوں کی کنج ہائے تنہائی سے نکل کر پھیلا۔ عیسائیت ایک سنسان چراگاہ میں حضرتِ عیسیٰ کی روح میں منور ہوئی۔

اب ان خلوتکدوں کی تخلیقات کا مقابلہ موجودہ دنیا کے جلوتکدے کے کارخانوں، تجربہ گاہوں، درس گاہوں ناچ گھروں، تھیٹروں اور خوابگاہوں کی تخلیقات سے کیجئے تو پتہ چلے کہ یہ کتنے مضحکہ خیز، کتنے بے ثبات، کتنے کمزور اور کتنے غیر انسانی ہیں۔ آج آسمانوں سے باتیں کرنے والی ہزاروں عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں۔ امریکہ میں تو فلک بوس عمارتوں کا ایک شہر آباد ہو گیا ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ قطب مینار کو جو سر بلندی حاصل ہے وہ امریکہ کی کسی فلک بوس عمارت کو نہیں، آپ بازاروں میں بڑے آدمیوں کے مجسمے ہر چوراہے پر دیکھتے ہیں لیکن یہ کیا بات ہے کہ نظر میں وہ ذوق پیدا نہیں ہوتا جو اجنتا کی کسی بھونڈی عورت کے مجسمے کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ آج کی عورت جو بچہ پیدا کرتی ہے وہ سہراب اور اکبرِ اعظم کیوں نہیں ہوتا۔ آج کا معمار جو عمارت تعمیر کرتا ہے وہ تاج محل کیوں نہیں ہوتی۔ آج کا موسیقار جو گیت الاپتا ہے وہ سمندر میں تموج کیوں نہیں پیدا کرتا ـــــ وہ بجھے ہوئے دیپک کیوں نہیں جلا سکتا؟ آج کا شاعر جو شعر کہتا ہے وہ شعر اس کی موت کے ساتھ ہی کیوں مر جاتا ہے؟۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آج کا فن کار جلوت کدے کے اُجالے اور شور و شغب میں محض اپنی جسمانی طاقتوں سے تخلیق کرتا ہے۔ اس کے پاس وہ سوزِ جگر وہ الہامی روح اور وہ عرقِ پیشانی نہیں جو خلوتکدے کے لوازم ہیں۔

آج دنیا خلوتکدہ نہیں ہے بلکہ ایک بازار ہے۔ اور ممالک اس بازار کے مختلف کوچے ـــــ ہندوستان کو ملک کہنے کے بجائے "ہندوستان بازار" کہہ لیجئے۔ انگلستان کو انگلستان روڈ۔ امریکہ کو امریکن وے۔ روس کو سوویٹ لین۔ چین کو چینی مارکٹ اور جاپان کو جاپان اسٹریٹ کے نام دے لیجئے۔ کوئی فرق نہ پڑے گا۔ وہی بازار کی سی لوٹ مار مچی ہے۔ خرید و فروخت کا شور و غل ہے۔ سودا بیچنے والوں، قوم بیچنے والوں، ملک بیچنے والوں۔ عزت بیچنے والوں کی آوازوں، چیخوں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ انسان کچھ نہیں سوچ سکتا۔ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے، وہ صرف دیکھ رہا ہے ـــــ دیکھ رہا ہے کہ وہ کچھ خرید رہا ہے اور کچھ بیچ رہا ہے۔ وہ کیا خرید رہا ہے

اور کیا بیچ رہا ہے اس کو کچھ نہیں معلوم ——— ! بازار کے شور وغل میں آخر وہ کیا سوچے ——— کیسے سوچے۔ گھر جا کر بھی وہ اپنے نفع نقصان کے بارے میں کچھ نہیں سوچ سکتا۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ تمدن میں زمین کی اتنی قلت ہے کہ ایک کمرے کا کرایہ پچاس روپیہ ہے اور وہی ایک کمرہ اس کا ڈرائنگ روم بھی ہے اسٹڈی روم بھی۔ خلوتکدہ بھی ہے اور جلوتکدہ بھی - وہ سوچنا چاہتا ہے، لیکن بچوں کی چیخ و پکار، بیوی کے شکوے ——— وہ جھلا کر سگریٹ پیتا رہتا ہے۔ اور دھواں اُگلتے ہوئے بڑبڑاتا ہے ——— "اونہہ ——— جو کچھ ہو رہا ہے۔ ہونے دو - ہونے دو ——— دیکھا جائے گا"

لیکن یہ "دیکھا جائے گا" کا دعویٰ بھی فضول ہے - اب تو تابِ نظارہ بھی نہیں آنکھوں میں - یہ دنیا انسان کا مسکن ہی نہیں ہے ——— خداؤں، بادشاہوں اور سوداگروں کی ایک تماشہ گاہ ہے وہ اپنے اونچے اونچے محلوں کی کھڑکیوں سے دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے ہیں کہ بارہ میل لمبی سڑک پر ایک دبلا پتلا مزدور ایک لحیم شحیم مارواڑی کا وزنی اسباب اُٹھائے ہانپتا، کانپتا جا رہا ہے۔ ایک زمیندار ایک کسان کو لاتوں، جوتوں سے پیٹ رہا ہے - ایک باپ طبلہ کی تھاپ پر اپنی بیٹی کو منظر عام پر نچا رہا ہے - ایک خوددار اور مغرور لڑکی بالآخر خود ہی شہر کے لکھ پتی کی خوابگاہ میں داخل ہو رہی ہے۔ کوئی مفلس ماں اپنے بھوکے بچے کا گلا خود اپنے ہاتھوں گھونٹ رہی ہے ——— خدا، بادشاہ اور سوداگر اس مزیدار تماشے سے لطف اندوز ہو کر مسکرانے لگتے ہیں - کیا ظالم مسکراہٹ ہے یہ !

میرا جی چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر چیخنا شروع کر دوں کہ یہ دنیا خداؤں، بادشاہوں اور سوداگروں کی نہیں ہے۔ یہ زمین انسانوں کے لئے بنائی گئی ہے۔ دنیا کو انسانوں کے لئے چھوڑ دو - سان فرانسسکو اور پوٹسڈم کانفرنس کے انعقاد کے بجائے دُنیا کو ایک خلوتکدہ بنانے پر غور کرو -

یہ رجعت کی تلقین نہیں ——— کیونکہ میں آج صبح کے آٹھ بجے سے رات کے بارہ بجے تک دفتر میں کام کرتا رہا ہوں۔ بڑے صاحب کی گھرکیاں، چھوٹے صاحب کی جھڑکیاں سنتا رہا ہوں۔ اب آدھی رات کے اندھیرے میں گھر لوٹا ہوں تو تھکن سے سارا جسم بوجھل ہے۔ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا ہے۔ بوٹی بوٹی دکھ رہی ہے یہی کپڑے اتارے بغیر ہی بستر پر گر کر سو جانا چاہتا ہوں ـ لیکن آدھی رات کو بھی بچے بھوک سے بلک بلک کر رو رہے ہیں بیوی گھٹنوں میں منہ چھپائے بسور رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہاں سے بھاگ جاؤں ——— جتنی دور بھاگ سکوں ——— وہاں، جہاں سناٹا ہو، خاموشی ہو، اندھیرا ہو، فضا میں نیند ہی نیند رچی ہو ——— مجھے ایک خلوتکدہ چاہئے - میں اپنے جسم کی ساری توانائی واپس حاصل کرنا چاہتا ہوں ——— مجھے ایک خلوتکدے کی راہ بتا دو۔ بس اس کے ریشمیں اندھیرے میں لیٹ کر اور آنکھیں بند کرنے سے پہلے یہی سوچوں گا کہ یہ رجعت کتنی حیات بخش اور کس قدر جانفزا ہے ——— !

ابراہیم جلیس (بی-اے)

کھیل

بارش تھی کہ رُکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی، ہم چاروں صبح سے تاش کھیل رہے تھے۔
راحت سہلا چلا، شملا بیگم، بادشاہ ڈالتے ہوئے اچانک میری نظریں شملا کی نظروں سے چار ہوگئیں، ان آنکھوں سے اعتراف شکست جھلک رہا تھا۔ ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے اسنے اپنے کسی فرض سے سبکدوشی حاصل کرلی ہے، لیکن انور کے چہرے پر فتحمندانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی، اس نے غلام ڈالا لیکن ترپ کا۔
میرے دل کو ایک دھکا سا لگا، سر چکرانے لگا، در و دیوار سے یہی صدا آرہی تھی "غلام نے بادشاہ کو کاٹ لیا"
گیا تھا شکار کھیلنے، لوٹا تو اس طرح تڑپتا ہوا جیسے گولی میرے ہی لگی ہو۔۔
آج وہ کلب بھی نہ آئی، میں دیکھنے گیا، وہ پائیں باغ میں آرام کرسی پر لیٹی ہوئی تھی۔ چھوٹی سی میز پر ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ کوئی درد بھری آواز میں گا رہا تھا۔ وہ مجسم سوز بنی ہوئی سننے میں محو تھی۔ میری آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی ناکام سی کوشش کرتے ہوئے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ کر گانا سننے لگا۔ شعر تھا:

زندگی کیا جو زندگی ہی نہیں   ایسے جینے سے موت بہتر ہے

اسکی آنکھ سے آنسو بہ نکلے، میں نے اُٹھ کر ریڈیو بند کر دیا۔ وہ اس طرح چونک پڑی جیسے کسی سوتے ہوئے کو گھبرا کر جگا دیا جائے۔ میں نے رونے کی وجہ دریافت کی۔ معلوم ہوا انور نے بازی جیت لی۔ جج صاحب نے اسے پسند کرلیا۔
"کیا حکومت اپنا نمائندہ بنا کر انصاف کے لئے ایسے ہی لوگوں کو عدالت کی کرسی پر بٹھلاتی ہے جو اپنی اولاد کے ساتھ بھی انصاف نہیں کرسکتے"
میرے دل میں عجیب عجیب خیالات آنے لگے۔
"چلو کہیں بھاگ چلیں جاوید" شملا نے بےچین ہو کر کہا۔ میں اس کے اس بچپن پر مسکرا دیا۔ اچانک میری نگاہیں اُٹھیں۔ اس کی نظروں سے عزم جھلک رہا تھا۔ میں اپنی مسکراہٹ پر بہت پشیمان ہوا جیسے کوئی گناہ کر کے پچھتائے —— بوندیں پڑنے لگیں، اور ہم اُٹھ کر اندر چلے آئے۔
انسان اپنے ہم جنسوں ہی کا خون بہا کر مطمئن نہیں ہو جاتا۔ خون کی باقی ماندہ پیاس غریب جانوروں کے خون سے بجھائی جاتی ہے۔
اس مرتبہ جج صاحب بھی ساتھ تھے اور انور؟۔۔۔ وہ تو اپنا تمام تر وقت انھیں کے ساتھ گزارتا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر درمیان میں جج صاحب تھے۔ ان کے ایک جانب شملا اور دوسری جانب انور تھے

ن میں ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تنہا اگلی سیٹ پر۔ سامنے آئینے میں شملا کا اُداس چہرہ جھلک رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا
ے کہ وہ نظروں ہی نظروں میں مجھے جذب کرے گی ۔ " روکو" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جج صاحب کی چیخ سنائی دی ۔ بے اختیار
ریں نے بریک لگا دیا۔ زبردست جھٹکا لگا دیا۔ زبردست جھٹکا لگا۔ شملا میرے اوپر آ گری میں تڑپ اُٹھا ۔
" وہ دیکھو" جج صاحب نے اُنگلی اُٹھائی۔ چشمے کے کنارے دو ہرن تھے ۔ ایک بیٹھا ہوا دوسرا کھڑا ہوا
ری زبان سے بے اختیار نکل گیا:

" کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ ان " دونوں" کو مار سکیں گے ؟"

جج صاحب لاجواب ہو گئے۔ شملا نے ایک ٹھنڈی سانس لی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فیر ہوا ۔ ۔ ۔ ایک ہرن
یا۔ دوسرا بھاگ گیا ۔ انور بندوق لئے مسکرا رہا تھا ۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ میں اپنے کو بھی انھیں میں
، ایک ہرن سمجھنے لگا ۔ لیکن کونسا ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو زخمی ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا جو بھاگ نکلا وہ ۔ ۔ ۔ ؟ ۔ ۔ ۔
، کا میں فیصلہ نہ کر سکا ۔

گرمیاں شروع ہو چکی تھیں ۔ میں نینی تال آ گیا ۔ یہاں جنگل میں ہمارا ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا ۔ فلسفے کی خشک
ٹھوس کتابیں ہی اب میری ساتھی تھیں ۔ رفتہ رفتہ ان سرد اور بیجان پیپروں میں زندگی کی گرمی محسوس ہونے لگی
انٹ" ۔ " ہیگل" ۔ " نٹشے" میرے بہترین دوست بن گئے ۔

بھیگی ہوئی شام تھی ۔ کئی روز کی مسلسل بارش کے بعد آج سکون ہوا تھا ۔ میرے قدم خود بخود اُٹھ رہے تھے
نک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا ۔ جیسے چینی کے بہت سے برتن ایک ساتھ توڑ دئے گئے ہوں ۔ میں نے نظر اُٹھائی
لسل بارش سے سڑک جگہ جگہ سے کٹ گئی تھی ۔ نیچے سے آنے والی ایک لاری اُلٹ گئی تھی ۔

" قدرت کے مقابلہ میں سائنس کی ایک اور شکست" میں مسکرا رہا ۔ ۔ ۔ لیکن مجھے ان زخمیوں کی آہ و بکا
رف متوجہ ہونا پڑا ۔ یہ انور تھا ۔ کئی جگہ چوٹ آئی تھی ۔ میں اسے رکشا میں ڈال کر گھر لے آیا ۔

آج " انور" میرے رحم و کرم پر تھا ۔ ذرا سی ہمت اور پھر میدان صاف ! ۔۔ لیکن کیا میں ایسا کر سکتا ہوں ؟
ے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے ۔۔۔ " محبت اور فرض کی ٹکر میں فتح ہمیشہ فرض ہی کی ہوتی ہے
ست ہمیشہ محبت ہی کی ہوتی ہے لیکن فرض جیت کر بھی ہار جاتا ہے اور محبت ہار کر بھی سرخرو ہوتی ہے "۔

انور کے کراہتے ہی میں چونک پڑا اور بے اختیار ڈاکٹر کو فون کرنے دوسرے کمرے میں چلا گیا ۔

تاش کا کھیل اب زندگی کا کھیل تھا ، قدرت کی نظروں میں ایک انسانی زندگی کی اتنی بھی تو وقعت نہیں
ن ہماری نظروں میں ایک تاش کے پتے کی ۔

انور اور شملا کی شادی ہو گئی ۔ ایک نئی دُنیا دیکھ کر شملا بھی بہل گئی ۔ لیکن میں ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
زندگی کی تمام مسکراہٹیں دے کر چند آنسو خرید لئے ہیں ۔ " کیا میں اس سودے سے خوش ہوں ؟"
" کیا غلام نے بادشاہ کو کاٹ لیا ؟"

پریمی

مذہب پر ایک نظر

اصطفیٰ اسرسوی صاحب نے اپنے نزدیک بڑی آسانی سے خدا و مذہب کا ابطال کر دیا، اور دل میں بہت خوش ہوں گے کہ "ہیبت ناک طعن، زہر آلود طنز اور خوفناک تشنیع" کا ڈر انھیں کلمۂ حق کہنے سے باز نہ رکھ سکا۔

اس کا ایک الزامی جواب تو یہ ہے کہ جب (بقول اُن کے) انسان اس حقیر کرہ پر رینگنے والے کاربن کا ایک خفیف سا ذرہ ہے تو انسان کی یہ حیرتناک عقل اور سائنس "عقل کل" کے مقابلے ہیں، انسان کی یہ فضا شگاف دوربین اور فلک سیر طیارے "علم کل" کے مقابلے میں کاربن کے خفیف سے ذرے کے رینگنے سے زیادہ کچھ نہیں، پنہائے عالم اور وسعت کائنات پر نظر کر کے سائنس کی تحقیقات کے فیصلوں کو حماقت کے سوا کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ ۔

آپ کہتے ہیں کہ سائنس کی کسی دوربین سے چرخ چہارم اور عرش و کرسی کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن یہ کس نے کہا تھا کہ دوربین سے ان کا پتہ چل سکتا ہے۔ دوربین سے دیکھے جا سکیں تو عرش و کرسی ہی کیا ہوئے۔ ان کی تعریف تو یہ ہے: "وسع کرسیہ السمٰوات والارض"

سمجھیں کُنہ خدا کو کیا ما و شما، ممکن نہیں سائنس بھی ہو راہ نما
ہے ارض و سما پہ چھائی اسکی کرسی حقّا کہ وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُہُمَا

جب یہ کرسی سماوات وارض پر چھائی ہوئی ہے تو سائنس کی دوربین سے دیکھنے سے کیا نظر آ سکتی ہے۔ اسکی نشست گاہ بید کی بنی ہوئی نہیں ہے کہ جالی کا ذرا سا حصہ ہی نظر آ جائے بلکہ نور کی بنی ہوئی ہے۔ یوں سمجھئے کہ خلاء بسیط میں جو ستاروں اور سیاروں کا عالم برپا نظر آتا ہے، یہ اس کرسی کی نشست گاہ کی زینت و آرائش ہے، ستارے ٹکے ہوئے اور جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ ایسی کرسی کے کنارے تو خدا ہی جانے۔

اسی طرح سائنس کی تحقیقات کا یہ فیصلہ بھی ہوا ہے کہ "انسان کے جسم میں کوئی شے روح جیسی موجود نہیں، نہ اس کے وجود کا امکان ہے اور نہ اس کا انسان کے جسم میں کوئی مصرف" روح جیسی کوئی شے تو اسوقت کہی جا سکتی ہے جب روح کی کوئی تعریف متعین اور کوئی حقیقت معلوم ہو۔ لیکن کسی عقل، سائنس، مذہب نے روح کی حقیقت نہیں بتائی۔ حد یہ ہے کہ خود خدائے عز و جل نے بھی بتانی نہ چاہی اور جواب میں فرمایا: "قل الروح من امر ربّی" اس "امر رب" سے زیادہ کوئی سائنس داں اور فلاسفر ایک نکتہ بھی نہ بتا سکا بلکہ ایک نقطہ بھی نہ لگا سکا۔ انسان کے جسم میں روح کا وجود اور مصرف تو بالکل بین و بدیہی ہے۔ زندہ انسان میں کوئی شے تو ہوتی ہے جو مردہ میں نہیں ہوتی

اس کو جان، زندگی، حرکت، قوت، انرجی کچھ تو کہئے گا۔ ایک لفظ روح بھی شامل کر لیجئے تو کیا حرج ہے۔ روح کو مادی شے ہم بھی نہیں مانتے، چڑیا کوئی بھی نہیں کہتا جو قفس جسم میں پھدکتے پھدکتے یکایک اڑجاتی ہو۔

"روح جیسی کوئی شے" کہنے سے آپ کا مقصود روح کے مفروضہ افعال و خواص ہیں، کہ اس کا ایک علحدہ وجود ہے، وہ صاحب ادراک و احساس اور مالک قوت و عمل ہے۔ لیکن یاد کیجئے کہ سائنس کے نزدیک بہترین نظریہ یہ ہے کہ ایک روح اور ایک قوت تھی جس سے حیات اور کائنات کا ظہور ہوا۔ سائنس کو روح انسانی سے ممکن ہے انکار ہو لیکن روح کائنات سے انکار نہیں ہے۔ اسی روح کائنات سے خدا کا تصور پیدا ہو سکتا ہے۔

سائنس کو جسم انسانی کے اندر روح جیسی شے ماننے میں اس وجہ سے تامل ہے کہ اس کے تجربہ میں تمام غیر مادی اشیاء اعراض ہیں اور ہر عرض اپنے وجود کے لئے جوہر کا محتاج ہوتا ہے۔ خود اپنا علحدہ قایم بالذات وجود نہیں رکھتا۔ سائنس کے نزدیک روح بھی اگر ہوگی تو ایسا ہی عرض ہوگی اور مذہب روح انسانی کو عرض نہیں بلکہ جوہر مانتا ہے[1] لہذا سائنس کو اس سے انکار ہے لیکن روح انسانی کو جوہر و قایم بالذات ماننے کے لئے اسی نظریۂ حیات فی الکائنات کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اگر کوئی شے، خواہ وہ روح ہو یا شعور، مستقل فی الوجود اور قایم بالذات نہ مانی جائے گی تو آغاز حیات و کائنات کا کوئی نظریہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہے کہ کوئی ہستی، کوئی قوت، کوئی شعور، کچھ نہ کچھ شے سب سے پہلے اور ہمیشہ سے موجود ہو۔ اب ایک یہ صورت ہو سکتی ہے کہ خود اس شے نے وجود کی مختلف شکلیں اختیار کر لی ہوں، لیکن اس میں چند محالات لازم آتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ شے بجنسہ علحدہ رہی ہو اور موجودات عالم اس سے صادر ہوتے رہے ہوں — اور اگر سائنس نے خلق عالم کے متعلق کوئی رائے قایم نہیں کی، جیسا کہ واقعہ ہے کہ کسی ایک نظریہ پر اتفاق و اطمینان نہیں ہے تو یہ گویا کنہ ذات باری تعالیٰ کی معرفت سے اعتراف عجز و قصور ہے۔ اس کے وجود سے انکار نہیں ہے، اور اگر اس کو انکار کہئے تو بے دلیل ہے۔ اب فرض کیجئے کہ مذہب خدا کو بے دلیل مانتا ہے تو مذہب و سائنس دونوں برابر ہو گئے۔ سائنس کو تفوق پھر بھی نہ رہا۔ اکبر الہ آبادی نے خوب کہا ہے:

خدا کیا ہے؟ خدا ہے، اور کیا ہے

اس کے مقابلہ میں سائنس کا نظریہ یہ ہے:

خدا کچھ ہے؟ نہیں ہے۔ کیوں؟ نہیں ہے

آپ نے سائنس کا یہ فیصلہ بھی بتایا ہے کہ "معجزہ، الہام اور وحی مفروضات ہیں، فطرت کسی برگزیدہ سے برگزیدہ انسان کی خاطر اپنے نظام میں سرمو فرق گوارا نہیں کرتی۔"

لیکن سائنس کو اس فیصلے کا حق اسوقت پہونچتا ہے جب اس کو یہ دعوے بھی ہو کہ اس نے نظام فطرت کے تمام اصول و قوانین کا احاطہ کر لیا ہے اور فطرت عالم و فطرت انسانی دونوں کے تمام دستور عمل اور طریق کار کو دیکھ سمجھ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سائنس کو یہ دعوے نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں اس سے بھی قطع نظر کر کے عرض کرتا ہوں کہ سرے سے یہ بات ہی غلطی سے فرض کر لی گئی ہے کہ معجزہ کے لئے نظام فطرت میں فرق آنا ضروری ہے۔ یہ امر معجزے کی تعریف میں داخل نہیں ہے۔ "معجزہ" کے جو لفظی معنی ہیں، وہی اس کی تعریف ہے۔ یعنی کسی سے ایسا کام ظہور میں آئے

---

[1] مذہب روح کے جوہر و عرض ہونے سے مطلق بحث نہیں کرتا۔ (اڈیٹر)

جس سے دوسرے لوگ عاجز رہیں، پیغمبر سے کبھی ایسا فعل وقوع میں آتا ہے جس کو کوئی غیر پیغمبر کیسا ہی عالم اور باکمال ہو، کر کے نہیں دکھا سکتا۔ لیکن اس میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ کام قانون فطرت کے خلاف ہو۔ چونکہ قوانین فطرت کا مکمل علم انسان کو نہیں ہے اس لئے وہ اپنی عادت کے خلاف کام کو سنت اللہ کی تبدیل و تحویل سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ وہ واقعہ صرف خرق عادت انسانی ہوتا ہے۔ خرق عادت الٰہی نہیں ہوتا۔ اور یہ کچھ ضرور نہیں کہ اللہ تعالیٰ کوئی عجیب واقعہ ظہور میں لائے تو اس کی تکرار بھی کیا کرے، ہو سکتا ہے کہ ایک کام حیات عالم میں ایک ہی بار عمل میں آئے، پھر کبھی نہ آئے۔ بغیر ماں باپ کے صرف ایک مرد اور ایک عورت کی تخلیق ہوئی ہے اور یقیناً ہوئی ہے اور یقیناً ہوئی ہے سائنس کو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے کہ ضرورت نہ تھی۔ بغیر باپ کے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو یقیناً پیدا ہوئے ہیں، اس میں کوئی شبہ و شک نہیں، ممکن ہے اور بھی کوئی اس طرح پیدا ہوا ہو۔ آج کل امریکہ کے ڈاکٹر مادۂ حیات کو مرد سے لے کر عورت کے شکم میں ڈال دیتے ہیں اور بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہاں کسی مادہ سے نہیں بلکہ صرف روحانی قوت سے بچہ پیدا ہوا تھا۔ یہ گُر ابھی سائنس کے ہاتھ نہیں آیا ہے۔

مُردے کا زندہ ہونا بار ہا عمل میں آیا ہے اور آج بھی ڈاکٹروں کو اس کا دعویٰ ہے، روح، خیال اور نظر کی قوت سے سلب مرض آجکل روحانی لوگوں میں بھی ہوتا ہے اور اہل سائنس و فلسفہ بھی اس کے منکر نہیں ہیں، انسان خود اپنی روحانی و خیالی قوت سے اپنے اوپر مرض طاری اور اپنے مرض کو دفع کر سکتا ہے۔ ڈاکٹروں کا تجربہ و مشاہدہ اور طب و سائنس اس کے شاہد ہیں۔

بات یہ ہے کہ دنیا میں نظام جسمانی و مادی کے ساتھ نظام روحانی بھی قائم ہے اور روح کے بعض کرشمے مادہ کی کارفرمائیوں سے زیادہ حیرتناک ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی خواب کے اندر تین منٹ میں وہ تماشے نظر آجاتے ہیں جو سنیما کے پردے پر تین گھنٹے میں نظر نہیں آتے۔ خواب میں آیندہ واقعات نظر آتے ہیں اور بیداری میں ویسا ہی پیش آتا ہے آج تک خواب کا بھید کسی فلسفی و سائنسداں کو نہیں کھُل سکا۔ واہمہ کا خلاق ہونا بدیہی بات ہے۔ نظر کا دھوکا جانی پہچانی چیز ہے۔ "دل را بدل رہیست" مسلم امر ہے۔ مسمریزم۔ ہپناٹزم وغیرہ کا عمل و معمول مشاہدات ہیں۔ ایک شخص اپنی نظر اور خیال اور ارادے کی قوت سے اپنے دل کی بات دوسرے کے دل میں ڈال دیتا ہے اور یہ معمولی آدمیوں، ماوشما کی قسم کا حال ہے۔ پھر اگر ایک پاک نفس اور روشن ضمیر انسان دوسروں کے دل کا راز سمجھ لے اور بتادے تو اس میں کیا استبعاد ہے۔ یا اپنی روحانی قوت سے کسی کے خیال اور ارادے کو بدل دے یا کسی مرض کو دور کر دے یا کسی ارضی و سماوی مصیبت کو ٹال دے، یا آیندہ واقعات کی پیشین گوئی کر دے، یا دور بیٹھے کسی حادثہ پر مطلع ہو جائے تو اس سے انکار کیوں کیا جاتا ہے؟

کم سے کم تیس برس ہوئے ایک صاحب نے کسی کتاب میں دیکھا ہوا یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا تھا کہ جس زمانہ میں کورو پانڈو کی لڑائی ہو رہی تھی اور کرشن جی اس میں شریک تھے، ایک دن کرشن جی اپنی جگہ پر نظر نہ آسکے، لوگوں نے ڈھونڈا تو دیکھا کہ جنگل کے ایک گوشے میں مہاراج ٹہل رہے ہیں۔ چہرہ متغیر ہے، پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ لوگ حیران ہوئے لیکن پاس ادب سے مخاطب نہ کر سکے، الگ کھڑے رہے۔ کرشن جی گھنٹوں اسی طرح ٹہلتے رہے، پھر یکایک ٹھہر گئے

اطمینان کا سانس لیا اور چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ اسوقت لوگ آگے بڑھے اور حال پوچھا۔ انھوں نے فرمایا کہ اسوقت خدا کا ایک پیارا بندہ سخت مصیبت میں مبتلا تھا۔ مجھے اس کی حالت سے پریشانی تھی، شکر ہے کہ اس کو دشمنوں سے نجات مل گئی ۔ کتاب والے نے لکھا تھا کہ وہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھا جب وہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو لیکر مصر سے روانہ ہوئے ہیں۔ فرعون مع اپنے لشکر کے تعاقب میں چلا ہے۔ دریا میں حضرت موسیٰ کے لئے راستہ بن گیا ہے اور فرعون مع اپنے لشکر کے غرق ہو گیا ہے۔

اس کتاب کا یہ بیان کچھ متحقق نہیں ہے۔ اس طرح کے واقعات اسلامی بزرگوں کے بھی مجھے یاد ہیں۔ لیکن میں نے محض ندرت واقعہ کی وجہ سے اس کو بطور مثال کے لکھا ہے۔ یہ تو بڑے آدمیوں کی باتیں ہیں جن کی صفائے روح کے لئے اس سے بڑھکر مکاشفات بھی عجیب و مستبعد نہیں۔ میں اپنا ایک مشاہدہ بیان کرتا ہوں۔ پانچ چھ مہینے کا ذکر ہے فروری یا مارچ ۴۵ء میں ایک بچہ سات آٹھ برس کا اپنے بڑے بھائی کے ساتھ بائسکل پر بازار جاتا ہے۔ اس کی ماں شہر و بازار سے تین میل کے فاصلے پر اپنے گھر میں ہے۔ شام کو یکایک ماں کے دل میں القا ہوتا ہے کہ لڑکا بازار میں بائسکل پر سے گرے گا۔ کسی تانگے کے نیچے دب جائے گا اور رضائی میں لپیٹ کر گھر لایا جائے گا۔ اسی وقت یہ حادثہ پیش آتا ہے کہ آگرہ کے تنگ بازار میں بائیسکل لڑکھڑاتی ہے۔ بچہ گرتا ہے، پیچھے سے ایک بھرا ہوا تانگہ تیزی سے آتا ہے اور بچے کی دونوں رانوں پر سے اس کا ایک پہیہ گزر جاتا ہے۔ اس میں اللہ تعالےٰ کا یہ فضل و کرم شامل ہوتا ہے کہ جب بازار کے لوگ دوڑ کر بچے کو اُٹھاتے ہیں تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ چوٹ لگتی ہے لیکن ہڈی پر ضرب بھی نہیں آتی حالانکہ بچہ نہایت لاغر و ضعیف ہے، وہاں سے دو فرلانگ پر ایک عزیز کا مکان ہے۔ وہاں تک بچہ پیدل چلا جاتا ہے۔ رات کی خنکی کے سبب سے وہاں سے رضائی اُڑھا کر بچے کو تانگے میں گھر لے آتے ہیں۔ مالش کرنے اور سینکنے سے ایک دو روز میں ورم اُتر جاتا ہے اور بچہ بے تکلف چلنے پھرنے لگتا ہے۔

ایک اور مشاہدہ سنئے، میرے حقیقی بھائی مولوی عابد حسن صاحب فریدی ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ کا انتقال ۲ / مئی ۱۹۴۵ء کو ہوا ہے۔ ان کو پانچ چھ مہینے پہلے دسمبر ۱۹۴۴ء میں خود یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اب عمر تھوڑی ہی باقی ہے، حالانکہ بالکل تندرست تھے۔ انھوں نے اپنے پھیلے ہوئے کام سمیٹنے اور نپٹانے شروع کر دئے جب ان سے کہا جاتا کہ اس کام کی اتنی کیا عجلت ہے، بہت وقت پڑا ہے تو کہتے کہ اب رہ گیا تو رہ ہی جائے گا۔ آخر اپریل میں بیمار ہوئے، بخار تھا، سول سرجن کا علاج ہوا۔ دس روز پہلے جو ڈاکٹر دیکھنے آئے تو انھوں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب آپ نے کیا دیکھا، ڈاکٹر نے کہا کوئی مرض نہیں ہے۔ بخار معمولی ہے، صرف ضعف ہے، کہنے لگے ڈاکٹر صاحب آپ کچھ کہیں میں تو اپنے لئے کچھ اور فیصلہ کر چکا ہوں۔ مرنے سے چھ روز قبل دو ڈاکٹروں اور دو حکیموں نے دیکھا اور کوئی مایوسی کا اظہار نہیں کیا لیکن مریض نے اسی دن اپنے اہل و عیال کو اپنے مرنے کا دن بتا دیا اور پھر بڑے اطمینان کے ساتھ اسی دن رخصت ہو گئے۔

اس پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایران میں زمانۂ حال کا ایک نابینا شاعر تھا فصیح الملک شوریدہ شیرازی۔ اس نے انتقال سے ایک مدت قبل اپنی لوح مزار کے لئے ایک طویل قطعہ تاریخ کہا تھا۔ آخری شعر میں بتا دیا تھا کہ ربیع الثانی

۱۳۴۵ھ میں انتقال ہوگا۔ دوسرے مصرع سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ وہ مقطع یہ ہے:

سال نو ختم بہ ربیع دوم این مصرع گشت
شدہ شوریدہ بجاں جانبِ مشانِ رحیم
۱۳۴۵ھ

میں اصطفےٰ صاحب اور ان کے سائنس سے پوچھتا ہوں کہ یہ کارپردازیاں روح کی نہیں تو کس کی ہیں؟ کیا سائنس و فلسفہ کے کسی اُصول سے ان کی تاویل و تشریح کی جا سکتی ہے؟ - اب ایک دوسری قسم کی روحانی قوت دیکھئے اپنی آنکھوں دیکھی کہتا ہوں۔ چند سال ہوئے میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر تھا کہ کسی گاؤں کے دو شخص میاں بیوی آئے۔ اور انھوں نے بیان کیا کہ اس گاؤں کا نمبردار بڑا ذی اثر ہے اور عیاش بھی ہے۔ اس نے اس عورت کو حاصل کرنے کی مختلف تدبیریں زور و زر سے کیں۔ لیکن ناکام رہا اور ان میاں بیوی کا دشمن ہوگیا۔ اب اس نے کسی عامل سے حب کا عمل کرایا ہے اور کسی ترکیب سے عورت کو پانی پلوا دیا ہے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ عورت کا دل شوہر کی طرف سے پھر گیا اور بے اختیار اس شخص کی طرف مایل ہوگیا۔ عورت پاکدامن تھی، اس نے یہ کیفیت پیدا ہوتے ہی شوہر سے سب حال بیان کر دیا اور کہا کہ مجھے اس گاؤں سے باہر لے چلو۔ ورنہ میں اپنے قابو میں نہیں ہوں، تم کو چھوڑ کر اس کے پاس چلی جاؤنگی کوئی طاقت مجھے اس کی طرف کھینچ رہی ہے۔ شوہر نمبردار اور گاؤں والوں سے ڈرتا تھا کہ بھاگتے ہوئے پکڑ لیں گے تو زیادہ ستائیں گے۔ رات کو جب شوہر سو گیا تو بیوی آدھی رات کو گھر سے نکل کر سیدھی نمبردار کے گھر جا پہونچی۔ اسکا دروازہ بند تھا۔ دیر تک کھڑی رہی۔ اتنے میں شوہر کی آنکھ کھُلی اور بیوی کو غائب پایا تو دوڑتا ہوا نمبردار کے مکان پر پہونچا۔ بیوی دروازہ پر کھڑی تھی۔ اس کو زبردستی کھینچتا ہوا لے آیا۔ بیوی نے کہا کہ خیریت اسی میں ہے کہ اسی وقت گاؤں سے نکل چلو ان کا ایک چھوٹا سا بچّہ بھی تھا۔ بچّہ کو مکان میں تنہا چھوڑ کر بغیر کوئی سامان لئے دونوں چپکے سے نکل گئے۔ اور قریب کے اسٹیشن پر جا کر ریل میں سوار ہوگئے۔ ریل میں کسی سے ان بزرگ کا حال معلوم ہوا اور یہاں آ گئے۔ بیوی نے بیان کیا کہ ریل میں تمام راستے میری یہ کیفیت رہی اور اب بھی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ سیدھی اسی گاؤں اور نمبردار کے پاس چلی جاؤں، ہر وقت اس کی صورت آنکھوں کے سامنے ہے اور وہ اشارے سے بلا رہا ہے۔ میں دل پر سخت جبر کر رہی ہوں ان بزرگ پیر صاحب نے فوراً کورے برتن میں پانی منگا کر کچھ پڑھ کر پھونکا اور عورت کو دیا۔ اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے پیتی رہو۔ رات کو وہ دونوں وہاں رہے۔ صبح کو میں نے ان سے حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ کیفیت بالکل رفع ہوگئی عورت نمبردار کو گالیاں دے رہی ہے اور اپنے بچّے کے لئے رو رہی ہے۔ پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ حال بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اب تم گاؤں جاؤ۔ تمھارا بچّہ پڑوسیوں کے پاس محفوظ ہے۔

اب ایک پیشین گوئی کی عجیب مثال دیکھئے۔ پیشین گوئی ایک تو علم نجوم اور رمل و جفر کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ جیسے ایک پنڈت مہارشی کھونڈے نے ۱۹۴۲ء کے آخر میں اعلان شایع کرا دیا تھا کہ ۱۹۴۵ء میں ہٹلر اقدام خودکشی کرے گا اور جرمنی کو شکست ہو جائے گی اور ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اور ایک پیشین گوئی کشف روحانی سے ہوتی ہے۔ ایک عرصہ کا واقعہ ہے لیکن دیکھنے والے اور تصدیق کرنے والے ابھی زندہ ہیں۔ پنجاب میں ضلع گورداسپور کا

ایک مرتد شخص اسلام کا نام لیکر دین اسلام میں کئی سال سے فتنے پیدا کر رہا ہے۔ صدہا گمراہ ہو جاتے ہیں۔ آخر کار مئی ۱۹۰۸ء میں (یا شاید ۱۹۰۹ء تھا۔ مجھے اس وقت اپنی ڈائری نہیں ملی کہ سال کا تعین یقینی ہو سکتا) مسلمان اس سے مناظرہ کرنے کے لئے لاہور میں جمع ہوتے ہیں۔ وہ مقابلے میں نہیں آتا۔ جمعہ کے روز بعد نماز جمعہ ایک بزرگ مسجد بیگم شاہی لاہور میں تقریر کرتے ہیں اور اس بیدین کو چیلنج دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میری عادت پیشین گوئی کرنے کی نہیں ہے لیکن آج کہتا ہوں کہ وہ شخص فتنہ پردازی و رخنہ اندازی چھوڑ دے۔ اس کو تین روز کی مہلت دیتا ہوں۔ اس عرصہ میں توبہ کر لے ورنہ نہایت ذلت کی موت مرے گا۔ ہفتہ، اتوار، پیر، تین دن گزرتے ہیں۔ وہ شخص ارتداد و بیدینی پر اڑا رہتا ہے۔ منگل کے روز بیمار ہوتا ہے۔ غلاظت بجائے صحیح راستے کے منہ کی راہ سے نکلتی ہے اور اسی روز مر جاتا ہے۔ اس مرض اور موت کو اتفاق کہہ سکتے ہیں، لیکن تحدی اور پیشین گوئی کے بعد محض اتفاق نہیں رہتا بلکہ انباء الغیب میں شامل ہو جاتا ہے۔

ان مثالوں کو طول ہو رہا ہے۔ لیکن میں صرف وہ واقعات لکھ رہا ہوں جو تاریخی صداقت و ثبوت رکھتے ہیں اور جن کے لئے آج گواہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً اوپر کے آخری واقعہ کے متعلق میں بیٹھا ہوا لاہور کے ایسے زندہ و موجود آدمیوں کے نام بتا سکتا ہوں جو عینی شاہد ہیں اور جن کے عادل و ثقہ ہونے پر سارا لاہور گواہ ہے۔ اب ایک دو واقعات ان سے عجیب تر روحانی قوت کے سنئے۔

ایک صاحب کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے اور اس کے ایک پاؤں میں کجی ہوتی ہے۔ ان کو بڑا صدمہ ہوتا ہے کہ اب یہ عمر بھر معذور رہے گا۔ کچھ عرصہ بعد ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ حضرت کئی لڑکیوں کے بعد آپ کی دعا سے لڑکا ہوا تو اس کا ایک پاؤں ٹیڑھا ہے۔ وہ بزرگ یہ سنکر ذرا تامل کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کیا کہا "ٹیڑھا ہے؟ ٹیڑھا ہے!" یہ الفاظ ذرا زور اور سختی سے کہتے ہیں اور کہتے میں اپنے ہاتھ کو موڑتے ہیں وہ صاحب کئی روز حاضر خدمت رہ کر اپنے شہر کو واپس چلے جاتے ہیں۔ گھر پہونچتے ہیں تو بیوی دیکھتے ہی کہتی ہے کہ ننھے کا پاؤں سیدھا ہو گیا ان کو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ دیکھتے ہیں تو واقعی پاؤں کو بالکل اصلی حالت میں پاتے ہیں۔ بیوی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی دن اور وقت تھا جب ان بزرگ نے تیس میل کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے وہ الفاظ فرمائے تھے۔ ابھی تک وہ بچہ جوان ہے اور اس کے ٹیڑھے پاؤں کو دیکھنے والے اب بھی متعدد مرد و زن موجود ہیں۔

اس سے زیادہ حیرت ناک کرشمہ ملاحظہ ہو۔ ایک فوجی سپاہی رات کے وقت زخمی ہو کر فوجی شفا خانہ میں داخل ہوتا ہے اور اس کی مرہم پٹی کر دی جاتی ہے۔ رات کے دو بجے اس فوج کا کپتان خواب دیکھتا ہے کہ ایک بوڑھے مسلمان آدمی سرخ ریش سفید عمامہ باندھے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ فلاں نام اور نمبر کا سپاہی تمہارے شفا خانے میں زخمی پڑا ہے، اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے جو صحیح نہیں بٹھائی گئی۔ وہ سخت تکلیف میں ہے۔ اس کی فوراً خبر لو۔ کپتان کی آنکھ کھلتی ہے اور ایسا متاثر ہوتا ہے کہ اسی وقت شفا خانے پہونچتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ مریض نہایت اذیت و کرب میں مبتلا ہے، ڈاکٹر کو بلاتا ہے اور اپنے سامنے دوبارہ آپریشن کرا کے اطمینان کرتا ہے اور پھر مریض سے خواب حال کہتا ہے اور خواب والے بزرگ کا حلیہ بتا کر پوچھتا ہے کہ تم اس آدمی کو جانتے ہو، وہ کہتا ہے کہ وہ میرے پیر و مرشد ہیں۔

یہ واقعہ ہندوستان سے باہر کا ہے اور وہ پیر صاحب ہزاروں میل کے فاصلے پر ہندوستان میں ہیں۔

اس بیسویں صدی میں میرے علم و تحقیق میں میرے دیکھے ہوئے ایسے لوگ گزرے ہیں جو پیٹھ کے پیچھے بھی ایسا ہی دیکھتے تھے جب منھ کے سامنے دیکھتے تھے، گویا سر میں دو آنکھیں پیچھے بھی لگی ہوئی تھیں اور میرے لئے یہ ایسی حقیقت ہے کہ گویا وہ نہیں میں دیکھتا تھا۔ ایک بزرگ کی یہ کیفیت چھ مہینے رہی تھی۔ اب اصطفےٰ صاحب مع اپنے تمام جنود منکرین کے ایک طرف اور میں ایک طرف۔ وہ سب "سائنس کا جامہ" پہن کر آئیں تو بھی میں نہ مانوں گا۔ بات یہ ہے کہ اصطفےٰ سرسوی صاحب ہوں یا نیاز فتحپوری صاحب یا ان جیسے اور احباب، ان کا انکار ان کی ذاتی تحقیق کی بنا پر نہیں ہے۔ یہ سب سائنس کی دوربین سے دیکھتے ہیں اور یورپ کے دماغ سے سوچتے ہیں، لیکن بجائے خود کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کا یہ یقین محض ایمان بالغیب ہے سائنس و فلسفہ پر۔ مجھے کوئی بتائے کہ ان حضرات منکرین نے سائنس و فلسفہ کے مطالعہ اور تجربات و مشاہدات میں کتنی عمر صرف کی ہے اور میں ان کے مقابلے میں ایک شخص کو پیش کرتا ہوں جس کا بذات خود محقق و عالم فلسفہ ہونا مسلم حقیقت ہے۔ یعنی ڈاکٹر اقبال۔

ڈاکٹر اقبال کے متعلق ایک مضمون میں مولوی ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

"یہ شاید کسی کو نہیں معلوم کہ انھوں نے (اقبال نے) اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسول عربی کے قدموں میں ایک متاع حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا۔ حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں، پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں، اور پہلو بدل بدل کر تاویلیں کرنے لگتے ہیں، یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا۔ اور ایسی کوئی حدیث سن کر ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب ثلاثہ (حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم) کے ساتھ کوہ اُحد پر تشریف رکھتے تھے اتنے میں اُحد لرزنے لگا اور حضور نے فرمایا ٹھہر جا تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے اس پر پہاڑ ساکن ہو گیا۔ اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا اس میں اچنبھے کی کونسی بات ہے؟ میں اس کو استعارہ و مجاز نہیں بالکل ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس کے لئے کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ اگر تم حقایق سے آگاہ ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے آکر مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اُٹھتے ہیں، مجازی طور پر نہیں واقعی لرز اُٹھتے ہیں"

(جوہر کا اقبال نمبر)

لیکن یہ بات مقلدان یورپ اور معتقدیان سائنس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اگرچہ ان میں سے کتنوں کی سمجھ میں وہ بات بھی نہیں آئی ہے جو سائنس سمجھتا اور کہتا ہے۔ یہ بھی ابھی تصدیق بالقلب تک نہیں پہونچے، صرف اقرار باللسان کے درجے میں ہیں اور اس فرق کو نہیں دیکھتے کہ سائنس نے روح سے قطع نظر کر کے مادّہ پر ہمت صرف کی اور بہت کچھ اس کو فتح کر لیا اور برابر تسخیر کرتا جاتا ہے، لیکن ان حضرات نے روح سے انکار کر کے مادّہ کے متعلق کیا انکشافات کئے۔ دین نہ سہی دنیا کیا کمائی۔ مگر بات تو یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو اہل الرائے قائد قوم اور مصلح ملت بھی تو گردانتے ہیں۔ یہی مغالطہ ہمارے سرسید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ کو پیدا ہو گیا تھا۔ یورپ کے لپیٹ اور دانشوروں کے پھیر میں ایسے آئے کہ صرف معجزات اور بعض دوسرے عقاید و اعمال کی

تردید کے لئے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے بیٹھ گئے۔ بھلا کوئی پوچھے کہ آپ کہاں کے محقق و مجتہد محدث و فقیہ اور عالم زبان و ادب تھے کہ تحویل کلمات اور تاویل آیات کا حوصلہ کر بیٹھے۔ میرے نزدیک جب تک کوئی شخص کم از کم ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم کے برابر ادب و زبان عرب کا ماہر و عالم نہ ہو، اس کو کلام اللہ کے ترجمہ و تفسیر کا حق نہیں پہونچتا۔ یوں ترجموں اور تفسیروں کی نقل کرنے اور مکھی پر مکھی مارنے کی اور بات ہے۔ سرسید نے ایک سرے سے تمام معجزات قرآنی کا انکار کیا ہے اور ان کی مضحکہ خیز تاویلیں کی ہیں، محاورۂ عرب کے خلاف معانی لیکر مطلب کچھ کا کچھ کر دیا ہے، اور اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ نئی روشنی کے نوجوان مسلمان تعلیم قرآن کو خلاف عقل نہ پائیں گویا قرآن حکیم موم کی ناک ہے جیسے چاہیں توڑ موڑ کر بنا دیں۔

خیر سرسید کو چھوڑئے۔ مجھے علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی پر تعجب آتا ہے کہ انکی غرض و غایت تو وہ نہ تھی "سیرت النبی" میں مغرب و مشرق کی مرضی ڈھونڈھنی نہ تھی۔ تحقیق کرنی تھی۔ لیکن معجزات ان بزرگوں کی سمجھ میں بھی نہ آسکے۔ سید سلیمان ندوی صاحب نے "سیرت" کی تیسری یا چوتھی جلد میں معجزات نبوی سے بحث کی ہے۔ سائنس کی تحقیقات پر طویل مقالہ کسی سے لکھوا کر شامل کیا ہے عقل و نقل سے معجزات پر روشنی ڈالنی چاہی ہے لیکن خود تاریکی میں تھے اس لئے ظلمت ہی چھائی رہی اور معجزات سے انکار ہی میں نجات نظر آئی۔ عجیب بات ہے کہ علامہ ندوی دلیر و جری ہوکر یہ نہ فرماسکے کہ جو معجزات نبوی احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں وہ بلاشبہ برحق ہیں خواہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، سائنس انکی تصدیق کرے یا نہ کرے۔ عقل و سائنس سمجھنے سے عاجز ہیں تو یہ ان کا اپنا قصور و نقصان ہے اور انکار کرتے ہیں تو انکی حماقت ہے کہ اپنی رسائی سے باہر شے کا انکار کرتے ہیں۔ نامعلوم شے کے وجود سے انکار کا کیا حق ہے۔

سرسید اور ان کے رفقاء نے معجزات کی طرح دوسرے احکام و اعمال اسلامی و قرآنی سے بھی انکار کیا ہے اور ان کی تاویلیں کی ہیں۔ مثلاً غلام بنانا۔ لونڈی سے بغیر نکاح کے تمتع حاصل کرنا۔ اشاعت اسلام کے لئے کفار سے جہاد کرنا وغیرہ۔ اور بعد کے زعمائے ملت خصوصاً ہندوستان کے علماء و غیر علما لیڈروں نے تو یہاں تک احکام اسلام سے سرتابی اور الہام قرآن کی خلاف ورزی اختیار کی کہ اعلان کر دیا اور چھاپ دیا کہ ہندوستان کے مسلمان بچوں کو یہ نہ سمجھاؤ کہ تمام مذہبوں میں صرف ایک اسلام ہی سچّا مذہب ہے اور سب مذاہب باطل ہیں۔ بلکہ یہ بتاؤ کہ تمام مذاہب سچے ہیں اسلام کو کوئی فضیلت نہیں۔ حالانکہ مسلمان بچّے کو سب سے پہلے یہی بات سمجھانی ضروری ہے کہ صرف تمہارا مذہب سچّا اور خدائی مذہب ہے اور صرف تم حق پر ہو۔ باقی تمام مذاہب و اہل مذاہب باطل و گمراہ ہیں۔

یہ مسئلہ اس قدر صاف قطعی، اور عقلی ہے کہ اس میں معجزہ اور روح کی سی پیچیدگی بھی نہیں، محسوسات و مادیات سے تعلق رکھتا ہے۔ تاریخ عالم اور حقایق فطرت پر مبنی ہے۔ ہاں اس کو سمجھنے کے لئے اسلام و پیام اسلام کی روح کو سمجھنا ضروری ہے۔ میں تمام تفصیلات و جزویات کو چھوڑ کر خلاصہ بیان کئے دیتا ہوں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی ازل سے یہ مرضی تھی کہ تمام دنیا میں ایک دین فطرت اور خدائے واحد کی پرستش جاری ہو، ورنہ امن عالم قائم نہیں رہ سکتا اور اسی وجہ سے دنیا میں امن نہیں ہے[۱]۔

(۲) تمام انبیاء و رسل اور مذاہب و ادیان از آدم تا ایندم یہی غرض و غایت لیکر آئے ہیں۔

(۳) جب دوسرے مذاہب ناکافی ثابت ہوئے تو آخر میں اعلاء کلمۃ الحق اور اشاعت دین فطرت کی خدمت اسلام کو

[۱] لیکن دنیا میں ... خدا کی یہ مرضی پوری نہ ہوسکی۔ (اڈیٹر)

پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سپرد کی گئی۔

(۴) اسلام اسی سلسلۂ دین الٰہی کی صرف ایک آخری کڑی ہے۔ مسلمان خدا کا دین پھیلانے کے لئے صرف خدا کی ایک نامزد کردہ قوم ہے۔ مسلمان صرف خدا کے نمایندہ اور اس کے پیغام کے علمبردار ہیں۔

(۵) یہ قانون فطرت اور اصول حیات ہے کہ کسی نمایندہ کی ذات اور قومیت بظاہر نمایاں ہوا کرتی ہے۔ کسی شخص یا قوم کا کوئی نہ کوئی نام ہونا لازم ہے۔ اسلام اور مسلمان بھی صرف ایسے ہی نام ہیں۔

(۶) بالفرض جس مذہب و قوم کا نام اسلام و مسلمان ہے اور جس کا نزول عرب میں ہوا، وہ یورپ، افریقہ یا ہندوستان میں ہوتا اور اس کا کوئی اور نام ہوتا (اگرچہ یہ فی الحقیقت فرض محال ہے) تو وہی مذہب و قوم خدا کے آخری نمایندہ و نائب و علمبردار ہوتے۔ یا مثلاً یہودیوں یا عیسائیوں پر سلسلۂ پیام و الہام ختم ہوتا تو ایک ہی بات تھی۔ وہی آج کے مسلمانوں کی جگہ ہوتے۔

(۷) مسلمانوں کی اشاعت اسلام سے اپنی کوئی غرض و غایت مقصود نہیں ہے۔ ان کو حجازی، افریقی یا ہندوستانی ہونے کی قومیت اور سفید و سیاہ ہونے کی حیثیت پیش نظر نہیں ہوتی۔ ان کو اپنا بول بالا کرنا مطلوب نہیں ہے خدا کا نام بلند کرنا مقصود ہے۔

(۸) اگر خدا کا یہ حکم ہے کہ کفار و مشرکین سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین خالص اللہ کا قایم ہو جائے تو مسلمانوں کو اس حکم کے بجالانے میں کوئی باک و دریغ نہیں۔ علم جہاد کے ساتھ ان کا سر بھی دنیا کے سامنے بلند ہے ان کو کسی کے آگے شرم سے گردن جھکانے کی ضرورت نہیں۔ آنکھیں نیچی کرنے کی حاجت نہیں۔ وہ مشرق و مغرب اور تمام عالم سے نظر ملا کر کہہ سکتے ہیں کہ ہم خدا کی زبان اور خدا کا ہاتھ ہیں۔ ہم لشکر خدائی کے علمبردار اور سپہ سالار ہیں، ہمارے لئے شکر و فخر کا موقع ہے کہ دین حق کو تمام ادیان پر غالب کرنے کا منصب جلیل جو کسی نہ کسی قوم کو عطا ہی ہونا تھا اس پر ہم کو فائز کیا گیا۔ الحمد للہ کہ ہم کو اس دین کا شرف بخشا گیا جس کے متعلق دنیا کو سنا دیا گیا ہے کہ دین اللہ کے نزدیک صرف ایک اسلام ہی ہے۔ اسلام کے سوا جو دین اختیار کیا جائے گا، اللہ کو ہرگز قبول نہ ہوگا۔

(۹) مسلمان ان لوگوں کی حماقت اور خبث باطن پر ہنستے ہیں جنھوں نے اسلام کو بزور شمشیر پھیلانے کا طعنہ و اعتراض تراشا ہے۔

سر سید اور ان کی سی عقل و فطرت والے اس نکتے کو نہ سمجھ سکے اور جہاد اسلام کی تہ تک نہ پہونچے۔ مغرب و مشرق کے اعدائے اسلام سے مرعوب ہو کر جہاد کی تاویلیں کرنے لگے یا انکار کر بیٹھے۔

یہ مضمون بطور جملۂ معترضہ کے میرے ذہن میں آیا تھا لیکن بڑھتے بڑھتے صفحات معترضہ تک پہنچ گیا۔ معجزہ کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ لیکن اصطفےٰ سرسوی صاحب کے مضمون کی بعض باتیں باقی ہیں جن پر کچھ کہنا ہے۔ بالفعل "باقی دارد" کہکر بخوف طوالت اس تحریر کو ختم کرتا ہوں۔ مدیر و ناظرین نگار چاہیں گے تو باقی بھی لکھ دوں گا۔

حامد حسن قادری

(نگار) فاضل مقالہ نگار نے، اپنے مضمون میں کوئی نئی بات نہیں لکھی، کورانہ تقلید نے ہمیشہ یہی لوگوں سے کہلوایا ہے اور کہلوائے گی تاہم آیندہ اشاعت میں اس کا تبصرہ پیش کیا جائے گا۔

شبلی کا جرمِ محبت

اور

سلیمان ندوی

۴۶ دار المصنفین اعظم گڑھ مورخہ ۲۱ مارچ ۴۲ء

مکرم — السلام علیکم

یاد ایام کی اصل اور کاپیاں واپس مرسل ہیں

میں دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے مولانا شبلی کے حال میں غایتِ بے تکلفی سے بعض ایسے واقعات نقل کئے ہیں جو احباب کے لئے اور وہ بھی زمانۂ شباب کے لئے ہوتے ہیں۔ "دورِ جوانی انتر چناں کہ تو دانی"۔ مگر اب وہ اواخر عمر میں ایک مقدس کام کے بانی ہوئے ان کا تذکرہ کرنا اور لکھنا بالکل نامناسب ہے گناہ کا ستر چاہئے نہ کہ تشہیر اس لئے ازراہ عنایت بلکہ اس دوستی کے واسطے سے جو آپ کو مولانا مرحوم سے تھی یہ عرض کرتا ہوں کہ ان واقعات پر پردہ ڈال دیجئے تاکہ ان کا نام نیک ضائع نہ ہو اور یوں بھی عیب و گناہ کا برملا اظہار اور فخر مسلمان کے لئے زیبا نہیں۔ والسلام — سید سلیمان

آپ کا یہ فرمانا کہ عطیہ بیگم کی علمی قدر دانی نے مولانا کی فارسی شاعری میں نئی روح پھونک دی تھی بالکل غلط واقعہ ہے۔ غزلوں کا آغاز ۱۹۰۵ء سے ہوا ہے اور خطوط و ملاقات کا سلسلہ ۱۹۰۸ء سے ہے۔

منقولہ بالا خط علامہ سید سلیمان ندوی کا یاد ایام کے مولف کے نام ہے، وہ واقعات جو گناہ کی حد تک ہیں خدا جانے کیا ہیں اور اچھا ہے کہ مستور رہیں لیکن جو واقعات کہ مشہور عام ہیں ان میں مغالطہ دہی کیا معنی، پھر انسان کی زندگی میں اگر برے واقعات ہوں تو بھی سوانح نگار کا فرض اور دیانت کا اقتضا ہے کہ ان کو صحیح طور پر لکھے نہ کہ دوستی کے واسطے دلا کر دوسروں کو چھپانے پر مجبور کرے۔

اس خط میں مکتوب الیہ کو کس قدر دلیری کے ساتھ مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کی ہے، غزلوں کا آغاز درحقیقت ۱۹۰۶ء میں ہوا خود حیات شبلی میں مصنف نے لکھا ہے کہ:

"بمبئی میں قیام کی غرض سے مولانا کا یہ سفر بمبئی پہلا تھا اور یہی دستہ گل کی عطر بیزی و مشام پروری کا زمانہ تھا۔ دستہ گل کی ابتدائی غزلیں اسی موسم بہار کے پھول ہیں۔ ۱۹ برس کے بعد غزل کا کوچہ یاد آیا تھا"

سنہ ۱۹۰۲ء سے اپریل سنہ ۱۹۰۶ء تک مولانا ندوہ کے خشک اور بدمزہ کاموں میں مصروف رہے جابجا دورے کئے بنارس میں شاندار اجلاس اور علمی نمائش کا انعقاد کیا برسات کے موسم میں بمبئی گئے، (ملاحظہ ہو حیات صفحہ ۴۴۸ تا ۴۵۱)

مولانا نے ۱۱ ستمبر سنہ ۱۹۰۶ء کو بمبئی سے افادی مرحوم کو لکھا کہ "۱۹ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں آدمی ضبط نہیں کرسکتا"۔ یہ خط حیات شبلی میں منقول ہے لیکن اس خط کا فقرہ آخر کہ "تین چار غزلیں لکھی ہیں جو کبھی آپ کی نظر سے گزریں گی"۔ متروک ہے پھر دستۂ گل میں جو دارالمصنفین ہی سے شایع ہوا ہے ہر غزل پر مہینہ اور سنہ بھی درج ہے، غرض غزلوں کا آغاز بمبئی میں اور سنہ ۱۹۰۶ء میں ہوا، یہ غلط ہے سنہ ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ اب مولانا کی فارسی شاعری کی نئی روح پیدا ہونے کی داستان بھی سنئیے:

مولانا بلاشبہ ابتدا میں چوپاٹی اور اپالو کے حسن سے مسحور ہوگئے اور اس سحر زدگی میں پکار اُٹھے کہ:

" فغاں از گرمی ہنگامۂ خوبان زردشتی"۔ مگر ختم سال سے قبل مولانا بمبئی سے بڑودہ جاتے ہیں اور پھر ڈھاکہ، ڈھاکہ سے لکھنؤ وغیرہ مئی سنہ ۱۹۰۶ء میں حادثۂ گزند پا پیش آتا ہے اور اگست میں بمبئی روانہ ہوجاتے ہیں چونکہ ندوہ کے لئے حکومت سے امداد کے متعلق مذاکرات ہو رہے تھے مولانا جنوری سنہ ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ آجاتے ہیں، اور اپنے ہمدم و ہم مذاق دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھتے ہیں کہ:

> "اب کی بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں لیکن عالم لطف میں ندوہ کی ایک فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا، لیکن آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے خیر اس پر فخر کرتا ہوں کہ دل کی خوشی کو قوم و مذہب پر نثار کرسکتا ہوں اور بے تکلف کرسکتا ہوں" (۲۶ رفروری سنہ ۱۹۰۸ء)

انہی دوست کو دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ:-

> "ترسازادے بمبئی کے ایوان جمال کے جھوٹے طلسم ہیں سچی تصویریں الگ ہیں عراقی بھی ایرانی بھی اور خال خال ہندی بھی"۔ (مکاتیب)

ان خطوط کے ساتھ مجموعہ خطوط شبلی کے دو ابتدائی خط بنام عطیہ بیگم و زہرا بیگم پڑھنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ رنگین صحبتیں کہاں رہیں اور دل کی خوشی کس جگہ پیدا ہوئی، سچی تصویر کس کی تھی، پھر یہ واقعہ بھی ملحوظ رہے کہ خاندانِ فیضی سے مولانا اجنبی نہ تھے، بزرگ خاندان "مرحوم حسن فیضی صاحب" سے استنبول میں ملاقات ہوچکی تھی اور ان کی مہماں نوازی سے لطف اندوز ہوچکے تھے اور اس کا تذکرہ اپنے سفرنامہ میں بھی کیا ہے اور ایک خط میں زہرا بیگم کو لکھا بھی ہے کہ "حسن صاحب مرحوم عمر اور ہر حیثیت سے میرے چچا تھے"۔ اس خاندان سے اب بمبئی میں پھر تعارف ہوا اور سلسلۂ آمد و رفت شروع ہوگیا، رنگین مزاج رنگ لے آیا، ابتدا میں جھجک رہی پھر کھل کھیلے اور دل کے جذبات نظم کی شکل میں ظاہر ہونے لگے۔ بہرحال خطوط و ملاقات کا سلسلہ سنہ ۱۹۰۸ء سے پہلے کا ہے، پھر سنہ ۱۹۰۶ء یا سنہ ۱۹۰۸ء کی بحث ہی فضول ہے یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مولانا کی شاعری پر بہت بڑا اثر اس جذبۂ محبت کا تھا جو ایک ایسی خاتون سے متعلق تھا جس نے ان کا ایک عالم ایک مورخ ایک ادیب اور ایک بزرگ کی حیثیت سے استقبال کیا تھا۔

ان واقعات سے مولانا کی عصمت پر کوئی داغ نہیں آتا ۔ اس صورت میں مصنف حیات کی تاویلات اور پردہ پوشی اور واسطے دلا دلا کر اظہار حقیقت سے باز رکھنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں ۔

محمد امین زبیری

(نگار) یاد ایام، مولوی محمد عبدالرزاق صاحب مولف البرامکہ کی جدید تصنیف ہے جو غالباً ابھی تک شایع نہیں ہوئی اس کتاب میں مصنف نے ان تمام مشاہیر اہل علم و قلم کا ذکر کیا ہے۔ جن سے وہ خود مل چکے ہیں اور اس سلسلہ میں مولانا شبلی کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، وہ انھوں نے سید سلیمان ندوی کے پاس بھیجدیا تاکہ مولانا شبلی کے شاگرد خصوصی ہونے کی حیثیت سے وہ بھی اس کو دیکھ لیں ۔ سید سلیمان نے اس کو دیکھکر جو خط مولوی عبدالرزاق صاحب کو لکھا تھا، اسی کو پیش نظر رکھکر مولوی محمد امین زبیری نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔

مولانا شبلی کو اخیر میں جو تعلق خاندان فیضی سے ہوگیا تھا اور جس نے یقیناً ان کے ذوق شعری اور رنگ تغزل کو بہت متاثر کیا، وہ کوئی ایسا راز نہیں جو پوشیدہ ہو یا جس کا اظہار مناسب نہ ہو، لیکن سید سلیمان ندوی کا اسکے ستر و اخفا پر اصرار، اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یا تو وہ اپنے اُستاد کے اخلاق کی طرف سے مطمئن نہ تھے یا پھر یہ کہ انکے نزدیک مولانا شبلی کے یہ لطیف تاثرات محبت بھی جُرم و معصیت کی حد تک پہونچتے ہیں ۔

میرے نزدیک مولانا شبلی کے فارسی تغزل کی صحیح داد یہی کہکر دیجا سکتی ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اُن کے صحیح تاثرات محبت تھے، لیکن افسوس ہے کہ اُن کے مقدس فرزند سید سلیمان ندوی اس پر راضی نہیں ۔

غالب نے تو بہ صد ہزار ندامت اپنی بخشایش کا ایک بہانہ ڈھونڈھ نکالا تھا کہ :

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند
جز روزۂ درست زصہبا کشودہ

لیکن سید سلیمان اپنے اُستاد کو اتنا بھی نہیں کہنے دیتے کہ :

فغاں از گرمی ہنگامۂ خوباں زردشتی !

اور ان کی غزلگوئی کو یکسر داستانِ معصیت قرار دیتے ہیں :

مرا می خور دستی رسوا ، بحمداللہ کہ آں ہم شد !

مطبوعات موصولہ

ادب پارے مجموعہ ہے جناب ضیاء الاسلام صاحب کی اُن لاسلکی تقریروں کا جو دہلی اور لکھنؤ سے وقتاً فوقتاً نشر ہوئی ہیں ۔ ان تقریروں میں بعض مشہور شعراء اور حال میں شایع ہونے والی بعض کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اس طرح یہ مجموعہ گویا ضیاء الاسلام صاحب کے انتقادی عقاید و زوایا کا خاکہ ہے، جو فی الجملہ کافی دلچسپ اور مفید ہے ۔ موصوف اس سے قبل بعض انگریزی اخبارات میں بھی یہی خدمت انجام دے چکے ہیں اور ممکن ہے اب بھی یہ سلسلہ قایم ہو ۔ ہوسکتا ہے کہ اُن کی رائے سے بعض مسایل میں کسی کو اختلاف ہو (اور نقد و انتقاد کی دنیا میں جمہور کا اتفاق ممکن نہیں) لیکن یہ کہنا کہ جو رائے وہ قایم کرتے ہیں، اس کے لئے اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی غالباً غلط ہوگا ۔ قیمت دو روپیہ اور ملنے کا پتہ ۱۴، اسٹانلی روڈ الہ آباد ۔

عالم برزخ سید بشیر ہندی کا لکھا ہوا ڈراما ہے، جس میں انھوں نے غالباً عالم برزخ کا خیالی خاکہ پیش کیا ہے اور اس عالم کی بہت سی نہ سمجھ میں آنے والی باتوں کو قابل فہم بنانے کی کوشش کی ہے ۔ انسان، فرشتہ، شیطان، روح وغیرہ کے مکالمے اس میں نظر آتے ہیں اور کافی عبرت انگیز، دلچسپ اور نتیجہ خیز ہیں ۔

قیمت ایک روپیہ ۔ ملنے کا پتہ : اُردو محل ۔ ۱۲۸ ۔ ٹمپل روڈ، لاہور ۔

فیصلۂ ہندوستان ترجمہ ہے برطانوی صحیفہ نگار مسٹر بیورلی نکلس کی مشہور کتاب Verdict on India کا جسے جناب عبدالقدوس ہاشمی نے کیا اور ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن نے شایع کیا ہے ۔

نکلس کی یہ کتاب ہندوستان میں کافی بدنام ہے، سیاسی و تاریخی دونوں حیثیتوں سے، کیونکہ اسکے نزدیک ہندوستان سے زیادہ پست ملک اور کوئی نہیں اور یہاں کی سیاسی تحریکوں میں پاکستان کے سوا، اُسے کوئی تحریک پسند نہیں، لیکن ادبی حیثیت سے اس کتاب کا مرتبہ یقیناً بہت بلند ہے اور اس کا ترجمہ بڑا مشکل کام تھا، اس لئے ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ عبدالقدوس صاحب بڑی حد تک اصل کتاب کی ادبی خصوصیات کو قایم رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور ضرورت ہے کہ اُردو داں طبقہ اس کا مطالعہ کرے تاکہ وہ سمجھ سکے کہ انگریز ہندوستان کے سمجھنے میں اب بھی کتنے تعصبات سے کام لیتا ہے ۔ قیمت پانچ روپیہ ۔

موت و حیات مجموعہ ہے جناب شاطر حکیمی کی نظموں اور غزلوں کا، جناب شاطر صوبۂ متوسط کے مشہور نوجوان شاعر ہیں اور ان کا کلام اکثر رسایل میں شایع ہوتا رہتا ہے ۔ ان کے کلام کی خصوصیت بیان کی سادگی ہے جو مشکل و دقیق مسایل میں بھی ہاتھ سے نہیں جاتی ۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ خصوصیت بڑی

خصوصیت ہے۔

شاقر کا شمار بھی ترقی پسند شعرا میں کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ بھی ادب برائے زندگی کے قایل ہیں اور سماج سے جدا رہکر وہ نظم لکھنا پسند نہیں کرتے، لیکن اسی کے ساتھ وہ غیر ذمہ دارانہ انداز بیان سے بھی احتراز کرتے ہیں۔

قیمت دو روپیہ چار آنہ، ملنے کا پتہ: سی۔پی اُردو اکاڈیمی کراڈک روڈ۔ ناگپور۔

روحِ کائنات پروفیسر فراق گورکھپوری کی نظموں کا مجموعہ ہے، جسے ایوان اشاعت گورکھپور نے شایع کیا ہے۔ فراق کی شاعرانہ حیثیت کیفیات کے لحاظ سے ملک میں مسلم ہے اور اس نے ماورائے فن اپنے لئے ایک خاص جگہ پیدا کرلی ہے۔ فراق کی شاعری پچھلے پندرہ سال میں تین دور سے گزر چکی ہے، شوق، عشق اور پختگی، اس کے بعد چوتھا دور ایک اور آتا ہے جسے لت کہتے ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ فراق اس کی لذت سے بھی محروم نہ رہیں۔

فراق کی شاعری کی یہ خصوصیت کہ اُن کی ہر نظم و غزل میں کوئی نہ کوئی چیز پھڑکا دینے والی یا سوچنے پر مجبور کردینے والی ضرور پائی جاتی ہے، بہت کم دوسرے شعرا میں نظر آتی ہے۔ ان کے انداز بیان میں ایک حلاوت ہوتی ہے لیکن "گلوسوز" قسم کی نہیں، اچھوتی اور نادر تشبیہات ہوتی ہیں، لیکن مرکب قسم کی دلآویز و دلنشین، وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنا مفہوم نئے زاویوں سے پیش کریں اور اس میں وہ بہت کچھ کامیاب ہیں۔

فراق کے کلام میں فنی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن کیفیات کے مقابلہ میں وہ نہ سامنے آتی ہیں اور نہ چنداں قابلِ اعتنا ہیں۔ بہرحال اس میں کلام نہیں کہ فراق اس دور کے سب سے پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے غزل میں پُرانے اور نئے دونوں اسکولوں کو نہایت خوبی کے ساتھ یکجا کردیا اور اس لئے ان کا ذکر دونوں اسکولوں کے شعرا میں کیا جائے گا۔ قیمت چار روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: سنگم بک ڈپو الہ آباد۔

اُردو کی عشقیہ شاعری ایک طویل مقالہ ہے فراق گورکھپوری کا جس میں انھوں نے اُردو کی غزلگوئی پر تبصرہ کیا ہے، یہ تبصرہ تاریخی و فنی حیثیت سے قابلِ لحاظ ہو یا نہ ہو، لیکن معنویت کے لحاظ سے بڑی فاضلانہ کوشش ہے۔

اس میں انھوں نے قدیم وجدید دونوں زمانوں کو سامنے رکھ کر غزل کے تدریجی ارتقا، اور اس کی وجدانی و معنوی کو نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے اور اسی کے ساتھ اس بیراہ روی کو بھی دکھایا ہے جو فن کو پس پشت ڈالدینے سے پیدا ہوتی ہے۔

مقالہ انتقادی حیثیت سے بڑی مفید چیز ہے۔ قیمت دو روپیہ بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ: سنگم بک ڈپو الہ آباد

اُجالے سے پہلے مدھوسودن بی، اے کے افسانوں کا مجموعہ ہے جسے اُردو محل حیدرآباد دکن نے شایع کیا ہے افسانے پلاٹ کے لحاظ سے دلکش اور زبان کے لحاظ سے پسندیدہ ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں کی طرح مدھوسودن صاحب کا نقطۂ نظر بھی سماج کی اصلاح ہے۔ قیمت دو روپیہ دس آنے۔

ترقی پسند ادب عزیز احمد صاحب نے اس کتاب میں ترقی پسند ادب کا جایزہ لیا ہے جس میں نثر و نظم

دونوں شامل ہیں۔
اس میں فسانہ، ناول، ڈراما، ظرافت نگاری اور تنقید سبھی پر بحث کی گئی ہے اور کافی چھان بین کے بعد۔
موضوع کے لحاظ سے غالباً یہ سب سے پہلی "کتابی" کوشش ہے، جو یقیناً سراہے جانے کے قابل ہے۔
قیمت دو روپیہ چودہ آنے، ملنے کا پتہ: ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد۔

میخانۂ ریاض جناب تسنیم مینائی نے اس کتاب میں ریاض خیرآبادی مرحوم کا انتخاب کلام پیش کیا ہے اور ابتدا میں اُن کی زندگی کے حالات اور خصوصیات شعر و ادب بھی مفصل بیان کر دئیے ہیں۔
ضرورت تھی کہ ریاض مرحوم کے کلام کا انتخاب خاص اہتمام سے شایع کیا جائے اور خوشی کی بات ہے کہ تسنیم مینائی نے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ قیمت تین روپیہ چار آنے اور ملنے کا پتہ: ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد

یوروپین اور انڈو یوروپین شعراء اُردو و فارسی اس تذکرہ کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اسکے مولف و مرتب رائے بہادر رام بابو سکسینہ ہیں، جن کی کتاب "تاریخ ادب اُردو" کافی مشہور ہو چکی ہے۔
فاضل مصنف نے اس تذکرہ کی جمع و ترتیب میں جس کاوش و عرق ریزی اور صبر و تحمل سے کام لیا ہے اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔
اتنا تو غالباً اکثر لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ابتدا ً یہاں کے نو واردان مغرب میں بھی اُردو فارسی شاعری کا ذوق پایا جاتا تھا، لیکن اس بات کا علم کہ ایسے شعراء کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے اور ان میں سے بعض صاحب دیوان بھی تھے، سب سے پہلی مرتبہ اسی تذکرہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔
یہ تذکرہ سکسینہ صاحب کی سالہا سال کی محنت و جستجو کا نتیجہ ہے اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے انھوں نے کوئی امکانی ذریعہ تحقیق کا نہیں چھوڑا۔ یہ تذکرہ انگریزی میں لکھا گیا ہے، لیکن انتخاب کلام کا حصہ جو ۰۰؍۴ صفحات پر مشتمل ہے اُردو رسم خط میں چھاپا گیا ہے۔
یہ کتاب مجلد نہایت نفیس کاغذ پر شایع کی گئی اور دس روپیہ میں نولکشور پریس لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

دنیائے شہرزاد آنسہ محمودہ رضویہ کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے اپنی سیاحت عراق کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ آنسہ محمودہ بڑی ذہین خاتون ہیں اور اس سے قبل متعدد کتابیں انشاء عالیہ کی ان کے قلم سے نکل چکی ہیں، لیکن اس کتاب میں انشاء، تاریخ، جغرافیہ و سیاست سبھی کچھ شامل ہیں۔
آپ کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جو سندھ اور عراق کے درمیان وسیع تجارتی تعلقات رکھتا ہے اور اس لئے گو آپ کا کراچی سے عراق جانا گویا ایک گھر سے دوسرے گھر جانا تھا، لیکن آپ کی جستجو پسند طبیعت اور ادبی ذوق نے اس سیاحت کو بھی کافی اہمیت دیدی اور آپ نے بہت سی تاریخی معلومات اس ذریعہ سے ہمارے سامنے پیش کر دیں۔
قیمت دو روپیہ، ملنے کا پتہ: ـ شعاع اُردو دارالاشاعت کراچی

شعلۂ شاداب

گل، بنفشہ، لالہ، نسریں، یاسمن
کوئی شعلہ فام، کوئی سیم تن

گلکدے، ساغر بکف، مینا بدوش
بدلیاں، بادہ چکاں و رقص کوش!

یہ ہواؤں کا تنفس سرد سرد!
لحظہ لحظہ حیف یہ سینے میں درد!

آہ یہ بوندیں، یہ بجلی کی چمک
تیز پھر ہونے لگی دل کی دھڑک!

ٹکڑے ٹکڑے جس سے ہو جائے گھٹا،
ہم نشیں رکتی ہے کب ایسی ہوا

ظلمتوں میں نور سا گھولے ہوئے
میکدے کتنے ہیں پر تولے ہوئے!

بھیگے بھیگے سے یہ پلو زرنگار
آنچلوں کے رنگ جلووں کے نکھار!

اُڑتے اُڑتے آ رہی ہیں بدلیاں
خواب سے برسا رہی ہیں بدلیاں،

کیسی کیسی وادیاں شاداب ہیں
کتنے مبہم، کتنے رنگیں خواب ہیں!

گنگناتے، مسکراتے ماہ و سال
بھولے بھولے بھٹکے بھٹکے سے خیال!

ہیں نظر میں کتنے مہ پاروں کے خواب
کیسے کیسے شعلہ رخساروں کے خواب!

کھنچ گئی آنکھوں میں پھر اک انجمن
آ گیا پھر سامنے اک سیم تن،

وہ تبسم ہونٹھ پر بے اختیار
سر سے آنچل کا سرکنا بار بار!

بے پیے اُس کا بہکنا ہائے ہائے
بے سبب دل کا دھڑکنا ہائے ہائے!!

ہر نظر اک نغمۂ بے چنگ و تار
ہر نفس چڑھتا ہوا سا اک خمار

چلتے چلتے وہ ٹھہرنا ہائے ہائے
اپنے سائے سے بھی ڈرنا ہائے ہائے!

کچھ ادھر بھی، کچھ اُدھر بھی دیکھنا
وہ نہ اُس کا دیکھ کر بھی دیکھنا!

دیکھنا یوں جیسے دیکھا ہی نہ تھا
کوئی جلوہ، کوئی پردا ہی نہ تھا

نیچی ہی نیچی نگاہوں میں سلام
آنکھوں ہی آنکھوں میں ہر نازک پیام!

ہر نظر میں ایک مبہم راز سا
ہر نفس اک نغمہ بے آواز سا!

خامشی، آئینۂ راز و نیاز
گفتگو اندیشۂ افشائے راز!

میرے آگے بھی مرا ہی انتظار
کشمکش سی کشمکش لیل و نہار!!

اک فسردہ نیند چشمِ ناز میں
ایک اضمحلال سا آواز میں!

ہر نظر سے پوچھتے رہنا مزاج
ایک نازک دل میں لاکھوں اختلاج!

کچھ ہواؤں، کچھ فضاؤں کا خیال
مبتلائے دام اک وحشی غزال!!

سیلِ غم میں ڈوبتی، بہتی ہوئی
زیرِ لب کچھ دور سے کہتی ہوئی!

آپ کہتی، آپ ہی سنتی ہوئی،
وہ اُسے ہر دم بچھڑنے کا خیال
گلکدے کا ایک کملا یا گلاب
اُڑتا اُڑتا ایک آوارہ سحاب
رات دن بھولی ہوئی کھوئی ہوئی

فتنۂ شام و سحر تازہ ہوا،
پھر گئے آنکھوں میں کیا کیا انقلاب
ایک بھولا گیت گا کر دیکھ لوں،
ہر فضا سے دور ہونے دے مجھے
خوں بدا ماں نسلِ آدم ہو تو ہو،
لاکھ فطرت آگ پر سوتی رہے
ڈھل نہیں سکتا کبھی نقشِ شباب
داغ اور پھر سینۂ آدم کے داغ

ناشگفتہ پھول سے جنتی ہوئی!
چاند سے مکھڑے پہ اک گردِ ملال!
ابر میں بھٹکا ہوا اک ماہتاب
ظلمتِ طوفاں میں گم اک آفتاب!
جیسے کچھ جاگی سی، کچھ سوئی ہوئی!!

آج پھر زخمِ جگر تازہ ہوا!!
کتنی صبحیں، کتنی راتیں، کتنے خواب!
آنسوؤں میں مسکرا کر دیکھ لوں!!
جاگتا آیا ہوں سونے دے مجھے!
گر فضا میں سرخ پرچم ہو تو ہو،
زندگی شعلوں سے منہ دھوتی رہے
جل نہیں سکتی محبت کی کتاب!!
بجھ بھی سکتے ہیں محبت کے چراغ!!

پروفیسر شور

حسنِ خراماں

یہ نرمیِ رفتار، یہ شوخی، یہ نزاکت — جیسے کوئی پھولوں سے بھری شاخ لچک جائے
یہ مست نگاہیں، یہ قیامت کی ادائیں — انسان تو کیا چیز فرشتہ بھی بہک جائے
انداز ہی انداز، جوانی ہی جوانی — جنت سے اگر حور بھی دیکھے تو جھجک جائے
انگڑائی نہ لے ناز سے ہاتھوں کو اُٹھا کر — کُرتا نہ مسک جائے دوپٹہ نہ ڈھلک جائے
ہنس ہنس کے نہ کر سعیِ مدارات خدارا — یہ آگ بجھانے سے اگر اور بھڑک جائے
جُوڑے کو ذرا کھول کے ہو جا متبسم — بادل بھی برستے رہیں بجلی بھی چمک جائے
یہ نرگسِ بیمار کی ہلکی سی تجلّی — جاگے ہوئے تاروں کی پلک جیسے جھپک جائے
یہ تابشِ رخسار، پسینہ کی یہ بوندیں — جس طرح کوئی ساغرِ گلرنگ چھلک جائے
مت دیکھ ابھی اتنی توجہ کی نظر سے — ڈرتا ہوں زمیں پاؤں تلے سے نہ سرک جائے

اس عالمِ امید کی پُرپیچ ہیں راہیں
ڈرتا ہوں تری مست جوانی نہ بھٹک جائے

ماہرالقادری

غزل : سیدہ اختر

پھول ہی پھول ہر طرف ہیں ... کھلے
ماورائے قفس ! خدا کی پناہ

اُن کی آنکھیں بھی آج پرنم ہیں
عشق کی دسترس ! خدا کی پناہ

برق و باراں سے چشمکِ پیہم !
زورِ خاشاک و خس ! خدا کی پناہ

نہ رہا آج دل میں شکوۂ دوست
بیش از یک نفس ! خدا کی پناہ

غزل : رعنا - بلسوی

وہ نقشِ نامرادی انجمن میں چھوڑ آیا ہوں
غرورِ حسن کو اکثر دعا یاد آگئی ہوگی

بسر کرتا تھا جو راتیں کبھی پھولوں کے سائے میں
اُسی کمبخت کو کانٹوں پہ بھی نیند آگئی ہوگی

میں کس کو دیکھنے جاؤں وہاں اب کون آئیگا
ستانے کو چمن میں چاندنی چھٹکی ہوئی ہوگی

بلا کی کفر سامانی سے شام دیر میں رعنا
ارے توبہ یہاں کس سے، خدا کی بندگی ہوگی

غزل : شفیق صدیقی جونپوری

دمبدم اس رخ پہ اک حسنِ دگر پاتا ہوں میں
ہر نگاہِ شوق کو پہلی نظر پاتا ہوں میں

التفاتِ جلوۂ محبوب تیرا شکریہ
کب تجھے پانے کے قابل ہوں مگر پاتا ہوں میں

آجلو میں زلف و رخ کے لیکے اپنی دھوپ چھاؤں
مدتوں سے گھر کو بے شام و سحر پاتا ہوں میں

دل نے روشن ہو کے قلب و روح کو روشن کیا
اپنے آئینے کو بھی آئینہ گر پاتا ہوں میں

عرش کو حیرت، حرم کو وجد، نازاں بندگی
ہائے وہ عالم کہ جب سجدے میں سر پاتا ہوں میں

بدمذاقی پھیلتی جاتی ہے دنیا میں شفیق
پھر بھی تجھ کو صاحبِ فکر و نظر پاتا ہوں میں

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

جو جنوری ۱۹۵۲ء میں شایع ہوگا، اپنی خصوصیات کے لحاظ سے خاص چیز ہوگا - اور فنی حیثیت سے "نقد و انتقاد" کے موضوع پر اتنا اہم، مفید و دلچسپ ذخیرہ آپ کو کہیں اور نظر نہ آئیگا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سالنامہ جنوری اور فروری دونوں مہینوں کی جداگانہ اشاعتوں پر مشتمل ہوگا -

منیجر نگار

انتخاب کلام رازؔ رامپوری

لالہ وگل کی طرف روز بھٹکتی تھی نظر — رہ گئی آج جھلس کر کہیں انگاروں میں

بہار و برق کی بیداد کہہ نہیں سکتا — دلہن بنا کے جلایا ہے آشیانے کو

نیازِ عشق میں خامی کوئی معلوم ہوتی ہے — تمھاری برہمی کیوں برہمی معلوم ہوتی ہے

دل چرانے کی عبث اُن سے شکایت کردی — اب وہ آنکھیں بھی چُراتے ہیں پشیماں ہو کر

اپنی ہستی سے دشمنی تھی مجھے — یاد ہیں اُن سے دوستی کے دن

اس کی حسرت ارے معاذاللہ — جس کا چاہا ہوا کبھی نہ ہوا،

وہ سامنے سرِ منزل [illegible] ہیں — جواب پاؤں نہ دیتے تو میں کہاں ہوتا

محسوس ہو رہا ہے کہ گم ہو رہا ہوں میں — کس سمت آگیا یہ تجھے ڈھونڈتا ہوا،

ہر ایک شئے سے جوانی اُبل پڑی آخر — مری نظر سے کہاں تک کوئی حجاب کرے

چراغِ شمس و قمر میں بھی روشنی نہ رہی — کہاں سے راہ ملی تیرے آستاں کے لئے

زندہ رہنا نہ سکھاؤ لیکن — جان دینا تو بتادو ہم کو،

فرصتِ عرضِ محبت نہ ملی خوب ہوا — آپ سنتے بھی تو کیا آپ سے کہتا کوئی

صبر اور میں، خیر اس کا ذکر کیا — جا رہے ہیں آپ اچھا جائیے،

دیا ہے ظرفِ قلیل اُس نے آزما کے مجھے — چمن بنایا ہے لیکن جلا جلا کے مجھے

اُن آنسوؤں کی حقیقت کو کون سمجھے گا — کہ جن میں موت نہیں زندگی کا ماتم ہے

ستمِ دوست کی شکایت ہے — ہائے کس کو خبر کرے کوئی،

فلم سازوں کا خواب
فلم بینوں کی تمنا

موسیقی۔ رقص۔ ڈرامہ۔ اداکاری اور مناظر سے بھری ہوئی

مراری پکچرز بمبئی

کی زیرِ تکمیل پیش کش

عمر خیام

مشرق کے شاعرِ اعظم کی شاعرانہ اور راہبانہ زندگی کی ایک جھلک

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما ٭ کائے رند خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ زمئے ٭ زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما
(خیام)

ڈائرکٹر: موہن سنگھ

افسانہ۔ مکالمے اور گانے:۔
ڈاکٹر۔ آہ سیتاپوری

درخشندہ ستارے
سیگل۔ ثریا۔ واسطی
اور دوسرے بہترین اداکار!

دی مغل لائن لمیٹڈ

(حج سروس از کراچی تا جدہ)

گورنمنٹ آف انڈیا کے اُس اعلان کے مطابق، جو ۲۶ر جولائی یا اس کے بعد تمام اہم انگریزی اور ہندوستا اخباروں میں شایع ہوا تھا کراچی سے جدہ تک حاجیوں کی روانگی کا انتظام ہوگیا ہے۔

کرایہ ۔ درجہ اول ۹۰۰ روپیہ — از کراچی تا جدہ آمد و رفت مع مصارف خوراک لیکن اس کرایہ میں مصارف حفظان صحت، کشتی کا کرایہ اور کامران کے مصارف قرنطینہ شامل نہیں ہیں۔

۲۵۰ روپیہ کرایہ عرشہ — ازکراچی تا جدہ آمد و رفت مع مصارف خوراک، لیکن اس کرایہ میں جدہ کے مصارف حفظان صحت، کشتی کا کرایہ اور کامران کے مصارف قرنطینہ شامل نہیں ہیں۔

مزید معلومات اس پتہ سے حاصل کریں :-

حج بکنگ آفیسر کامن ولتھ دیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا نئی دہلی

Karachi Agents:-

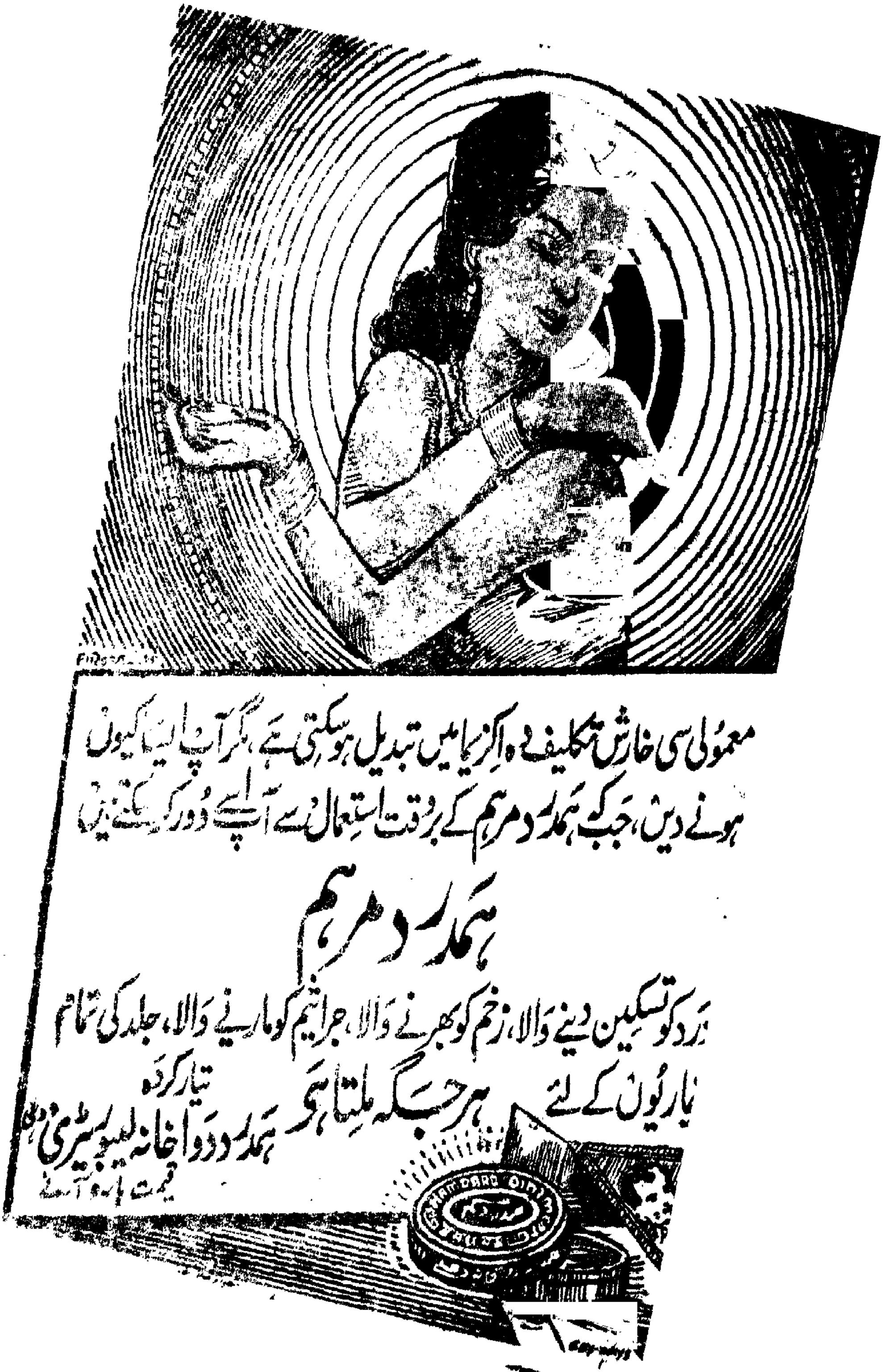
کراچی ایجنٹ :- Grahams Trading Co (India) Ltd.

McLeod Road

KARACHI

ٹرنر ماریسن اینڈ کو لمیٹڈ

[illegible] بمبئی


معمولی سی خارش تکلیف دہ اکزیما میں تبدیل ہو سکتی ہے، مگر آپ ایسا کیوں ہونے دیں، جب کہ ہمدرد مرہم کے بروقت استعمال سے آپ اسے دور کر سکتے ہیں
ہمدرد مرہم
درد کو تسکین دینے والا، زخم کو بھرنے والا، جراثیم کو مارنے والا، جلد کی تمام بیماریوں کے لئے
ہر جگہ ملتا ہے
تیار کردہ
ہمدرد دواخانہ لیبوریٹری دہلی

نفری لٹریچر کے بہترین نمونے

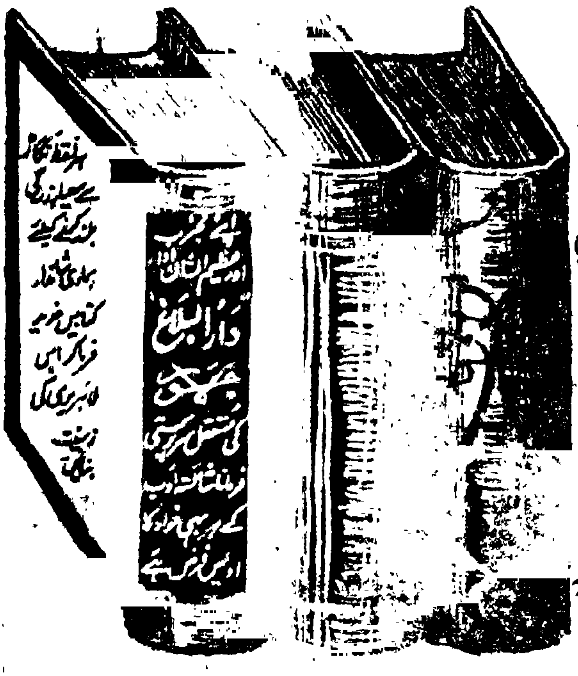
حُسنِ سوگوار } میاں ایم اسلم کا تازہ ترین ناول جس میں ایک وطن پرست چینی محبوبہ کے دلچسپ رومان کے ساتھ ساتھ چینی وجاپان کی موجودہ آویزش کی خونچکاں داستان اور چینی جانبازوں کی سرفروشانہ جدوجہد کے حیرت انگیز واقعات درج ہیں۔ قیمت تین روپیہ۔

خط کا جواب } ہے تیری نوکِ قلم نے دل میں گہرے زخم ڈالے ہیں ❊ ہزاروں دشنہ و خنجر لئے خط کا جواب آیا۔ میاں ایم اسلم نے اس شعر سے یہ کتاب شروع کی ہے اور یہی اس کا موضوع ہے، پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

ہیر رانجھا } (اردو ناول از ایم۔ اسلم) سرزمین پنجاب کی زندہ جاوید داستانِ عشق جس کا ہر پنجابی والہ و شیدا ہے۔ اس کتاب کا مسودہ آصف علی انگریز مصنفین اور مولانا آزاد صدر کانگریس جیسی ممتاز ہستیوں نے مطالعہ کا شوق ظاہر فرمایا ہے۔ قیمت دو روپے۔

طلسم سامری — ایم اسلم کا نہایت دلچسپ جاسوسی ناول۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

شام و سحر } (از ایم اسلم) ایک امیر خاندان کے عروج و زوال کی دلپذیر داستانِ حسن و الفت کا دلچسپ رومان۔ جوانی کی بے راہروی کا عبرتناک قصہ اور سالک پیشہ پیر کی جفاکاریوں کا خوفناک افسانہ (ایسا شاندار ناول گزشتہ ۲۵ سال میں نہیں لکھا گیا) یہ نیرنگ خیال کی تصویر آپ کو بے قرار کر دے گی۔ قیمت پانچ روپے۔



شمسہ } مغربی تمدن اور تہذیب فرنگ کی ایک فریب خوردہ حسینہ کی بعید دلچسپ اور رنگین آپ بیتی۔ از ایم اسلم۔ قیمت پانچ روپے۔

بیتی باتیں } (ناول از ایم اسلم) ایک دوشیزہ کے مصائب۔ بلند عزائم اور پاکیزہ محبت کا دلچسپ رومان۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

رقصِ بہار } حسن و شباب کا دلچسپ رومان۔ آزاد قبائلیوں کی پاکیزہ محبت و ایثار و جوانمردی کی دلکش داستان۔ قیمت چار روپے۔

شامِ غریباں } میاں ایم اسلم کا تازہ ترین شاہکار۔ اس میں غریبوں کی دنیا کی سچی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ ناول حضرت جوش ملیح آبادی کے مشہور گیت "دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی" سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ قیمت تین روپے۔

رنگین نظارے } (از ایم۔ اسلم) دس رنگین افسانوں کا مجموعہ مصنف نے افسانوی سازوں کے تاروں کو اس دلکش طریقہ سے چھیڑ کر موسیقی پیدا کی ہے کہ پڑھنے والے پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ قیمت چار روپے۔

جامِ شکستہ } (از ایم۔ اسلم) گیارہ افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ۔ ہر افسانہ عشق و محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ قیمت تین روپے۔

قاتل } از ایم اسلم۔ سات دلکش افسانوں کا مجموعہ۔ آپ ان افسانوں کو پڑھ کر افسانوں کی دنیا میں حرکت کرنے لگیں گے قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ

بادۂ گلرنگ } (از ایم۔ اسلم) گیارہ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ۔ جس میں انسانی زندگی کے اسرار کو بے نقاب کیا ہے، ہر افسانہ عبرت کا مرقع اور درد کی تصویر ہے۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔

پڑوسن — میاں ایم۔ اسلم کے افسانوں کا بالکل تازہ مجموعہ۔ جس کا ہر لفظ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔ (زیر طبع)

روپ سنگار } مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی کے ۱۶ دلآویز افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ جس میں واقعات کی تلخی بھی ہے اور رومانیت کی رنگینی بھی زبان کی صحت و پاکیزگی اس کتاب کی جان ہے۔ قیمت دو روپے۔

اشک و شرر } بلند پایہ افسانہ نگار حضرت کوثر چاند پوری کے ۱۷ پُرسوز و رقت انگیز افسانوں کا مجموعہ۔ ہر افسانہ سماج کے رگِ فاسد کے لئے نیشتر ہے۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔

سیمیں وشنگار — جان عالم واجد علی شاہ کے امرائے دربار کی بیگم سیمیں وشنگار کے تاریخی حالات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

طبیبہ مرغی خانہ ۳ روپے۔ تجارتی مرغی خانہ حصہ دوم ۲ روپے۔ کامیاب مرغی خانہ حصہ سوم ۲ روپے۔ بطخ فیل مرغ حصہ ۴۔ دو روپے۔ طبیب مویشی دو روپے۔

محصول ڈاک بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ: — کتب خانہ دارالبلاغ نمبر ۱۲ - محمد نگر - لاہور